

# آئینہ جہاں

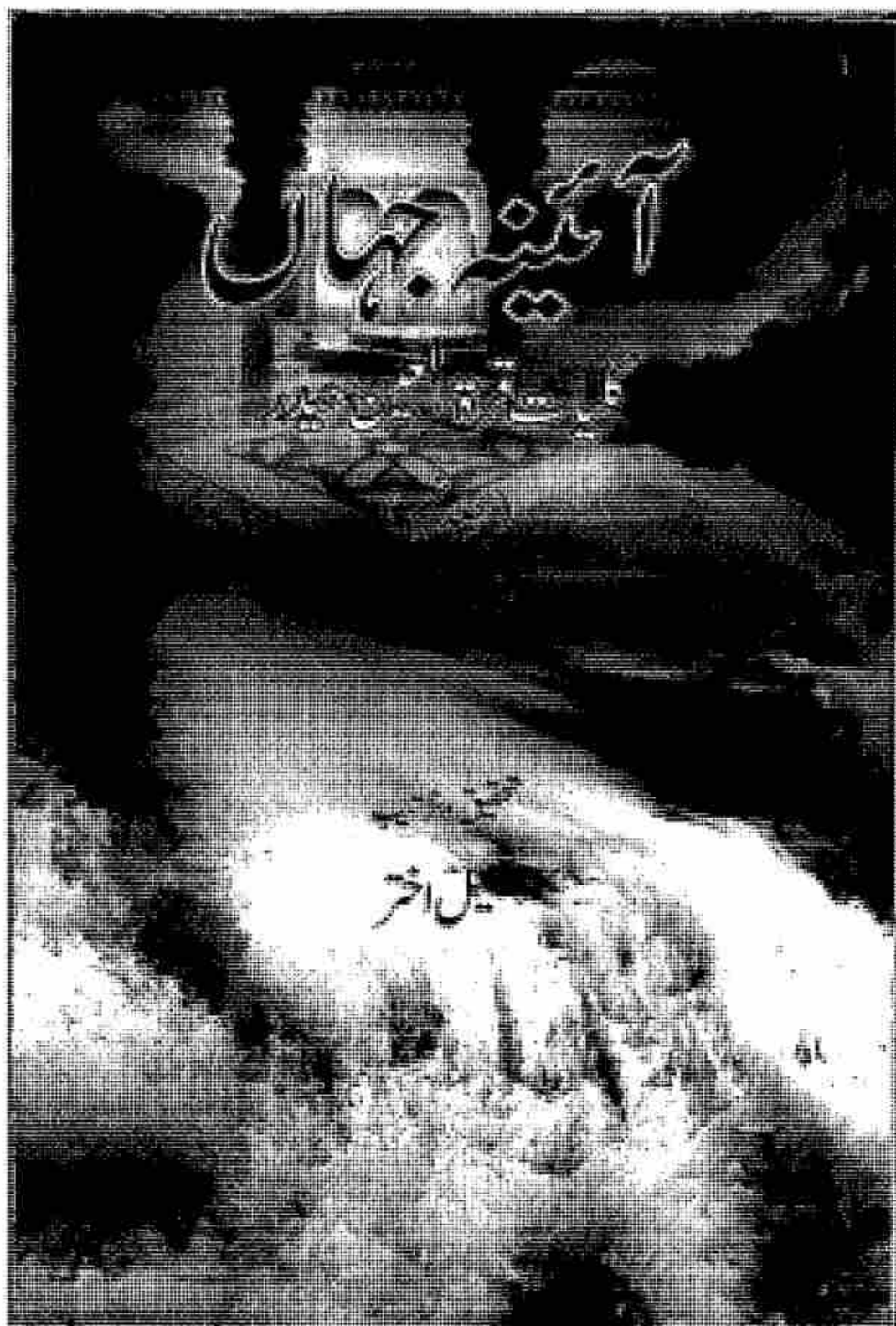
کلیات قرۃ العین حیدر

(جلد نہم)

(خاکے)

تحقیق و ترتیب

حمیل اختر



# آئینہ جہاں

کلیات قرۃ العین حیدر

(خاکے)

(جلد نہم)

تحقیق و ترتیب

جمیل اختر



قومی نصاب کے فروغ اور ترقی کے لیے

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوٹل ایریا، جھولا، نئی دہلی۔ 110025

## © قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

2016	:	پہلی اشاعت
550	:	تعداد
145/- روپے	:	قیمت
1893	:	سلسلہ مطبوعات

### Aaina-e-Jahan

Kulliyat-e- Quratulain Faidar Vol. 9

By: Jameel Akhtar

ISBN : 978-93-5160-127-2

ناشر: ڈاکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، C-33/9، انسٹی ٹیوٹل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی 110025 فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبہ فروخت: دیسٹ بلاک-8، آ ب کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای میل: ncpulseunit@gmail.com

ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوری پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔ 110008

اس کتاب کی چھپائی میں TNPL Maplitho 70 GSM کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔



## پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خدا داد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے دینی اور روحانی ترقی کی سمرانج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے حقیقی عوامل سے آگمی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تعلیم سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقہ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر لغتیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتبہ پر دگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات ہادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو غلطی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم

(ارتقائی کریم)

ڈائریکٹر

## فہرست

vii	● مقدمہ
1	1. مہاتما اوردو پوتا سان
25	2. داستان طراز
39	3. اندھیری رات کا مسافر
59	4. ایک مہذب ٹرافٹ نگار
67	5. دیار فرنگ میں ایک فرنگی
77	6. کچر گیلری کی ایک تصویر
85	7. ایک مازن عالم دین
69	8. جہاں میں رہتا تھا
93	9. شام اودھ کا ایک نغمہ نگار
105	10. ایران میں اجنبی
111	11. سردوشانہ
	سید سجاد حیدر یلدرم
	چودھری محمد علی ردو لوی
	اسرار الحق مجاز
	شوکت تھانوی
	صدیق احمد صدیقی
	شاہد احمد دہلوی
	مولانا مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی
	مہندر ناتھ
	جاں نثار اختر
	ن. م. راشد
	فیض احمد فیض

133	ابن انشاء	12. چاندگر کا جیوگی
147	شائستہ اکرام اللہ	13. آندھی میں چراغ
157	عصمت چغتائی	14. لیڈی چنگیز خاں
165	بمروح سلطان پوری	15. مہذب اور وضع دار انسان
167	سجاد ظہیر	16. گل میں رہ کے جمونپڑوں کے خواب دیکھنے والے
173	گل بانو کپاڈیا	17. انگریز قوم کی دل و جان سے پرستار
175	کرشن چندر	18. طلسمی آئینے کا ایک اور زاویہ
181	انیس قدوائی	19. درویش مزاج بی بی
189	سلطانہ جعفری	20. ایک زندہ دل ہستی
193	عطیہ حبیب اللہ	21. نئے ہندوستان کی اسطوری ہستی
203	عزیز بانو داراب وفا	22. جو جھکوں تو شاخ کھاب ہوں
217	ڈاکٹر رفیق زکریا	23. ایک اہم اسکالر
227	رشید جہاں	24. جمونپڑے کا خواب دیکھنے والی
237	گلزار دہلوی	25. انسان دوستی کا سفیر کبیر
241	فیروز جبین	26. الٹی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے
255	حسین لقمان حیدر	27. ایک منفرد عقاون
273	سعادت حسن منٹو	28. دیکھ کبیر ارویا
277	غلام عباس	29. ایک معمار سلطنت
285	عزیز احمد	30. دربار کے مستند خاص
299	زوبی آزر	31. اشاریت کی نئی سمتیں اور زوبی
303	صالحہ عابد حسین	32. ایک غیر معمولی ہستی
309	ملک راج آنند	33. ایک ملک، دو دنیا

## مقدمہ

قرۃ العین حیدر کی کلیات سازی کا کام میں نے ان کی اجازت سے ان کی حیات میں ہی شروع کر دیا تھا۔ افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل تین جلدیں اور ایک نیا افسانوی مجموعہ 'قدیل ہمیں ان کی حیات میں ہی شائع ہو چکا تھا لیکن یعنی آپ اس کی خوشی نہ دیکھ سکیں کتاب شائع ہونے کے فوراً بعد خرابی صحت کی وجہ سے داخل اسپتال ہوئیں اور پھر جاں نہ ہو سکیں اور اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میں اپنے کام سے کبھی غافل نہیں رہا۔ بلکہ اپنے محدود وسائل میں رہ کر کام کرتا رہا۔ اس لیے کہ کوئی ادارہ پروجیکٹ مکمل ہونے پر کتاب تو شائع کر دیتا ہے لیکن بنیادی تاخذ کی تلاش و جستجو کے لیے جو اصراف خطیر ہوتا ہے اس کا بار اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ اردو ادب کی افسوس ناک صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں کسی فرد واحد کے محدود وسائل سے کوئی بڑی امید کرنا بعض وقت مایوسی کا سبب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی فرد واحد اجماع اور ادارے سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے اور اس کا یہی نادر کارنامہ فرد کی انفرادیت کو ادب کے افق پر اجاگر کر کے اس کی الگ شناخت کا باعث ہوتا ہے اور ادبی تاریخ ایسے منفرد جہانوں سے جھلک رہی ہے۔ ورنہ اردو ادب کی دیگر صورت حال میں اس کی ساری دراخت تہہ و بالا ہو جاتی اور سارا سرمایہ تہ تیغ ہو جاتا۔ لیکن

ادبی ذوق و شوق رکھنے والے افراد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر کسی اور زبان کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بار بار مغرب کا حوالہ دینے اور مغرب کی نقالی سے اردو ادب کی اصناف کو مالا مال کرنے والوں نے مغرب کی طرز فکر اور ان کے طرز عمل کو تحقیق و تنقید کے لیے معیار کیوں نہیں بنایا جس سے اردو ادب کی یہی ماندگی کو دور کیا جاسکتا اور اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تحقیق و تنقید کے لیے فضا سازگار ہوتی۔ گفت و شنید کی حد سے آگے، عملی طور پر یہ معاملہ کبھی جا بھی سکے گا؟ شاید کبھی ایسا ہوا تو وہ اردو ادب کی خوش حالی کا دن ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کی وفات کے بعد ان کی کلیات کو مکمل کرنے کا کام چیلنج سے بھرا ہوا ہے۔ عمر بھر اپنی اور ہندوستانی وراثت کے بکھرے ہوئے باب کو جمع کرنے والی خاتون کی اپنی وراثت کی حفاظت خطرے میں ہے۔ اس بے بسی پر ادب کی رکھوالی کرنے والے ادارے و افراد کیا اپنی آنکھیں خشک کر لیں گے۔ چھوڑی ہوئی دولت پر دعویٰ کرنے والے تو بچا سوں رشتہ دار جس کے نہیں بھی ہوں تو بھی نکل آتے ہیں، لیکن ادبی وراثت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی۔ میں نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر جن کے رشتے دار دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور قرۃ العین حیدر کا ادبی سرمایہ بھی دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، ہندوستان اور پاکستان کی حد تک تو میں جانتا ہوں کہ کسی رشتہ دار میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس عظیم کام کو منصوبہ بند طریقے سے کر سکے۔ ہاں دنیاوی دولت پر قبضہ ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمت کرنے والوں نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد وہ تاریخی مکان جس میں مصنف نے آخری سانس لی تھی اور جسے انھوں نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، اسے فوراً ہی بیچ ڈالا۔ اس حادثے پر جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ انگلستان میں ادیبوں کے محفوظ مکان کا معائنہ کرنے والی خاتون کی اپنی ذاتی وراثت اتنی جلد بے نام و نمود ہو جائے گی، ایسا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ آج ان کی روح اس واقعہ پر سخت تکلیف محسوس کر رہی ہوگی کہ جس بات کے لیے میں زندگی بھر لڑتی رہی، احتجاج کرتی رہی، آج وہی بات، وہی حادثہ، تاریخ کی وہی المنا کی میرے ہی ساتھ پیش آئی۔ مہرت ناک... مہرت ناک... ہر دم دکھم دکھم...

لوٹ پیچھے کی طرف اسے گردن ایا تو

قرۃ العین حیدر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

"بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے مامور شعراء کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پر نفسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہل نظر نے اپنے عہد رفتہ کے مشاہیر کے مکانات کو اسی طرح سجا بنانا کے دکھا ہے اور میں یہ ردنا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کون سے کی دکان کھل گئی۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"راجستھان کے دوراندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں نورست انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نو حد گری کر چکی ہوں کہ ملی گزہ کے وہ پھوس والے بنگلے جو جان بیتی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سرسید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذرِ آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ سترہویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کھین ابھی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمران شب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماشائی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی آیت ایک چیز کو منظور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے پاس دادی اماں کی آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی ٹیگ اور بیٹے پر وے کی نوکری بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ



کیے گئے ہیں۔ میں یہ بھی لکھ چکی ہوں کہ روس میں بسکن کے گھوڑے کی  
ایال کو جس چوٹی نکلنے سے سوارا جاتا تھا وہ نکلنا بھی محفوظ ہے۔ جس  
زمانے میں ہمارے ترقی پسندوں نے ہر پرانی چیز کو منسوب کیا، اس وقت  
نیک شایان میں سے کوئی بندہ روس نہیں گیا تھا۔

چنانچہ عزیز ہانو کا مکان بھی نکلنے کے چند اور مکانات کی طرح  
National Heritage میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کو ضرور یہ  
ماتے دیتی تھی کہ وہ خود ہی غائب ہو گئیں۔“

قرۃ العین حیدر کا مکان بھی بیکسل ہیئرٹج میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔  
تاریخ کی یہ دردناکی شاید انسان کا مقدر ہے۔ تاریخ کے بہاؤ اور وقت کی جبریت کا قہر جب  
سونا کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو سب کچھ تاخت و تاراج کر دیتا ہے اور انسان محض ایک بے  
بس تماشا کی طرح حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی تو اس  
عبرت ناک منظر پر چند آنسو نکل بھی آتے ہیں اور کبھی استعجابی شدت سے آنسو خشک ہو جاتے  
ہیں۔ تاریخ کی اس بے بسی اور دردناکی کی گہرائیوں میں بار بار ڈوب کر حقیقت کا ادراک کرانے  
والی خاتون کو کیا پتہ تھا کہ صدیوں سے دہرائی جانے والی اس کہانی کا انجام اتنا دردناک ہوگا۔

لے گئے حلیٹ کے فرزند میراث ظلیل

آج قرۃ العین حیدر کی برسی پر چراغاں کرنے والے بھی نہیں رہے۔ عقیدت کے دو  
پھول چھانا تو دور کی بات ہے۔

موتی ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون

وہ پھول بھی لہہ پہ کوئی دھرنہ جائے گا

کیا قبرستان کا یہ سنا کبھی ادبی سرگوشیوں میں تبدیل ہو کر انھیں خراج عقیدت پیش کر  
سکے گا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

اردو ادب کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت معنفہ لحد میں ضرور خوابیدہ ہے لیکن ان کے چاہنے والے انھیں اتنی جلد فراموش کر دیں گے، اس کا گمان بھی نہ تھا۔ لیکن حقیقت اور سچائی بڑی جاہر چیز ہے۔ جب سامنے آتی ہے تو بھرم تار تار کر دیتی ہے۔ آج وہ بھرم تار تار ہو گیا جو داستان طراز تھی۔ وہ خود داستان عہد گل ہو گئی۔ تاریخی بصیرت کا رفیع الشان احساس دلانے والی تخلیقی ہستی کا اس طرح عاید ہونا دوسروں کے لیے زبردست عبرت کا مقام ہے۔ کیا وقت اس حیرت و استعجاب کو کم کر سکے گا؟ ہمیں اس لمحے کا انتظار رہے گا۔

آج قرۃ العین حیدر دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس تاریخی قبرستان میں جہاں انھوں نے علم و ادب کی عظیم المرتبت ہستیوں، دانشوران ملت اور بانیاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درمیان بنا دی ہے، سے باہم مشاورت ضرور کر رہی ہوں گی کہ آخر یہ ستم ظریفی ہماری قوم میں ہی کیوں ہے۔ تاریخی حامل کی عظیم المرتبت ہستیوں کے درمیان رہ کر بھی اس قدر بے بسی کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ یہ قوم اپنے لعل و گہر کی عظمت کو کب پہچانے گی؟ کب انھیں عزت و توقیر ملے گی؟ میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ ان لوگوں کے درمیان میں کبھی فراموش نہیں کی جاؤں گی۔ میں نے اپنا سارا ادبی سرمایہ اس دانش گاہ کو اس لیے بخش دیا تھا کہ کم از کم ہر برس یہ لوگ میری لحد پر عقیدت رکھ کے دو پھول ہی ڈال کر میری عزت افزائی کریں گے۔ لیکن یہ تو میرا میوزیم (آرکائیو) بنا کر بیٹھ گئے۔ میرے نام کا گیت بھی وہاں بنایا جہاں علم و ادب کی ہستیوں کا گزر ہی نہ ہو۔ بھلا اسٹینڈیم سے متصل گیت سے میرے نام کی کیا نسبت؟ دانش گاہ کا مین گیت جہاں غالب غزل سرا ہیں اگر میرے نام کا ہوتا تو شاید کچھ مناسب بھی معلومات ہوتی کہ میں وہاں سے شعبہ اردو پر بھی نظر رکھ سکتی اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں پر بھی، پھر تو میری روح بھی خوش ہوتی اور میری ہستی کا وجود اس طرح ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔

تاریخی بصیرت کی حامل ہستیوں کا یہ حشر عبرت ناک ہے۔ غالب کی حویلی کی باریابی کے لیے صدیوں تک تحریک چلی پھر حکومت نے موقع پرستی کی سیاست سے فائدہ اٹھانے کے لیے واگنداری کی بھی، وہاں تو معاملہ غاصبانہ قبضے کا تھا اس لیے واگنداری ہو گئی۔ یہاں تو مکان

فروخت کر دیا گیا ہے جس کی واگداری ممکن ہی نہیں۔ تاریخ کی بوالعجیاں بھی عجیب و غریب ہیں۔ عظمت رفتہ پر تاسف کرنے اور آنسو بہانے والی ادیبہ ڈھائی ہزار سالہ ہندوستانی تاریخ کے وقوع کو کھنگالنے کے بعد کف آنسوؤں ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تو میرا ماضی، میرا عظیم الشان ماضی، میری عظیم الشان روایات کی یاد کر کے اس پر آنسو بہا کر دل کو مطمئن کر لیا۔ یہاں تو ماضی کی عظیم الشان روایات سے حال کا عظیم الشان رشتہ باقی رکھا جاسکتا تھا۔ لیکن زر پرستی کی حوس میں، ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جٹا و تحفظ کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کے صلے میں انھیں انعام بھی کیا دیا کسی دوسرے نے نہیں خود ان کے اپنوں نے جو ان کے جذبات اور ان کی عظیم الشان تخلیقی وراثت کی قدر و قیمت کو پہچان نہ سکے جو کل تک ہماری عظمتوں کی پہچان تھے اور جس پر انعام و اکرام کی بارش ہو رہی تھی اور آج خود ان کے اپنوں نے ان کی وراثت کی پامالی کر کے ان کی عظمتوں کو داغ دار کر دیا ہے۔ اب تو لعنتوں کی بارش ہوگی، مگر کس پر۔ یہ وہ مقام عبرت ہے جس سے ہر کسی کو سبق لینا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر پر جس جب بھی قلم اٹھاتا ہوں تو زندگی کے ان کے مشن کے تحت میں بے حد جذباتی ہو جاتا ہوں۔ اور میں قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کی عظمت کو خواہ اس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو داغ دار کرے۔ دنیا ان کو عزت کے منڈولے میں بٹھانا چاہتی ہے اور اپنے ہیں کہ قدر کرنا ہی نہیں جانتے۔ ہاں تو بات کلیات سازی کی چل رہی تھی اور موضوع بہک کر کہاں سے کہاں چلا گیا۔ سوال وراثت کی حفاظت کا تھا۔ میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر اس بارگراں کو اٹھا تو لیا ہے لیکن کیا وسائل کے بغیر کئی ملکوں میں بکھری ان کی تحریری وراثت کو مکمل طور پر سینٹا ممکن بھی ہو سکے گا۔ میرے خیال میں اس کا سیدھا سچا جواب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ زندگی میں کسی پر اتنا اعتماد پانے نہیں کیا جتنا مجھ پر کیا۔ سچا وجہ ہے کہ کلیات کی تدوین جیسے مشکل کام کے لیے خود سے میرا انتخاب کیا اور میں نے ان کی زندگی میں اس اعتماد کو وقار بھی عطا کیا۔ اور کلیات کی تین جلدیں سجا سنوار کے انھیں پیش بھی کر دیں۔ اب سوال آگے کا ہے۔ مجھے اکثر ایسا لگتا ہے کہ وہ مختلف صورتوں میں اپنی تحریروں میں جلوہ گر ہو کر مجھ سے

سوال کرتی ہیں کہ باقی بچا کام کب ہوگا؟ بس یہی بات مجھے بچو کے لگاتی ہے۔ میں نے آپا سے وعدہ کر لیا ہے کہ مجھ سے جہاں تک بن پڑے گا میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا۔

ان کے انتقال کو آٹھ سال بیت گئے۔ اس سچ میں نکاح کا جمع کرنا رہا۔ اب جا کر اتنا کچھ جمع ہو سکا کہ آپا کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ شاید میری یہ کاوش علم و ادب کے قدردانوں میں ان کا اعتماد مضبوط کر سکے گی۔ یہ کوشش فرد و واحد کی ضرور ہے لیکن یہ کام انسان کو ایک انجمن، ایک ادارہ بنانا ہے۔ خدا کرے میری یہ سعی جلیلہ انھیں شہرت دوام عطا کر سکے اور علم و ادب کے سرمایہ افتخار میں پیش قیمت اضافہ ثابت ہو۔

کلیات کی پہلی چار جلدیں افسانے، ناول اور ایک نیا افسانوی مجموعہ قدیل چین پر محیط ہیں۔ اب کلیات کی پانچویں جلد سے تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

Vol. - 5 : رپورتاژ	Vol. - 9 : خاکے
Vol. - 6 : رپورتاژ	Vol. - 10 : انٹرویوز
Vol. - 7 : مضامین	Vol. - 11 : انٹرویوز
Vol. - 8 : مضامین	

اس کے علاوہ ان کے تراجم، بچوں کی کہانیاں، صحافتی مضامین، فلم ریویو، کتابوں پر تبصرے، خطوط اور دیگر دوسری چیزیں۔ یہ سب قصہ انگلی پڑاؤ کا ہے۔ سلسلہ تلاش و جستجو جاری ہے۔ تحقیق اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ فی الوقت درج بالا سات جلدیں پیش خدمت ہیں۔

جلد ۵ میں خاکے ہیں۔ خاکے یا خاکے نما مضمون بھی اچھے خاصے ہیں جس کے بارے میں قرۃ العین حیدر کا کہنا ہے کہ "یہ شخصیت نگاری بھی نہیں، اور کتاب کی تنقید بھی نہیں۔" یہ بات بالکل درست ہے کہ یہ خاکے نگاری کی مستعمل تعریف کے زمرے میں بالکل فٹ نہیں بیٹھتے بلکہ قرۃ العین حیدر کی جولانی طبع اور مخصوص انداز فکر نے اس کی مرہبہ قارئین کو تو تازہ کر ایک نئی وحدت میں ڈھالا ہے۔ تاریخ، واقعات اور اشخاص پر رواں تبصرہ ان کی افسانوی تحریروں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے، یہاں وہ موضوع ہی بن گیا ہے۔ اپنی عادت کے مطابق وہ شخصیت کے حوالے

سے انسانی اقدار اور تہذیبی پس منظر کی گرہ کشائی کرنے لگتی ہیں۔ اس طرح شخصی خاکہ سماجی تجربے کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں قرۃ العین حیدر نے لکھا تھا کہ ”مجھ سے پوپ آف روم سے متعلق مضمون لکھنے کے لیے کہا جائے تو پہلے میں ہولی رومن ایمپائر پر مختصر روشنی ڈالوں گی، پھر اگلے ڈیڑھ ہزار سال کے متعلقہ معاملات پر۔ یعنی تاریخی ورثے کے ذکر کے بغیر وہ اپنے موضوع کی طرف نہیں آتی ہیں۔ وہ براہ راست منطقی استدلال کو بروئے کار نہیں لاتیں بلکہ متعلقہ کوائف کو اس طرح جمع کر دیتی ہیں کہ نتیجے پر پہنچنا ایک خود کار عمل معلوم ہونے لگتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا بیان ایسا ہے کہ بات کے کہیں سے کہیں نکل جانے میں بھی ایک انداز ہے۔ ان کی اس فطرت پر روشنی ڈالتے ہوئے ابن سعید نے لکھا ہے کہ:

”یعنی چیزوں کی ظاہری صورت کو دیکھنے کے علاوہ ان کی ماہیت کو داخلی طور پر محسوس کرنے کی عادی ہیں۔ شاید اس کی قوت باصرہ اور قوت سامعہ بہت غیر معمولی طور پر حساس واقع ہوئی ہیں۔ ایک طرف تو اس کی قوت باصرہ رنگوں اور شکلوں اور فضلوں کی کیفیت اور ہم آہنگی کو اپنے میں جذب کرنے پر مبنی رہتی ہے اور دوسری طرف اس کی قوت سامعہ آوازوں کی کیفیت اور زیر و بم اور داخلی موسیقی پر مرکوز رہتی ہے اور اس کے اپنے محسوسات نہ جانے ان رنگوں اور آوازوں کے سہارے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں اور ایک طرح کی چکاچوند کیفیت اس کی ادبی و فنی کاوشوں میں جھلک آتی ہے۔“

دراصل قرۃ العین حیدر کا طریق تحریر یہی ہے۔

قرۃ العین حیدر دوسری اصناف کی طرح خاکہ نگاری کے بارے میں بھی اپنی ایک رائے رکھتی تھیں۔ لکھتی ہیں:

”مخصوصیت نگاری، خصوصاً ان شخصیتوں کے متعلق کچھ لکھنا جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں، ایسے بھی بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ موت اور زمانے کا وقت، یہ دونوں چیزیں ایک دھندلکے میں انسان کو چھپا دیتی ہیں اور عموماً یہ دھندلکا ذرا قاصطے سے بڑا اور مائی اور خوب صورت

دکھائی پڑتا ہے۔ جب کبھی ہم اپنے مرحوم بزرگوں، عزیزوں یا اپنے  
بڑے لوگوں کو یاد کرتے ہیں تو بہت سی طے پٹے جذبات کے ساتھ ان  
کے لیے قلم اٹھایا جاتا ہے۔ کچھ ان ہستیوں کے لیے عقیدت ہوتی ہے،  
کچھ ان گزرے زمانوں کے لیے تامل، جن میں یہ لوگ زندہ تھے۔ پھر  
ان خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اب ناپید ہیں...

قرۃ العین حیدر نے اپنے پورے ادبی سفر میں یوں تو باقاعدہ چند ہی شخصی خاکے لکھے  
ہیں۔ لیکن مختلف شخصیتوں پر لکھے گئے تعزیت نامے، یادیں یا تاثراتی تحریروں میں بھی شخصی خاکے  
ابھرے ہیں۔ بعض شخصیات کے حوالے سے یادیں یا شخصی تعلق یا نگاہ کا بیان کر دیا ہے۔ ان کے  
کام کے بارے میں اقداری فیصلے کم کیے ہیں اور مجموعی ادبی فضا کو زیادہ تر موضوع بنایا ہے۔

’داستان طراز، چودھری محمد علی رودلوی۔ پر مضمون یوں شروع ہوتا ہے:  
”... یہ شخصیت نگاری بھی نہیں کیونکہ چودھری محمد علی رودلوی کے  
متعلق میں اس طرح سے کچھ نہیں لکھ سکتی جس طرح سے میں اپنی نسل سے  
کسی فرد کے بارے میں لکھ سکتی ہوں۔“  
پھر آگے رقم طراز ہیں:

”بہشت انسانکس چودھری محمد علی اردو کے ایسے منفرد ادیب  
ہیں کہ کوشش کر کے بھی ان کی زبان اور اظہار بیان کا تتبع نہیں کیا جاسکتا۔  
محمد علی ادب میں اپنے ساتھ یہ اسٹائل لائے اور یہ محض ان ہی کا حصہ  
ہے۔“

ذرا دیکھیے کس خوب صورتی سے محض چند الفاظ میں محمد علی رودلوی کے اسلوب کا پورا احاطہ  
کر دیا کہ وہ اپنے اسلوب کے بانی بھی تھے اور خاتم بھی۔ پھر فرماتی ہیں:

”ان کی نئی کتاب ادبی حیثیت سے ہمارے لیے کلاسیک کا درجہ  
رکھتی ہے۔ جس معلوم ہم میں سے کتنے لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ  
اس کتاب کا لکھنے والا اور اس کا پس منظر ہماری ہندو پاک کی تہذیب کے  
نامے بانے میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔“

بھلا قارئین کتاب کی تنقید بھی نہیں والے قرۃ العین حیدر کے بیان کے زمرے سے درج بالا کوٹیشن کو کیسے باہر رکھ سکتے ہیں۔ یہ تو مکمل تنقیدی بیان ہے، وہ بھی فیصلہ جاتی۔ اسی طرح عزیز احمد اور غلام عباس پر مضامین میں شخصی خاکے کے بعض لوازمات کے ساتھ وہ ان کے کام پر تنقید بھی کرتی نظر آتی ہیں مگر وہ اس فریضے کو اس طرح انجام دیتی ہیں کہ طریق کار میں فرق ضرور رہتا ہے، ماحصل میں نہیں۔

قرۃ العین حیدر کا یہی انداز اور برتاؤ تمام خاکے اور خاکہ نما تحریروں میں موجود ہے۔ ہر تحریر میں تمام وصف ایک ساتھ موجود ہوں، یہ بھی ممکن نہیں۔ کسی شخص کا کوئی ایک پہلو یا کئی پہلو مد نظر ہوتے ہیں۔ اکثر خاکے محض عقیدتا لکھے جاتے ہیں یا جن شخصیات سے بہت متاثر ہوتے ہیں ان کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کہتی ہیں:

”میری کچر گیلری میں ان محنت مناظر اور پورٹریٹ اور انتیریور اور لینڈ اسکیپ ہیں۔ نئے ہوئے لکھنؤ اور دہلی والے اور مٹ جانے والے لکھنؤ اور دہلی والے ہیں۔ بہت سے دھندلے سائے متحرک ہیں۔ بے شمار اور ارق پچھٹاتے ہیں۔ بچے اڑ رہے ہیں اور بگولے اور بادل اور ہوائیں جو سب زمانوں کو ملا دیتی ہیں اور قبروں پر گھاس اور پھول اُگ آتے ہیں۔“

قبروں پر اُگے گھاس پھوس کو ہٹا کر اپنی کچر گیلری کی ایک ایک تصویر کی شبیہ کو اپنی یادوں کے سہارے نہ صرف اجاگر کرتی ہیں بلکہ ان پر چھائی زمانے، وقت اور تاریخ کی دھند کو صاف کر کے ان کی شخصیت کو نکھار کر ایک زندہ جاوید کردار بنا دیتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے خاکوں کے مطالعہ کے بعد آپ بھی شاید میری اس بات کی تائید کریں۔ یہ تمام خاکے خاکہ نگاری کی صنف میں اہم اضافہ تصور کیے جائیں گے۔

قرۃ العین کی ان نکھری ہوئی تحریروں کو مجتمع کرنے میں بہت سے افراد اور اداروں نے میری معاونت کی ہے جن کا شکر یہ ادا کرتا ہوں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر نجیب اختر، برادر عزیز کفیل اختر، ڈاکٹر ارشد رضا بھگپور، عزیز ی جاوید اختر، بزرگ محترم مہر الہی



مدیم صاحب، برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر حسین فراقی (لاہور)،  
ڈاکٹر آصف فرخی (کراچی)، صبا اکرام (کراچی)، علی حیدر ملک (کراچی)، پروفیسر مرزا حامد  
بیک (لاہور)، پروفیسر غلام حسین ساجد (لاہور)، پروفیسر علی احمد فاطمی، چودھری ابن النصیر  
(ایڈیٹر پیمان)، شمع افروز زیدی (ایڈیٹر بیسویں صدی)، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رام پور) کا  
جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ تحقیق کے مشکل مرحلے میں ان تمام لوگوں کا پر خلوص تعاون مجھے  
ملتا رہے ہے تبھی تنکا تنکا جمع ہو سکا، اور جو رہ گیا ہے وہ بھی انشاء اللہ حاصل ہو جائے گا۔

اداروں میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدابخش لائبریری پٹنہ، انصاری لائبریری  
جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرۃ العین حیدر آرکائیو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افراد کا بھی شکریہ لازم ہے جن کی  
پر خلوص معاونت نے تحقیق کے مرحلے کو آسان بنا دیا فرداً فرداً سب کا نام گنانا ممکن نہیں۔ لیکن  
ان کے کرم خاص کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

قوی اردو کونسل کا شکریہ بھی ضروری ہے اس لیے کہ ان کے تعاون کے بغیر کلیات کی  
طباعت کا خواب ادھورا رہتا۔ لہذا میں قوی کونسل کے تمام افراد کا جنھوں نے کلیات کی طباعت و  
اشاعت کے کسی بھی مرحلے میں مدد کی میں فرداً فرداً سبھی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب آخری شکریہ  
نوجوان دوست تنویر احمد کا جن کی محنت شاقہ سے کلیات کمپوزنگ کے دشوار گزار مرحلے سے گزر کر  
مکمل ہوئی اور طباعت تک پہنچی۔

بیوی اور بچوں کا شکریہ کیا ادا کروں، ان کی حق تلفی کا مجھے شدید احساس ہے لیکن ملول  
خاطر نہیں ہوتے۔

جمیل اختر

جنوری 2015

سرباگل: 9818318512

نئی دہلی

ای میل: jameelakhtar788@yahoo.com



## مہاتما اور دیوتا سمان

(سید سجاد حیدر یلدرم)

یہ جو مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں یلدرم پر مضمون لکھوں، یہ میرے لیے ایک بڑا مرحلہ ہے۔ شخصیت نگاری، خصوصاً شخصیتوں کے متعلق کچھ لکھنا جواب ہمارے درمیان موجود نہیں، ایسے بھی بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ موت، اور زمانے کا وقفہ، یہ دونوں چیزیں ایک دھندلکے میں انسان کو چھپا دیتی ہیں اور عموماً یہ دھندلکا ذرا فاصلے سے بڑا رومانی اور خوبصورت دکھلائی پڑتا ہے۔ جب کبھی ہم اپنے مرحوم بزرگوں، عزیزوں یا اپنے بڑے لوگوں کو یاد کرتے ہیں تو بہت ہی طے جلد جذبات کے ساتھ ان کے لیے قلم اٹھایا جاتا ہے۔ کچھ ان ہستیوں کے لیے عقیدت ہوتی ہے کچھ ان گزرے زمانوں کے لیے نوستالجیا جن میں یہ لوگ زندہ تھے۔ پھر ان خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جواب ناپید ہیں۔ طرح طرح کے مضمون ہوتے ہیں۔

آج کل یوں بھی ہوتا ہے کہ اس طرح اپنے کرداروں کو متعارف کیجیے جس سے ظاہر ہو کہ آپ ان کی کمزوریوں اور خامیوں کا مذاق اڑا کر دل ہی دل میں خوش ہو رہے ہیں۔ گویا

شخصیت نگاری بھی رہی اور 'ممدوح' پرایک قسم کی ایکٹیوٹی بھی ہوگئی۔  
پھر اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک انجمن تو سیف باہمی قائم کی جاتی ہے اور ایک دوسرے پر طبع آزمائی ہوتی ہے۔

یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر بہت دلچسپ ہیں لیکن اب کے اس رسالے میں اردو کے ان بڑے ادیبوں کے متعلق بھی تذکرہ کیا جا رہا ہے جن کو ہم واقعتاً احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور جواب ہماری محفل سے اٹھ کر چائے ہیں۔ یلدرم بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں ہم ایک چٹا پھرتا خاکہ نہیں لکھ سکتے۔ اور یلدرم کے متعلق مضمون لکھتے ہوئے میں پوری کوشش یہ بھی کروں گی کہ جو کچھ ان کے بارے میں آپ کو بتاؤں اس میں محبت کا وہ عنصر نہ آنے پائے جو تصویر کو اسی ردینک دھندلے میں چھپا دیتا ہے۔

لیکن لکھنا شروع کرنے سے پہلے ایک پریشان کن سوال پھر یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں کتنا ہی Objective مضمون لکھوں پر چونکہ یلدرم کے پورے کردار میں کہیں پر بھی کوئی چھوٹی سی غیر اہم خالی یا کمزوری نہ تھی اس لیے مضمون پھر لامحالہ مبالغہ آمیز معلوم ہوگا۔ ایسے فرشتہ صفت قسم کے انسانوں کے بارے میں کچھ لکھنا واقعی بہت دشوار ہے۔

فرشتوں کی تصویروں میں رنگ نہیں ہوتا محض نور ہوتا ہے جو اتنا دلچسپ نہیں۔ نور سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ رنگ فانوس ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں۔  
مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ یلدرم کی تصویر میں رنگ بھی ہیں کیونکہ چودھری محمد علی ردو لوی کی مانند یہ بھی ایک پورے زمانے، پورے دور کے نمائندے تھے۔

روایت کو بھانے کے لیے میں بھی حالات زندگی سے مضمون شروع کر رہی ہوں اور اس لیے بھی کہ خاندانی اور معاشرتی پس منظر کو اجاگر کیے بتایہ اندازہ نہ ہو سکے گا کہ یلدرم میں یہ خصوصیات کہاں سے آئیں۔

یلدرم کے خاندان کو ان سب چیزوں پر بڑا فخر تھا جو ایک زمانے میں انسانیت کا اعلیٰ ترین معیار سمجھی جاتی تھیں۔ یعنی کلچر اور شرافت نفس۔ (اس کے علاوہ ان لوگوں کو اپنے نہایت

کھرے قسم کے سید ہونے پر بھی سخت ناز تھا۔) سید حسن ترمیزی یلدرم کے مگر سکر دادا تھے جو وسط ایشیا سے ہندوستان آئے۔ (ترہز آج کل سوویت ترکستان میں ہے) صدیوں تک اس گھرانے میں علم کی وراثت ایک نسل دوسری نسل کے ہاتھ سونپتی گئی۔ یہ سب عالم لوگ تھے۔ روایتی قسم کے مولوی اور کچھ ملائیس تھے۔ فہذا علیت کے ساتھ ساتھ زندگی کی لہر بھی قائم رہی۔ زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں بھی پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ اسی گھرانے کی ایک بی بی سیدہ ام سریم نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا۔ سیدہ ام سریم کی بیٹی یلدرم کی ماں تھیں۔

یہ زمیندار لوگ تھے۔ دربار مظلیہ میں سہ ہزاری، بیچ ہزاری و منصب دار وغیرہ رہے۔ (واضح رہے کہ فیوڈل خاندانوں کی Legend کے یہ لازمی عناصر ہیں۔ دربار، جاگیریں، شعر و شاعری۔ لیکن اب ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ معاشرے کی تہذیبی اقدار کو انھوں نے اپنے وجود سے کیا فائدہ اور کیا نقصان پہنچائے) ندر 1857 عیسوی میں یلدرم کے دادا امیر احمد علی نے زور شور سے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا فہذا جاگیریں ضبط ہو گئیں اور زوال آیا اور نئی پود کو انگریزی پڑھنا اور سرکاری ملازمتیں کرنا پڑیں۔ (یہ بھی کہانی کا طے شدہ مکمل پیٹرن ہے۔ نکلنسن، دلی اور سارے اتر پردیش کے انگلت مسلمان خاندانوں کی ساری داستان مختصر ایسی ہے۔ بعض ناموں کا فرق ہے۔) یہ انگریزی پڑھنے اور انگریز کی ملازمت کرنے والے یلدرم کے باپ اور چچا تھے۔ یلدرم کے باپ خان بہادر سید جلال الدین حیدر شہر بنارس کے حاکم تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی یعنی یلدرم کے چچا خان بہادر ڈاکٹر سید کرار حیدر یو پی میں سول سرجن تھے اور انیسویں صدی کے آخر میں صوبے کے مشہور ڈاکٹروں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ 1896 عیسوی میں گھوڑے سے گر کر ان کا انتقال ہوا۔

یلدرم 1880 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ بچپن اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ گنگا کے کنارے کھیلنے کودنے میں گزارا۔ بہت نازل قسم کا پرانے فیشن کا ان کا بچپن رہا ہوگا۔ یعنی ایسا بچپن جس میں ابھی بڑوں پر چاکلڈ سائیکولوجی کے اسرار و رموز کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ یلدرم کے باپ، جن کے رعب و دبدبے سے سارا بنارس تھر تھر کانپتا تھا، اپنے بچوں کے لیے ان کے رفیق

تھے اور فلاسفر بھی۔ انھوں نے اپنی اولاد کو سب سے پہلا سبق یہ پڑھایا کہ دوسروں کی دل آزاری عظیم ترین گناہ ہے۔ یلدرم اور ان کے بیٹوں بھائیوں کی زندگیوں اس نصیحت کی کامل تفسیر ہیں۔ سید جلال الدین حیدر ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے جاگیردارانہ پس منظر اور خود اپنے وسیع اختیارات اور اقدار کے باوجود ان کے مزاج میں کسی قسم کا تکبر یا غرور نہ تھی۔ ان کی پر شکوہ شخصیت، انصاف پسندی اور کمزوری پرستی کی وجہ سے لوگ ان سے خائف رہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شفقت، نیکی اور دردمندی کی وجہ سے عوام کو ان سے بے اندازہ محبت بھی تھی۔ ان کی زندگی ہی میں بنارس میں انھیں مہاتما اور دیوتا مان سمجھا جاتا تھا اور ساٹھ ستر برس گزرنے کے باوجود آج بھی وہاں پر ان کا نام ایک طرح کی تقدیس اور عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

جب یہ بچے بڑے ہوئے تو خان بہادر صاحب نے انھیں علی گڑھ بھیج دیا اور یلدرم اور ان کے بھائی ایم اے کالج میں داخل کیے گئے۔

سجاد حیدر یلدرم کی زندگی کے واقعات آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دینے والے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری عمر بہت خاموشی اور نرم روی سے گزاری۔ 'انا' ہم سب کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ بعض دفعہ یہ کمزوری بہت کارآمد ہوتی ہے ورنہ کوئی کلاکار اپنا اظہار نہ کرتا۔ (لیکن زیادہ تر یہ 'انا' بقول مولانا ابوالکلام آزاد ایسا کس قدر کھل جاتا ہے اور دوسروں کے لیے کتنا صبر آزما ثابت ہوتا ہے)۔ بہر حال یلدرم میں یہ لوکھا پن تھا کہ آدرش ہونے کے باوجود ان میں اس ایثار کا فقدان تھا اور اس وجہ سے انھیں زندگی میں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

اس Humility پر ہمیں قردن اولیٰ اور قردن وسطیٰ کے کیتھولک فلسفیوں نے بہت کچھ سکھانا چاہا ہے اور بڑے انسان کی سب سے بڑی نشانی یہی ہے۔

1901 عیسوی میں یلدرم نے بی اے کیا اور سارے صوبے میں سیکنڈ آئے۔ (اس زمانے میں علی گڑھ کالج آباد یونیورسٹی سے منسلک تھا) یہ ریاضی میں بے حد کمزور تھے اس لیے ایک مرتبہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں سارے صوبے میں فرسٹ آئے لیکن ریاضی میں فیل ہو

گئے۔ اس زمانے میں ریاضی انٹرمیڈیٹ کے لیے لازمی مضمون تھی۔<sup>۱</sup>  
 یلدرم یونین کے سکریٹری اور پریزیڈنٹ رہے۔ تقریر بہت عمدہ کرتے تھے، لباس ہمیشہ  
 انگریزی اور بہت اعلیٰ درجے کا پہنتے تھے۔ مولانا محمد علی ان کے کلاس فیلو تھے۔ اسی زمانے میں  
 ایک اور دوست عبدالرحمن صدیقی ۲ علی گڑھ آن پہنچے۔ لکھنؤ کے چودھری نعمت اللہ بھی اسی کلاس  
 میں تھے۔ انھوں نے بعد میں قانون میں بہت نام پیدا کیا۔ آج سے نصف صدی قبل کے علی گڑھ  
 کے ان مشہور کھلنڈروں کی زندگی بہت دلچسپ اور بھرپور رہی ہوگی۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک  
 ہمیں یلدرم کی مشہور طویل نظم 'مرزا پھویا علی گڑھ کالج میں' میں ملتی ہے جو انھوں نے اپنے زمانہ  
 طالب علمی میں لکھی تھی:

ایک صاحب اودھ میں رہتے تھے	مرزا پھویا سب ان کو کہتے تھے
کیا کہوں تھا کہاں چین ان کا	لکھنؤ تھا کبھی وطن ان کا
گھر سے نکلے نہ تھے تمام عمر	ساری بھوزے ہی میں گزاری عمر
خیر سے تھا ابھی شباب شروع	عمر کا بیسواں تھا باب شروع
چمن تھا دن کو لطف راتوں میں	وقت کتنا تھا یونہی باتوں میں
کہ فلک ہو گیا خلل انداز	تجھ سے سمجھے خدا، ارے دم باز!

وہ یوں ہوا:

قوم میں سب سے اعلیٰ و ادلی	محسن الملک، محسن الدولہ
درد قوی کے اس معالج نے	یعنی سکریٹری کالج نے
سارے شہروں کا جب کیا دورہ	لکھنؤ بھی شرف اس سے ہوا
دھوم تھی اک فصیح آیا ہے	نیچری فوج ساتھ لایا ہے
وقت تقریر اس کا طرز بیاں	کہ شرر بارگاہ نور فشاں
جادو کرتا ہے سحر کرتا ہے	مہر کرتا ہے قہر کرتا ہے
جب ہوئے دوستان کے سارے بھند	تب تو مرزا کے والد ماجد



جا کے جلے میں خود شریک ہوئے سارے لکچر بنور انھوں نے سنے  
 کر گیا ان پہ جادو اپنا کام تھا علی گڑھ کا ہی زبان پر نام  
 ایک دم یہ تہیہ کر بیٹھے بس علی گڑھ میں مرزا جا کے پڑھے  
 چنانچہ مرزا پھوپھا علی گڑھ بھیج دیے گئے جو کچھ ان پر وہاں بتی اس کے بعد:

اک عربیے کی ہوں بنا ڈال قبلہ ام مدظلہ العالی  
 اولاً مجرا عرض کرتا ہوں حال پھر اپنا عرض کرتا ہوں  
 ہو کے رخصت جناب سے پہنچا کیا کہوں اس جگہ پہ کیا دیکھا  
 یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سنا  
 جنس ہر اک نئی دکان نئی اور تو اور، ہے زبان نئی  
 بوجھم کی ہو ذرا سی بھی اس کو کہتے ہیں یاں پہ عیاشی  
 عطر میں گر کبھی جو کپڑے بسائیں فوراً عیاش آپ کہلائیں  
 دوڑتے، کودتے، اُچھلتے ہیں بھول کر بھی نہ سیدھے چلتے ہیں  
 کوئی مارے چھلانگ تو یہ خوش ٹوٹ جائے جو ٹانگ تو یہ خوش  
 ہو گئی میری جان بھی بیکل جب وہ چیلے: 'بریک ان ٹوڈے'!

چند اور شکایات کے بعد خط کے آخر میں:

اس لیے عرض ہے کہ یہ چیزیں لکھتے سے روانہ آپ کریں  
 ایک ڈبیہ دیا سلائی کی پڑیا اک نیلی روشنائی کی  
 اک برش جو تا صاف کرنے کا اور براکتو بھی ساتھ تھوڑا سا  
 دو گھڑے، اک صراحی، پیالے چار اور ممکن ہو مگر تو تھوڑا اچار

سر عبدالقادر مرحوم نے کہیں پر ایک دلچسپ واقعے کا ذکر کیا ہے جب یہ ابھی مدیر 'مخزن'  
 نہ تھے اور کسی انگریزی اخبار کے اسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور یلدرم ابھی بی اے میں پڑھ رہے تھے۔  
 ان کی یلدرم سے پہلی مرتبہ حاجی محمد اسماعیل خان صاحب کے یہاں علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔

”حاجی صاحب نے سجاد سے میرا تعارف کرایا۔ جب میں حاجی صاحب سے بات کر کے فارغ ہوا تو سجاد میرے پیچھے پیچھے آئے اور کہنے لگے، آئیے میں آپ کو ایک دلچسپ چیز دکھاؤں۔ آپ شبلی فرزدہ کو مشق سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں؟ مولانا شبلی اس وقت حاجی صاحب کے مہمان تھے اور اسی بیٹگلے کے ایک کمرے میں بٹھہرے ہوئے تھے۔ سجاد مجھے ایک کمرے کی طرف لے گئے جس کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ مولانا شبلی دروازے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ ہم دروازے کے آئینوں میں سے جھانک کر انہیں دیکھ سکتے تھے پردہ ہمیں نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کا قلم کبھی کاغذ پر چلتا تھا کبھی اس کا ایک سرانہ کے قریب ہوتا تھا جیسے لکڑی میں ہیں۔ معلوم نہیں ہم دونوں کا مولانا کو اس طرح دزدیدہ دیکھنا کہاں تک جائز یا مناسب تھا مگر مجھے اس کا کبھی افسوس نہ ہوا کہ ہم نے یہ حرکت کی اور سجاد حیدر کا یہ جذبہ مجھے بہت بھایا کہ مولانا کو لکڑی میں لکھتے دیکھنے سے ان کو جو لطف آیا اس میں انہوں نے مجھے بھی شریک کرنا ضروری سمجھا اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم کس قدر ہم مذاق ہیں۔ مولانا شبلی اپنے شاگردوں میں شبلی فرزدہ کے نام سے اس لیے مشہور تھے کہ وہ فارسی اشعار میں اپنے نام کے ساتھ ’فرزدہ‘ لکھا کرتے تھے۔“

علی گڑھ ان دنوں گویا اوسفورڈ کا ماڈل بنا ہوا تھا۔ قیوڈوریک پرنسپل تھے۔ آرملڈ اور نکلسن انگریزی کے استاد تھے۔ پروفیسر چکرورتی اور ڈاکٹر ضیاء الدین ریاضی پڑھاتے تھے۔ مولوی عباس حسین عربی کے استاد تھے اور مولانا شبلی فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ یلدرم فارسی میں بہت اچھے تھے لہذا شبلی کے بہت پسندیدہ شاگردوں میں سے تھے۔

خوشحال خاندانوں کے لڑکے جو یہاں سے نکلتے ان کو اب مسلمانوں کے نئے معاشرے کی قیادت کرنا تھی۔ جداگانہ مسلم سیاسی پلیٹ فارم کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ (علی گڑھ کی درس گاہ انڈین نیشنل کالج کے قیام سے دس سال قبل قائم کی جا چکی تھی) وائسرائے اور گورنر صاحبان آکر انگریزی ہال میں ان نوجوانوں کو خطاب کرتے۔ ان کی تقریروں میں مسلمان قوم کی بے اندازہ تعریفیں ہوتیں۔ پھر یہ نوجوان باہر آکر سول سروسوں میں لیے جاتے۔ وائسرائے ہند سے

مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات اور تقسیم بنگال وغیرہ کے مسائل پر گفت و شنید کرتے۔  
 یلدرم کے سامنے بھی یہی راستے تھے۔ یا یہ قانون پڑھنے کے لیے ولایت جاتے، واپس  
 آ کر ہیرٹری کرتے، ہائی کورٹ کے جج بننے یا قوم کی قیادت کرتے اور آخر میں کسی ہندوستانی  
 ریاست کے دیوان بن جاتے۔ ان کے گھروالوں کے سامنے بھی یہی پروگرام تھا۔ لیکن اس کے  
 بجائے آپ ایک سہانی صبح بغداد بھاگ لیے اور کئی سال تک سلطنت عثمانیہ اور شرقی یورپ میں  
 گھومتے رہے۔

زمانہ طالب علمی سے ان کو ترکی سے چنی لگاؤ ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں ہی انھوں نے  
 ترکی زبان میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ بی اے کے بعد ابھی یہ علی گڑھ میں ہی مقیم تھے اور ایل  
 ایل بی کے لیے پڑھ رہے تھے جب برطانوی قانون آفس سے کسی نے ان کے ایک انگریز پروفیسر  
 کو لکھا کہ بغداد کے برطانوی قونصل خانے کے لیے ترکی زبان کے ترجمان کی ضرورت ہے۔  
 پروفیسر نے ان سے ذکر کیا۔ آپ نے ترکی پہنچنے کا یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً چل کھڑے  
 ہوئے۔

اسی زمانے میں انھوں نے ترکی ادب کی طرف توجہ کی۔ 1902 عیسوی میں انھوں نے  
 احمد حکمت کے ایک ناول 'نائل' کا ترجمہ کیا۔ کتاب کے شروع میں 14 اگست 1902 عیسوی  
 کی تاریخ کے ساتھ 'التاس مترجم' کے عنوان سے یہ سطور یلدرم نے لکھیں:

"میں اس ترجمے کو بہت دھوم دھڑکے سے پیش نہیں کرنا چاہتا  
 اور نہ اس جرم کی معافی چاہتا ہوں کہ میں نے نائل کا ترجمہ کیا اور اس  
 طرح پبلک کے مذاق کو ایک مضرت کی طرف راغب کیا۔ قصوں کے  
 ترجمے آج کل بہت ہو رہے ہیں مگر سب انگریزی سے۔ اور اس کے عرض  
 کرنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی سے بھی کس قسم کے ناولوں کے ترجمے  
 ہو رہے ہیں۔

میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ اس  
 سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا

بلکہ ترکوں کی سوشل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آ جائے گا۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر کی میں اردو میں اس لیے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انھیں بھی پیش آ چکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب کہاں ہیں۔ ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہو گا مگر ترکوں کا طرز ادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے اور مغربی اور ایشیائی طرز تحریر کا ایسا معقول میل ہے کہ میں نے نقلی ترجمے کی کوشش کی ہے۔ گفتگو انوکھی تو ضرور ہے لیکن سنئے تو سہی:

غریب شہر خن ہائے گفتنی دارد

اس وقت یلدرم کی عمر کوئی اکیس یا بائیس سال کی تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اور دوسرے نوجوانوں نے 'خنزن' میں لکھنا شروع کیا۔ 'خنزن' کا یہ ابتدائی دور اردو کی جدید تاریخ میں بہت اہم حیثیت کا مالک ہے۔

جیسویں صدی کے اولین برسوں میں جیسے یہ ایک نئی صبح ہو رہی تھی جس کے اجالے میں نئی نئی چیزیں منظر میں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ ملک میں ایک نیا دور (نہایت ہیودہ لفظ) مطلب یہ کہ ایک عہد نو (لاحول ولا قوۃ!) شروع ہو چکا تھا۔ یہ بالآخر انڈیورڈین عہد تھا۔ ادب کے میدان میں بڑی گہما گہمی تھی۔ انگلستان کے ادب میں اس وقت امپریلزم، سوشلزم اور Aestheticism کی دھاراؤں ساتھ ساتھ بہہ رہی تھیں۔ ایک طرف کپٹنگ صاحب جو تھے و Britannia Rule کے نئے پراسرار دھن رہے تھے، دوسری طرف برنارڈ شا اور ان کی فمین سوسائٹی کی اشتراکیت کا تصور و مانگوں پر رفتہ رفتہ قبضہ جما رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ڈبلو بی بیٹس کی شرقی اور کینک اسرار پسندی اور آئرش قوم پرستی کا چرچا تھا۔ اوسکر وائلڈ اور ان کے ساتھی جمالیات کے نظریوں کی موشگافی میں جنے تھے۔ جی ایم ہو پکنز جدید شاعری کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ پیرس میں الگ اودھم مچی ہوئی تھی۔ جدیدیت کے سارے نئے 'ازم' تھمکے پھا کر رہے تھے۔ دوسری طرف مقدس سلطنت روس میں مہاتما لسانائی نے تھک کر آخر میں یہ سوال کیا تھا کہ "اب کیا کرنا چاہیے؟" اور "خود سوچو اور

جواب دو۔ ”اور ایک نیا نام سامنے آچکا تھا۔ یکسٹم گور کی اگھر، بنگال میں، عظیم ہول لکھے جا رہے تھے۔ نیگور نے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

اس سے ہمارے ہندوستانی مسلمان نوجوانوں کو بڑے فن برائے زندگی کی ضرورت تھی۔ انھوں نے آئیڈیلزم کو اپنایا۔

اسی وقت یلدرم نے لکھنا شروع کیا تھا۔

یلدرم کی رومانیت خالص مغربی (اور ترکی) رومانیت تھی۔ انھوں نے عورت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اب وہ وطن کے پیچھے سے جھانکنے والی سرشار کی سپر آرائش تھی۔ یہ عورت کو اپنے ہمراہ اپنے برابر لانا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ناممکن تھا۔ انھوں نے اپنے قصوں کی لڑکیوں کو لکھنا اور ملی کی حویلیوں کی چہار دیواری سے نکال کر بیٹی کی چو پانی پر کھلی ہوا میں سانس لینا دیکھنے کی تمنا کی۔ اسی لیے انھوں نے ہندوستان سے باہر ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا۔ اس وقت ایران اور مصر بہت ہی پس ماندہ تھے۔ ترکی میں یورپین اقوام کے قرب کی وجہ سے زندگی کی لہر زیادہ تیز ہو چکی تھی۔ یلدرم نے جن ترکی ڈراموں کا ترجمہ کر کے ان کی ہیر و منوں کو اردو پڑھنے والوں سے روشناس کرایا (زہرا، حرا، قمر، اسچہ وغیرہ) ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یلدرم کی آئیڈیل لڑکیاں تھیں۔ یہاں پر میں سر عبدالقادر مرحوم کی تحریر پھر نقل کرتی ہوں جس سے آزادی نسواں کے بارے میں یلدرم کے خیالات کا کچھ پتہ چلے گا۔ سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

”1907 عیسوی میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کراچی میں ہو رہی تھی جس کے صدر اس سال مولانا حالی تھے اور سجاد حیدر بھی اس میں شریک تھے۔ ایک دن جب میں جلسے کے بعد اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سامنے سے سجاد آتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے کئی ایک پکرا پکے گرد لگائے جیسے خوشی سے دھس کر رہے ہوں۔ مجھ سے کہنے لگے، کچھ نہ پوچھیے، میرا دام اس وقت آسمان پر ہے اور میں زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے پوچھا، کچھ بتاؤ تو، کیا دیکھا ہے؟“ کہنے

لکھے 'ایک ایسی خاتون سے مل کر آ رہا ہوں جو آزادی کی حامی ہیں اور خود آزادی پر عامل ہیں۔'

بغداد کے بعد ان کا تبادلہ قسطنطنیہ کے برطانوی سفارت خانے میں ہو گیا۔ یہاں یلدرم ترکی کے نئے ادب کی تحریک اور نئے لکھنے والوں اور سیاسی انقلابیوں کے بہت قریب رہے۔ اسی زمانے میں نوجوان وطن پرستوں نے بیک ٹرک پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ یلدرم خود بہت کچے انقلابی تھے۔ یہ برطانوی فارن آفس کے ملازم تھے اور غلام آباد ہند کے باشندے تھے لیکن عالم یہ تھا کہ بیک ٹرک پارٹی کی اولین میٹنگ آپ کے گھر پر ہی منعقد کی گئی اور خفیہ پولس اور جاسوسوں کی نگرانی کے باوجود مستقل انٹرگرادر ٹیم کے جلسے اور کارروائیاں آپ کے یہاں ہوتی رہیں۔

یلدرم کی یہ انقلاب پرستی رومانیہ کے جذبے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے بہت بڑا خطرہ مول لے کر بیک ٹرک پارٹی کے ساتھ کام کیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ بعد میں ساری عمر کبھی بھولے سے اس کا ذکر نہ کیا۔ میرے خیال میں ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سنسنی خیز شہرت حاصل کرنے کے لیے بعد میں ہمیشہ کے واسطے لیڈر قوم اور غازی وغیرہ بن جاتا۔

دبی "ایزو" کا قہدان۔

یلدرم سلطنت عثمانیہ میں کئی سال رہے۔ قسطنطنیہ کے بعد ان کا دوسرا پسندیدہ شہر بوڈاپسٹ تھا۔ یہ پہلی جنگ عظیم سے قبل کا یورپ تھا۔ یہاں پر ہر طرف رومانسی رومان تھا۔ (وی آنا کے اسپیریل اوپرا میں واگنر کی نسل کے ساتھی ہیوگو ولف ابھی موجود تھے۔ سائیکلس اپنی موسیقی کیوز کر رہے تھے۔ برلن میں اسٹراس تھے۔ بیرس میں Debussy نے موسیقی میں اپریشنز کی بنا ڈالی تھی۔ یہ یورپ اگست 1914 میں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔)

جنگ چھڑنے سے کچھ عرصہ قبل یلدرم کا تبادلہ امیر یعقوب خان سابق امیر کابل کے اسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے ہندوستان کر دیا گیا اور یہ قسطنطنیہ سے وطن واپس آئے۔ امیر یعقوب خان تیسری جنگ افغان میں شکست کے بعد انگریزوں کے اسیر کی حیثیت سے مسوری میں نظر بند تھے۔ یلدرم نے ترکی کے انقلابی ماحول کے بعد ایک نئی نکتہ خود کو ایک شکست

خوردہ افغان بادشاہ کی معیت میں پایا۔ یہ کئی سال تک مسوری اور ڈیرہ دونوں میں جلا وطن افغان بادشاہ اور شہزادوں کے ساتھ رہے۔

اسی زمانے میں یعنی 1812 عیسوی میں یلدرم کی شادی ہوئی۔ جب یہ ترکی سے تنہا لوٹے تھے تو ان کے دوستوں کے گردہ میں بڑی کھلی بچی تھی کہ یہ کیا سلسلے ہیں۔ یہ ضرور کوئی ترکن بیابہ کر کے وہاں چھوڑ آئے ہیں جواب اگلے جہاز سے پہنچتی ہوگی۔ ترکی سے اتنا عشق اور ترکن سے شادی نہ کی۔ اکبر الہ آبادی نے اس پر ایک مزے دار قطعہ بھی کہا تھا۔ لیکن انھوں نے دوستوں پر واقعی یہ ایکٹیوٹی کر دی کہ کسی ترکن کی بجائے ہندستان ہی میں بیابہ کیا۔

اتر پردیش میں ایک اور خاندان سادات ہے جو یلدرم کے گھرانے کی طرح صدیوں سے علیت اور کلچر کا گہوارہ رہا ہے۔ ملکہ نور جہاں کے عہد میں جب ایرانی عاملوں اور مصوروں نے جوق در جوق ہندستان آنا شروع کیا اسی زمانے میں میٹا پور، ایران کا یہ خاندان جہانگیر کے دربار میں مدعو کیا گیا۔ اور یہاں رام گنگا کی وادی میں انھیں معافی کی زمینیں یعنی 'بادن گاؤں' مع نوابی کے خطاب کے عطا کیے گئے۔ دربار میں زیادہ تر علمی کام ان کے سپرد رہے۔ خصوصاً حکومت کا نظم و نسق اور ملکہ الیات کے عہدے۔ اس قبیلے میں کئی کافی دلچسپ ہستیاں گزری ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نعمت خان عالی تھے جو شہنشاہ اورنگ زیب کے وزیر تھے اور مذہب کے اختلاف کی وجہ سے مستقل ایک دوسرے سے دلچسپ ٹوک جھونک رہتی تھی۔ یہ اثنا عشری شیعوں کا گھرانہ تھا۔ لیکن یہ بھی عقلیت پرست عالم لوگ تھے اور جاہل قسم کے مولوی نہ تھے لہذا ان کے یہاں تعصب یا جگہ نگری کا دور دورہ گزر نہ تھا۔ اسی لیے جب صوبے کے ایک مشہور اور راسخ العقیدہ سنی خاندان کے لڑکے کا پیغام خان بہادر سید نذر الباقری بڑی لڑکی نذر ہرا بیگم کے واسطے آیا تو اسے منظور کر لیا گیا۔

نذر ہرا بیگم اور ان کی چھوٹی بہن ثروت آرا بیگم کو ان کے باپ نے پردے ہی میں گورنرسوں سے تعلیم دلوائی تھی۔ خان بہادر نذر الباقری بہن، والدہ افضل علی، ایک معاشرتی ناول 'گورڈ کالال' تصنیف کر چکی تھیں۔ نذر ہرا بیگم کے چھوٹے زاد بھائی اور بہنوئی میر افضل علی 7



ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی کتاب 'تخیلات' اب گم نام اور نایاب ہے۔  
اسیر کابل کے انتقال کے بعد فارن آفس سے یلدرم کی خدمات یو پی سول سروس میں  
منسل کر دی گئیں۔ 1920 میں ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا۔ اس وقت یونیورسٹی کے پہلے  
رجسٹرار کی حیثیت سے ان کی خدمات سول سروس سے مستعار لے لی گئیں۔ 1928 عیسوی میں  
ان کو حکومت نے پھر واپس بلا لیا اور جرائڈ مان اور گوبار کے ریونیو کسٹمر کی حیثیت سے پورٹ  
بلیئر بھیج دیا گیا۔ ہندوستان واپس آ کر یلدرم غازی پور اور اٹا دے کے ضلعوں میں تعینات رہے۔  
1935 عیسوی میں خرابی صحت کی بنا پر وقت سے پہلے ریٹائر ہو گئے۔

بقول ان کے ذریعہ دون سارے پنشن یافتہ بوڑھوں کا روحانی وطن تھا۔ یلدرم ریٹائر  
ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لیے ذریعہ دون چلے گئے۔ یہیں انھوں نے اپنا کیریئر شروع کیا تھا اور  
اکثر یہاں آ کر رہا کرتے تھے۔ یہیں پر انھوں نے ایک خوبصورت کوشی بنوا رکھی تھی جس کا نام  
'آشیانہ' تھا۔

ذریعہ دون میں ان کے بہت سے دوست پہلے سے ریٹائر ہو کر مستطاد رہ رہے تھے۔  
صاحبزادہ سعید الظفر خان جو کنگ جارجز میڈیکل کالج لکھنؤ کے پرنسپل تھے (ڈاکٹر رشید جہاں  
ان کی بہو تھیں)۔ مولوی عنایت اللہ سابق ناظم دارالترجمہ حیدر آباد دکن اور ان کے بھائی انجینئر  
رضا اللہ (یہ دونوں شمس العلماء مولوی ذکا اللہ دہلوی کے بیٹے تھے)۔ آج ان سب کا انتقال ہو چکا  
ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مسلمان اور ہندو دوست تھے۔ پھر بوڑھے جلا وطن افغان  
شہزادوں کا پورا قافلہ تھا۔ یہ بوڑھے شہزادے بڑے جذباتی تھے۔ یہ یلدرم کے پاس آ کر گھنٹوں  
بیٹھے رہتے اور گزرے زمانوں کو یاد کر کے روتے۔ ان کی بہت قلیل پنشن انگریز سرکار نے مقرر کر  
رکھی تھی اور ان کے پاس صرف ان کا ماضی تھا۔ یلدرم ان سے بڑی محبت سے ملنے اور ان کے دکھ  
سکھ میں کام آتے۔

1935 عیسوی میں یلدرم حج بیت اللہ کے لیے گئے اور خوش خوش وہاں سے واپس  
آئے۔ ملازمت کے زمانے میں یہ اکثر چھ چھ مہینے کی رخصت لے کر انگلستان، یورپ اور ترکی

وقت گزار آتے تھے۔ اب ان کو فرصت تھی اور ان کا ارادہ تھا کہ مستقل سیاحت میں مشغول رہیں گے۔ 1938 عیسوی میں شدید بیمار پڑے۔ ان کی آنکھ میں اوپر پیشانی پر کارہنکل نکلا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی نے، جو صوبے کے مشہور ڈاکٹر تھے، ان کا آپریشن کیا جو کامیاب رہا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی انہیں کسی نے کراچے نہیں سنا۔ آپریشن کے بعد یہ پھر بشارت سے اٹھ بیٹھے اور لکھنؤ واپس آ کر اپنے مشغلوں میں مصروف ہو گئے۔ یلدرم خالی کبھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد برابر کسی نہ کسی مصروفیت میں لگے رہے۔ ملازمت کے زمانے میں بھی بہت سی غیر سرکاری ذمہ داریاں ان کے اوپر تھیں۔ وہ ملی گز ھ اولڈ یونٹریو ایوشن کے بہت سرگرم سکریٹری اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے۔ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد کے ممبر اور صدر رہے۔ یونیورسٹیوں کے محقق تھے۔ ان کی صحت کمزور ہوتی جا رہی تھی مگر یہ ہر نئی مصروفیت خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے اور کبھی انکار نہ کر سکتے۔

یلدرم کا حلقہ احباب حیرت انگیز طور پر وسیع تھا اور سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ مولانا شوکت علی، انڈین پولیٹیکل سروس کے انعام الحقی دہلوی مرحوم، بچنے کے لو اب زادہ مرتضیٰ علی خان مرحوم، مراد آباد کے سر محمد یعقوب مرحوم، عبدالرحمن صدیقی مرحوم، لکھنؤ کے سر سید وزیر حسن اور مشتاق احمد زاہدی دہلوی ان کے بے حد چہیتے دوست تھے۔ ویسے ان کے احباب کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ مجھے معلوم نہیں اور کتنے لوگوں سے ان کی دوستی تھی۔ بہت سے لوگوں کو جنہیں میں نے بالکل انجینی سمجھا، یلدرم کا نام آتے ہی واقعاً آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ ادیبوں کے حلقے میں بھی ان کے دوست تھے۔ ان سے کسی دشمنی یا رنجش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فشی پریم چند، زمانہ کانپور کے ایڈیٹر دیانرائن غم، قاضی عبدالغفار، سر تیج بہادر سپرد مرحوم، میر غلام بیگم، سر شیخ عبدالقادر، علامہ تاج محمد نجیب آبادی، سر سید رضا علی، مولانا ابوالکلام آزاد ان کے عزیز دوستوں میں تھے۔ نئی نسل میں یلدرم کو خواجہ غلام السیدین اور رشید احمد صدیقی پر بہت ناز تھا۔

یلدرم ہندوستان کی تاریخ کے اس دور میں پیدا ہوئے تھے جبکہ ملک نے بہت بڑے بڑے آدمیوں کو جنم دیا تھا اور اپنے یہاں کے اس موجودہ ہولناک قحط الرجال کو دیکھ کر تعجب ہوتا

ہے کہ برصغیر کی یہی مسلمان قوم تھی جس نے قومی جدوجہد کے ان سہ سالوں: بدرالدین طیب جی، رحمت اللہ سیانی، حسن امام، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، علی برادران، مولانا حسرت موبانی، ڈاکٹر ذاکر حسین، آصف علی اور مولانا آزاد کو پیدا کیا تھا اور جس نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن، سید امیر علی، سید محمود، بچے کے خدا بخش، ہر شاہ محمد سلیمان اور علامہ عبداللہ یوسف علی جیسے عالموں کو پروان چڑھایا تھا۔

یلدرم کو اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے بے اندازہ محبت تھی۔ ان کے بڑے بھائی سید اعجاز حیدر کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ چھٹے بھائی سید نصیر الدین حیدر بھی پرانے علمبردار تھے۔ یہ بھی پی سی ایس میں تھے اور بعد میں راجپوتانہ کی ریاست ٹونک میں وزیر تھے۔ خان بہادر ڈاکٹر سید وحید الدین حیدر یلدرم کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ یوپی میں مول سرجن تھے اور لارڈ ولنگٹن اور لارڈ لٹکلہ کے اعزازی فریشین تھے۔ یلدرم کی وفات کے تین سال کے اندر اندر ان دونوں نے بھی انتقال کیا۔ ان تینوں بھائیوں میں آپس میں اتنی محبت تھی جو آج کل ذرا کم دیکھنے میں آتی ہے۔

یلدرم کو اپنے سارے خاندان سے، جو ماشاء اللہ بہت بڑا بھرا پرا خاندان ہے، بہت انسیت تھی۔ یہ گھنٹوں بڑی بوڑھیوں، عزیزوں حتیٰ کہ دور کے رشتہ داروں کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے اور ان کے دکھ سکھ میں شریک رہتے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو انھوں نے اپنے ہاں کی کلچر سے ورثے میں پائی تھی۔ یہ ہمارے دیس کے مشرک خاندان کے قدیم انشٹی ٹوشن اور اس تربیت کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے خاندان کو ایک مقدس Entity سمجھا جاتا تھا۔

یلدرم کی روشن خیالی اور جدیدیت کا اثر یہ ہوا کہ ان کے خاندان کی، جو ایک قصبائی خاندان ہے، بے شمار لڑکیوں نے اس زمانے میں یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں جبکہ ابھی مسلمانوں میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم اتنی عام نہ ہوئی تھی جتنی اب ہے۔ یلدرم کی بھتیجیوں اور بھانجیوں نے آج سے پچیس تیس سال قبل کا نوٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ یلدرم کی بیگم صاحبہ ہندوستان کی ان گنتی کی ہندو اور مسلمان خواتین میں سے ہیں جنھوں نے آج سے تیس سال

قبل پردے کی رسم کو ترک کیا۔ کرامت حسین گروہائی اسکول، لکھنؤ اور مسلم گزٹ کالج، علی گڑھ کے قیام اور ترقی کے سلسلے میں دوڑ بھاگ کی۔ کھادی کی قوی تحریک کے زمانے میں خواتین کے محاذ پر جدوجہد میں مصروف رہیں۔

یادرم بہت کچے مسلمان تھے مگر مذہبی تعصب اور تنگ نظری کو بہت بڑا اخلاقی جرم تصور کرتے تھے۔ مختلف مذاہب کے فلسفوں پر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ نماز کے پابند نہ تھے۔ لیکن کبھی کبھی عشاء کی نماز پڑھ لیتے تھے اور بچوں کی طرح خوش ہو کر کہتے تھے: ”آج ہم نے نماز پڑھی۔“

ترکوں کے لہجے میں ترکی اور ایرانیوں کے لہجے میں فارسی بولتے تھے۔ عربی بھی روانی اور گفتگو سے بولتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مغربی طرز کی زندگی گزاری لیکن جدید ’کلب لائف‘ اور حد سے زیادہ مغربیت زدہ خواتین ان کو سخت ناپسند تھیں۔ ان کے دو بھائیوں کو ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر دسترس حاصل تھی لیکن خود ان کو موسیقی کا بہت زیادہ شوق نہ تھا۔ گوبچوں کی موسیقی کی تربیت کے خیال سے انھوں نے رام پور دربار کے استاد یوسف خان کو کئی سال گھر پر رکھا۔

یادرم کا طریقہ فکر حیرت انگیز طور پر سائنٹفک تھا۔ (یہ چیز بد قسمتی سے ہمارے ہاں بہت ہی نایاب ہے مگر نہ ہماری سیاست، ہماری مذہبی اور معاشرتی زندگی، ہمارے بیشتر ادبی اور ’جہاں لائی‘ نظریات میں وہ شدید بنیادی تضاد، وہ کنفیوژن، یہ خود غلط قسم کا اعتماد اور ذہنی پراگندگی نہ ہوتی جو ہمیں اس وقت اپنے ملک کے ہر شعبے میں نظر آ رہی ہے اور جس کے فقدان کی وجہ سے گرتے گرتے اب تو ہم بالکل پامال میں جا پھنسے ہیں) ہندو مسلم سوال اور اردو ہندی، ہندوستانی کے مسئلے پر آج سے اٹھارہ سال قبل یادرم نے 1936 عیسوی میں ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد کے سالانہ اجلاس کے لیے جو مقالہ لکھا تھا اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا تھا وہ وقت عنقریب آ جائے گا اور جلد آنا چاہیے جب مذہب سے قطع نظر، جغرافیائی اور ریجنل بنیادوں پر ان مسائل کو حل کیا جائے گا۔ رسم الخط کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ملک کے شمال مغربی حصے میں عربی رسم الخط اور باقی سارے ہندوستان میں لامحالہ دیوناگری اسکرپٹ کا استعمال ہوگا۔ اس سلسلے

میں جذباتیت سے کام لیتا غلطی ہے۔ انتہا اور بے کی خرابی بصر کے بعد ہم آج بھی پاکستان میں یہ طے نہیں کر پائے ہیں اور ہندوستان کی کیونسٹ پارٹی اب ریجنل بنیادوں پر زبانوں کی تقسیم و ترویج کے نظریے کا پرچار کر رہی ہے۔

آخر میں یلدرم کے متعلق رشید احمد صدیقی کے ایک مضمون کا اقتباس درج کر رہی ہوں حالانکہ مضمون ایسے بھی بہت طویل ہو گیا ہے۔

”اپنے رفقا اور طلباء سے مجھے اکثر اس مسئلہ پر بحثیں ’کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنون شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں؟ مرحوم امیر گوشت دی اور سید سجاد حیدر میرے پیش نظر ہیں۔ ان کی دل افروز شاعری اور انشا پر دہازی تمام تر ان کی دلی آویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں جو انسان سے اونچا اور اس سے علیحدہ ہو۔ یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداخت تھے اور علی گڑھ کے اس زمانے کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی۔ نہ اب جب زندگی سوائے خوش باشی سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب:

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گزری تھی بہت  
جب بنے اب تک زمانے کے رویے اور روانی میں بہت کچھ  
فرق آگیا ہے۔ کیسا کچھ فرق۔ جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں  
تھے اب ان پر رونے والا کوئی نہیں۔ لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جدا گانہ تھی۔  
ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی۔ یہ ان کی میرت کا،  
شخصیت کا بہت اہم اور مہتم بال نشان پہلو ہے۔ انھوں نے روزگار کی بہت  
سی کروٹیں دیکھیں اور سکھیں، ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زبردست  
کر سکتی تھی۔ لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد و امید آفرینی تھی کہ ان کو بدلنے  
کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

مسلم یونورٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے۔ انھوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، نواب سرچل اللہ خان، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا طریقہ جدا تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے ساتھ کیا۔ سازش کسی سے نہ کی۔ میرے نزدیک سبھی ایک بات یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر یونورٹی میں بھی رہے اور کالے پانی میں بھی۔ لیکن روزگاری کی یہ ستم خیزی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں، جس کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ مگری آتی ہے نہ روشنی۔ اور یونورٹی آئے تو ایسے منصب پر جسے دنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہو سکتا ہے الا شعر و ادب سے۔

اس یونورٹی میں شعر و ادب کے دہانے میں نے دو ہی پائے۔ دونوں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی اور سجاد حیدر یلدرم، ترکی، ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا۔ میں ترکی سے واقف نہیں ہوں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے ایک بارسید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاننا ہے یا اس میں آپ کی شائپہ خوبی تحریر کا بھی کچھ دخل ہے؟ ایک دفعہ جھوم ہی تو گئے۔ آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی اور چہرہ جگمگا اٹھا۔ کہنے لگے: جناب... ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے؟ ہماری آپ کی نہیں ہے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا "میں تو میں کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے۔ آپ کی تو کہیں نہیں۔" مسکرائے اور بولے "ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور انھیں کی ہو سکتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے۔ اس میں ترک نازی ہے۔ سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی

تھی چنانچہ اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے۔ تاقی کمال کا مشہور ڈرامہ 'جلال الدین خوارزم شاہ' میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کیا تھا۔ سید صاحب قلم کا فذلے کر خود ترجمہ نہیں لکھتے تھے بلکہ کسی کو ماسور کر دیا جاتا تھا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے، وہ لکھتا جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھ کے بنا رہے ہیں۔

ترکی انشا پردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رائج نہیں کیا تھا کہ اردو کے مضامین لکھنے میں بھی ان کا قلم ترکی تال دم قبول کر لیتا تھا۔ بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل کی اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے۔ اردو ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خان مرحوم کی نئی شاعری حکے بڑے مداح تھے۔ اسی زمانے میں ایک فارسی مجلہ 'ایران شیرازی' برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔ اس سلسلے میں ایک لطیف مجھے کبھی نہ بھولے گا... سجاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آ رہے تھے۔ سر بمبر بہت سارے لٹائے، کافذات کے کچھ منتشر اجزاء، ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبائے ایک رسالہ پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے آ رہا تھا۔ اس کی خبر سجاد صاحب کو نہ تھی۔ سید صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی، ہموار، کمی قدر تیز چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے تھے۔ نگاہ نیچی، تقریباً عمودی، دس بارہ قدم ہل کر اک ذرا کی ذرا رک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچھٹی سی نظر ڈال کر پھر سرگرم رفتار ہو جاتے۔ اس پر ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا کہ سجاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو۔ وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا ہے، سرائی کر ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر ہل دیتا ہے۔ اس فقرے سے بہت مظلوظ ہوئے۔ کہنے لگے "سانپوں میں وہ کر صرف

سانچوں کی چال آئے گی۔ اس کی تعریف نہ کرو گے! اسی انداز سے چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ایک لٹافہ سرک کر زمین پر آ رہا۔ سجاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ میں نے اٹھالیا۔ کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ دوسرا لٹافہ گرا۔ وہ بھی میں نے اٹھالیا۔ باب اعلم کے قریب پہنچے کہ تیسرے لٹافے نے مفارقت کی، وہ بھی میں نے قبضے میں کیا۔ سجاد صاحب برابر رسالے کے مطالعے میں منہمک رہے۔ سید صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہنچا۔ آفس پہنچ کر موصوف نے بچے ہوئے لٹافے متعلق لوگوں کے حوالے کیے۔ معلوم ہوا تین لٹافے گم ہیں۔ چونک پڑے اور تھوڑی دیر محنت شکر رہے۔ میں نے تینوں لٹافے کچھ دقت سے واپس کیے۔ سید صاحب فرمانے لگے کہ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ فوراً کیوں نہ دیے۔ اس وقت مجھ پر کیا گزر گئی۔ میں نے کہا، آپ مطالعے میں منہمک تھے، میں نے غفلت ہو نامناسب نہ سمجھا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا: خوب یاد دلایا۔ ملا دھک فرمائیے۔ 'ایران شہر ہے۔' ٹائپ میں کتنا سہرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جاندار مضامین و نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے اسے برلن سے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پائے۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ 'بت سگی' سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت سدور ہے گی۔ میں نے کہا، 'سید صاحب بت سگی کا تو ہمارے شعر و ادب میں ایک درجہ بھی ہے، بت اپنی میں کیا رکھا ہے۔' بقول مضمون:

حرف پڑھتا پڑا ہے ٹائپ کا

کسی قدر تجیز ہو کر فرمایا: 'میں تو سہم ہے۔ آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اپنی بھلی باتوں میں ٹکس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ خواہ مٹی پلید کر دی۔' میں نے عرض کیا 'سید صاحب! اکبر نے کہیں ٹکس نہیں ملائی صرف ٹکس میں چنگاری لگائی ہے۔' ہنسے، پھر فرمایا 'اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں۔'



سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم ہرشت انسان تھے۔ ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ سید صاحب کو میں نے شاید کبھی 'تم' کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو کبھی ذاتی رفعت اور منفعت کا وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہنہ میں آپے سے باہر پایا۔ ندان کے منہ سے ایسے الفاظ سنے جو مذاق سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے گڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ تمام آداب ان میں رسچے ہوئے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہے یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلف کے۔ یلدرم میں وہی تکلف بالکل نہ تھا۔ ان کی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقے کا اقتضا ہوتا تھا۔ اور بے تکلف بھی اسی حد تک ہوتے تھے، حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جزو اعظم کبھی جاتی ہے۔

شعر و ادب کا ان کو ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے۔ وہ اچھی اور بے تکلف انگریزی لکھتے تھے۔ یہ بات ان کے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے۔ سید سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے جن کا کمال نہ ہوتا کم سواد ہونے کی دلیل ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جن کی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ تک یکہ رنگی اور توازن ہو۔۔۔۔۔"

اس اقتباس کے بعد میں مضمون ختم کرتی ہوں۔ یلدرم نے 11 اپریل 1943 عیسوی کو رات کے دو بجے دفعتاً حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔ اس وقت وہ بالکل تندرست تھے اور کچھ عرصہ قبل ہی افغانستان میں چند ماہ گزار کر آئے تھے۔

اور اس وقت ان کی یہ تہنا بھی پوری ہو گئی کہ ان کی اُنت سے کی بیماری یا طویل علالت سے دوسروں کو پریشانی یا تکلیف نہ ہو۔ یلدرم لکھنؤ کے عیش باغ کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے نسیم  
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے!

(’نقوش‘، شخصیات نمبر اول، جنوری 1955)

حواشی:

1. کس قدر خوفناک زمانہ رہا ہوگا۔
  2. کالج سے نکلنے کے بعد انھوں نے ساری عمر پر غلوں اور ان تھک سیاسی جدوجہد میں گزاری۔ پاکستان بننے کے بعد گنتی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ حال ہی میں کراچی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل انھیں مشرقی بنگال کا گورنر بنادیا گیا تھا۔ انھی عبدالرحمن صدیقی کے والد نے ان کی طالب علمی کے زمانے میں بمبئی کے ایک یتیم لڑکے کی پرورش اپنے ذمے لی۔ پھر یہ لڑکا وحیفہ لے کر ولایت گیا۔ وہاں آئی سی ایس میں لے لیا گیا۔ ہندستان واپس آ کر ملازمت کی۔ پھر آئی سی ایس سے استعفیٰ دے کر بقیہ عمر فلسفۂ اسلام پر کتابیں لکھنے میں گزار دی اور قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ کیا۔ قرآن شریف کے اس ترجمہ نے بھی حال ہی میں گنتی اور گوشہ نشینی کے عالم میں انگلستان میں انتقال کیا اور اپنی وصیت میں اپنا سارا روپیہ لندن یونیورسٹی کے بھارتی طالب علموں کے لیے وقف کر گیا۔ اس یتیم لڑکے کا نام عبداللہ یوسف علی تھا۔
  3. شبلی اسی زمانے میں ترکی گئے تھے۔ وہاں سے لوٹ کر انھوں نے ایک نظم لکھی جس میں کچھ یہ تھا کہ میں نے ملک کے ماحول کو وہی پایا جیسا پہلے تھا۔ اس پر کلاس کے کسی شریرو کے نے اسی بحر میں یہ شعر لکھ کر نوٹس بورڈ پر لگا دیا:
- شبلی خمزہ با صورتی عذاف کہ بہت  
رنگ اوتیرہ و تار یک ہمین است کہ بو
- شبلی نے کلاس میں آ کر یہ شعر دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ جس ذہین لڑکے نے یہ شعر کہا ہے

اپنا نام بتادے۔ بھلا کسی کی شامت آئی تھی جو بتاتا۔

بعد میں سیاسی نظریات میں اختلاف کی بنا پر سر سید سے ان کا بگاڑ ہو گیا اور یہ علی گڑھ سے چلے آئے اور ندوۃ العلماء، نکلستو اور دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

4. سید سجاد حیدر نے یہ ترکی زبان کا تحفہ اختیار کیا تھا۔ ترکی میں 'یلدرم' کے معنی برق کے ہیں۔

5. غالباً یہ کانگریس پر پریذیڈنٹ بدرالدین طیب جی کے گھرانے کی کوئی خاتون تھیں۔

6. 1974 عیسوی تک یہ بھی بڑے غریبے ڈبے والے لوگ تھے۔

7. یہ پنجاب میں اسسٹنٹ اکم ٹیکس کشنر تھے۔ 1973 عیسوی میں لاہور میں چالیس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

8. یہ سجاد ظہیر کے والد تھے۔

9. نکلستو کا مشہور مسلم اسکول 'جواب بہت بڑا کالج' ہے۔



## داستان طراز

(چودھری محمد علی رودولوی)

نہیں معلوم آپ اس مضمون کو کیا سمجھ کر پڑھیے گا۔ یہ شخصیت نگاری بھی نہیں کیونکہ چودھری محمد علی رودولوی کے متعلق میں اس طرح سے کچھ نہیں لکھ سکتی جس طرح سے میں اپنی نسل کے کسی فرد کے بارے میں لکھ سکتی ہوں۔ یہ چودھری محمد علی کی کتاب کی تنقید بھی نہیں۔ کیونکہ یہ چھوٹا نسخہ بڑی بات ہوگی۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے میں 'خیالستان' یا 'جلال الدین خوارزم شاہ' کے لیے قلم اٹھا کر بیٹھ جاؤں۔

ابھی چند روز ہوئے رودولی سے چودھری محمد علی کی ملاقات کی اطلاع آئی ہے۔ اب ان کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ خدا ان کو زندہ رکھے۔ میں اس وقت مشکوٰۃ محمد علی نقیہ، ادھر ادھر سے دیکھ رہی تھی۔ جب یہ کتاب ابھی دو تین سال ادھر صدیق بک ڈپلکسٹو سے شائع ہوئی تھی تب بھی مجھے خیال آیا تھا کہ اس کے مصنف کے بارے میں آپ کو کچھ بتلاؤں کیونکہ اس مصنف کی میری نظروں میں اس لیے ہی بے اندازہ اہمیت نہیں ہے کہ ان کا مجھ سے بہت بزرگی کا رشتہ ہے

بلکہ یہ اہمیت اس لیے بھی ہے کہ میں سمجھتی ہوں کہ بحیثیت اسٹالسٹ چودھری محمد علی اردو کے ایسے منفرد ادیب ہیں کہ کوشش کر کے بھی ان کی زبان اور اظہار بیان کا تتبع نہیں کیا جاسکتا۔ محمد علی ادب میں اپنے ساتھ یہ اسٹائل لائے اور یہ محض انہی کا حصہ ہے۔

میں نے ایک زمانے سے انہیں نہیں دیکھا۔ اور جب دیکھا تھا تب میرا کچھ سوچنا نہ سوچا کوئی معنی نہ رکھتا تھا اور اب تو خاندان کے لوگوں سے محض ان کے قصے، حکایتیں اور دلائل و تذکرے ہی سننے کو ملتے ہیں کیونکہ اب وہ ہماری ساری روایتوں، سارے ادبی اور تہذیبی ورثے کے ساتھ سرحد کے اس طرف ہیں اور ہم لوگ یہاں ہیں۔

ان کی نئی کتاب ادبی حیثیت سے ہمارے لیے کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ نہیں معلوم ہم میں سے کتنے لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ اس کتاب کا لکھنے والا اور اس کا پس منظر ہماری ہندو پاکستان کی تہذیب کے تانے بانے میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔

اردو ادب کی وہ بیک گراؤنڈ جس میں اودھ اور صوبہ جات متحدہ کی ہمہ گیر ثقافتی زندگی کی ساری گہما گہمی موجود تھی، اس کی جھلک ہمیں سرشار، رسوا اور اودھ شیخ کے فائیکوں میں نظر آتی رہی ہے۔ ان لوگوں کے ماضی میں ظلم ہوش ربا کی وہ داستانیں بھی تھیں جنہیں آغا میر کی ڈیوڑھی والے اچھی داستان گو محفلوں میں سنایا کرتے تھے۔ دوسری طرف علی گڑھ میں مسلمانوں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ مولانا حالی سنا جات لکھتے تھے اور اکبر الہ آبادی زمانے کے انقلاب پر تلنے سے پہلے میں مصروف تھے۔ سماجی پس منظر اس قدر جنگل تھا۔ ہمارے بزرگ جو بیک وقت معاشرتی مصلح بھی تھے، مجدد بھی اور سیاستدان بھی، برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نئی راہیں تیار کر رہے تھے۔ بڑا عجیب وقت رہا ہوگا، جب سرسید کے سامنے کی نئی پود (کیونکہ بہر حال ہندو اور آپسین وغیرہ کا قصہ تو اب Myth میں داخل ہو چکا) اجتماعی طور سے ایک نئے تجرباتی دور سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف اس تہذیب سے بھی شدید جذباتی لگاؤ تھا جس نے اس احساس کو جنم دیا جس کے زیر اثر اب یہ لوگ قوم کے لیے تہذیبیں پا چکے تھے۔ دوسری طرف انہی تہذیبوں کی وجہ سے اسی تہذیب اور ان اقدار کے تباہ ہو جانے کا خدشہ بھی تھا۔ مستقبل بہت پریشان کن تھا۔

عیسائیت کا غلبہ، یورپ کا عروج، انگریز کی سلطنت کا اقبال، ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں قدم قدم پر یہ کش مکش اور یہ تضاد نظر آتے تھے۔ شرور مسلمانوں کے منہرے ماضی کی نکاشی کر رہے تھے جس میں ہر غازی ہیرو آخر میں عیسائی ہیروئن کو مشرف بہ اسلام کرتا تھا۔ گواصل واقعہ یہ تھا کہ حال ہی میں لشکر نصاریٰ ایک غازی بادشاہ کو رنگوں اور دوسرے کو نیا برج میں قید کر چکا تھا۔ لہذا قوم کے پاس سوا خون کے آنسو رونے اور زلزلے کے اب اور کون مشغلہ رہ گیا تھا۔ ہندو مسلمان کی آمیزش بھی ہمارے بزرگوں کو پریشان کرنے لگی تھی۔ لیکن یہ سیاسی پلیٹ فارم کے جھگڑے تھے۔ روزمرہ کی زندگی میں تو ہندو مسلمان دونوں کو انگریز ڈپٹی کمشنر کے سامنے جوتے اتار کر جاتا ہوتا تھا۔

اس پس منظر کو دیکھیے اور پھر ان سوچے والے دماغوں اور ان حساس دلوں کا خیال کیجیے جنہوں نے ہمارے نشاۃ ثانیہ کے چراغ جلائے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ہمارے سماجی حالات کے اکثر تجربے صحیح نہیں کیے تھے۔ نہ وہ مسلمانوں کی زندگی کے بنیادی تضادوں کے متعلق ساختہ طریقت سے سوچ پائے تھے۔ ہندوستان کی نئی جاگرتی کے ہر اول دستے کے لوگ بنگال میں مغرب کے فلسفہ انقلاب سے انیسویں صدی کے پہلے نصف ہی میں روشناس ہو چکے تھے۔ مائیکل مدھوسودن اور ان کے ساتھی انگلستان کے رومانی باغیوں سے متاثر ہو کر اس وقت انگریزی میں نظمیں، ڈرامے اور ناول لکھ رہے تھے جس وقت ابھی لکھنؤ میں طبع کی روشنی میں غالب رانی کیلکی کی داستان ہی پڑھی جا رہی تھی۔ پھر قیصر باغ کی بارہوری کی اندر سہائیں اُڑ گئیں اور سرسید نے سفر نامہ انگلستان میں لکھا کہ آج بالآخر وہ مبارک دن آیا جب میں قصر بختیہم میں حاضر ہوا...

واقعی یہ خون کے آنسو رونے اور زلزلے کا زمانہ تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود کیا ہمیں اپنے لوگوں، اپنی اس تاریخ سے پیار، ایک طرح کا لگاؤ نہیں محسوس ہوتا؟

اب قلم اوپری متوسط طبقے کے ہاتھ میں آ رہا تھا۔ ایک وقت تھا کہ تصنیف و تالیف ایک رئیسانہ مشغلہ تھا۔ نوابان اودھ، نواب راجپور اور دوسرے والیان ریاست نے دفعتاً قلم ہندوستانی

فن موسیقی پر کتابیں لکھیں یا ناک تھنیف کیے۔ اب اودھ بیچ اور دوسرے اخبار شائع ہو رہے تھے۔ سرشار جیسے جرنلسٹ پیدا ہو چکے تھے۔ مطبع لول کشور لکھنؤ سے ان گنت کتابیں چھپ کر باہر آ رہی تھیں۔ سرقریب تھی اور آغا میر کی ڈیوڑھی کے داستان گواپتی شمعیں بجھایا ہی چاہتے تھے۔

ادھر علی گڑھ اور دہلی کے مسلمین اپنے کام میں مصروف تھے۔ پھر جب نذیر احمد اور ان کے ساتھیوں کی اجتہاد اور اصلاح کی لہر اپنا رول ادا کر چکی تو نئی نسل نے آگے کی دنیا کس دیکھنا چاہی۔ 'خدا اور نرسین نوش' کے رومانی پیکر تراشے گئے۔ 'خواب ہستی' دیکھا گیا۔ 'رعنائی خیال' خالص رومان اور تجالیات کا چرچا ہوا۔

یہ زمانہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، شدید جذباتی کشش کا وقت رہا ہوگا۔ اس زمانے کا ایک کلچر تھا جس نے لکھنؤ، دہلی اور دہلی کے علاقے کی ایک طرح کی قلعہ بندی ہی کر رکھی تھی۔ بیرونزم کی چند اقدار تھیں جنہوں نے اس خطے کے کلچر کو جنم دیا تھا۔ اور جسے بیرونی مداخلت اور باہمی مذہبی آویزش نے مل جل کر بخوبی ختم کر دیا اور جس کا فائٹل اور خوف ناک نتیجہ ہم نے 1947 عیسوی میں دیکھا لیا۔

پھر ہمارا عوامی کلچر تھا۔ جو ہم نے اپنے دیہاتوں اور اپنے قصبہ جات میں دیکھا تھا۔ اور جن کی بنیادیں انسانیت پرستی کی ان روایات پر رکھی گئی تھیں۔ اسی تہذیب اور ان اقدار کے ایک نام لیوا چوہدری محمد علی ہیں جن کے بارے میں میں نے یہ مضمون لکھنا شروع کیا ہے۔

معاف کیجیے گا میں اس طرح کا مضمون لکھ رہی ہوں جس کی غالباً آپ کو مجھ سے توقع نہ ہوگی۔ اور آج کل جبکہ اس قسم کا تذکرہ امن، تہذیب یا انسانیت پرستی کا اگر کیا جائے تو اس پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ ان سب چیزوں پر الگ الگ سیاسی لیبل چھپا دیے گئے ہیں۔ اور ویسے بھی آج کل کلچر اور امن وغیرہ کا کیا کام۔ محض بین الاقوامی اور بین المملکتی جنگوں اور ڈالر اور اسٹرلنگ کا چرچا ہوتا ہے۔

چوہدری محمد علی ضلع بارہ بنگلی (اودھ) کے مشہور قصبے روڑلی کے رہنے والے ہیں۔ 1882 عیسوی میں پیدا ہوئے۔ یہ بھی انیسویں صدی کے آخر والی اس نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کا



میں نے اوپر کہیں ذکر کیا ہے۔ محمد علی اس نسل میں تباہ نہیں تھے۔ میرے والد اس کے ایک فرد تھے۔ اور میرے والد کے سارے دوست اور ساتھی، خشی پریم چند، خشی دیان رائے، گم، سر محمد یعقوب، علی برادران، مشتاق احمد زاهدی، سید رضا علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، سر جے بہادر پیر، سید عبدالقادر سمجھی اس گروہ میں شامل تھے۔ اور وہ کیسا گروہ تھا...!!

محمد علی ابھی ڈھائی سال کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور یہ خود تعلقہ دار ہو گئے۔ تعلقہ کو کورٹ آف وارڈز نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ ماں نے مارے لاڈ پیار کے اسکول نہیں بھیجا۔ کورٹ آف وارڈز کا انگریز منیجر جب ان کو اسکول لے جانے کے لیے آیا تو یہ ڈھیلا مارنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے دوڑے۔ آخر اسے اپنے سپاہی لے کر آنا پڑا اور انھیں باقاعدہ انوار کے اسکول پہنچایا گیا۔ 'کالون تعلق وارڈز کالج لکھنؤ' میں (جو اب فلک کی کج رفتاری کی وجہ سے محض تعلق داروں کے لیے ہی مخصوص نہیں رہا) تاج برطانیہ کے فرزند ابن دل بند کی اولاد کو درس و قیاداری دیا جاتا تھا اور شہسواری وغیرہ قسم کے ریسائے مشاغل سکھائے جاتے تھے۔ قوم پرستی، اصلاحات وغیرہ کا جو تھوڑا بہت چڑچا انیسویں صدی کے آخر دہائے کے میں ملک کی دوسری درس گاہوں میں شروع ہو چکا تھا اس کا بھلا کالون اسکول میں کہاں گزر رہا تھا۔ بہر حال، محمد علی وہاں پڑھتے رہے۔ لیکن ان کی تعلیم کالون اسکول کے نصاب کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو گئی۔ بقول گوگر کی ساری دنیا ان کی یونیورسٹی رہی۔ انگریزی ادب مغربی آرٹ و فلسفہ وغیرہ پر ان کا مطالعہ حیرت انگیز حد تک وسیع ہے۔ ہندو تہذیب و ادب کا دل مار کس دونوں میں یکساں دلچسپی رہی۔ نہایت عمدہ انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں۔ خاندان کے بہت سے نوجوانوں نے انگریزی ادب پر ان سے تبادلہ خیالات کر کے ایم اے میں اچھے ڈیڑھن حاصل کیے۔

محمد علی مسلمانوں کے بہت بڑے آدمی جج کرامت حسین مرحوم (بانی مسلم گزٹ کالج لکھنؤ) کے نہایت عقیدت مند چیلے تھے۔ حالانکہ دونوں کی متضاد طبیعتیں تھیں۔ جج کرامت حسین نہایت خشک مزاج مولوی آدمی اور یہ ہنسے ہنسائے پر جان دینے والے۔ اصولاً اور عقیدۂ ہمیشہ سخت قوم پرست رہے لیکن ماحول اور زندگی کی مجبور یوں کی وجہ سے انگریز کی وفاداری کا بھی پاس کرنا پڑا۔

لکھنؤ کا مشہور 'نواب' بنگر (برطانیہ کے موجودہ چانسلر آف ایکس چیکر کا غائب چچا) جو انگریزوں کا دشمن تھا، وہ بلی ٹوپی پہنتا تھا، حقہ پیتا تھا، بلی کا بڑی دھوم دھام کا گورنر تھا اور اپنے وقت کا واجد علی شاہ ثانی کہلاتا تھا۔ اپنے ان وقار و تعلق داروں کی دوستی کا بہت دم بھرتا۔ اسی کے زمانے کا ایک واقعہ بتاتے ہیں کہ ایک انگریز حاکم نے ان سے کہا کہ محمد علی اگر تم ہم کو اپنے احباب کے متعلق اطلاعات دیتے رہا کرو تو کیا رہے۔ یہ بگڑ گئے اور کہنے لگے میں اپنے ہوش و حواس میں تو ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر میں شراب پیتا ہوتا اور تم مجھے اپنے یہاں کھانے پر بلا کر خوب شراب پلاتے تو ممکن ہے میں تم کو خبریں فراہم کر دیتا۔ اس کے بعد ایک اور فرزند دل بند تاج برطانیہ انگریز حاکم کی یہ فرمائش پوری کرتے رہے جس کے صلے میں ان کو مزید جاگیروں اور ٹائٹلڈ وغیرہ سے نوازا گیا۔

چنانچہ یہ پس منظر محمد علی ردو لوی کی زندگی کا رہا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی تجدید کی تحریک کی قیادت اسی فیوڈل طبقے کے افراد نے کی تھی۔ دارالافتاء اعظم گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی قائم کیے جا چکے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی اور بھکٹ سے یونیورسٹی آف ہندوستانی میوزک لکھنؤ میں بھی تعلق داران اودھ کے روپے سے قائم کیے گئے تھے۔ لیکن اب اس طبقے کا ذی حشریشن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا اور یہ ایک ناگزیر اور تاریخی حقیقت تھی کہ اب یہ طبقہ اپنی طبعی موت مرنے والا تھا۔ متوسط طبقہ اوپر آ رہا تھا۔ کانپور ایشیا کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بن چکا تھا۔ گاؤں اجڑ رہے تھے۔ بلی کا دھ کسان جو کبھی اپنے آقاؤں کے کھیت چھوڑ کر دیہات سے باہر جانے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا اب روزی کی تلاش میں بمبئی، کلکتہ اور پنجاب و پس جاتا تھا اور وہاں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی 'بھیاؤں' کی برادری میں مدغم ہو کر مزدوری میں لگ جاتا تھا۔ اس بڑھتے ہوئے اقتصادی بحران اور طبقاتی کشمکش کو برطانوی حکومت نے بہت ہی آسانی سے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا۔ سیاسی جماعتوں کا قیام عمل میں آیا جن میں سے چند واضح طور پر اس فیوڈل طبقے سے وابستہ ہو گئیں جو اس کشمکش میں حکومت کا معاون اور رفیق تھا اور چند نے ایک حد تک کسانوں اور نئے پروڈرار یہ کا ساتھ دیا۔ لیکن آگے تک یہ ساتھ کسی سے بھی نہ دیا جاسکا۔ اس پورے دور کی عکاسی پریم چند نے کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت وسیع اودان کا انداز

ہے حد تک غیر تھا۔ محمد علی نے اس دور اور اس ماحول کے انتہائی فن کارانہ (مجھے اس لفظ سے چڑ ہو گئی ہے لیکن یہاں اس کا استعمال کیے بغیر چارہ بھی نہیں) Miniatures پیش کیے ہیں اور یہ کہتے خوبصورت Miniatures ہیں...

وادی گنگ و جمن کے معاشرے کی بنیاد جس تضاد پر قائم تھی وہ طبقاتی تھا، مذہبی نہیں۔ روضہ سا اور تعلق داروں کا گروہ ایک طرف تھا اور حویلی کے ملازمین، کسانوں، کہاڑوں اور تنہیلوں کا گروہ دوسری طرف، راجہ پر تھوی پال سنگھ ادھ کے ایک ہندو تعلق دار اور گھاکر گاہی خاں ایک مسلمان تعلق دار (محمد علی کے دو نمائندہ کردار) ایک گروہ کے افراد ہیں۔ اما سن مہری اور بی وھتا اور ان کے سارے دوسرے ساتھی جو دوسرے گروہ میں شامل ہیں، پریم چند کے یہاں بھی ملیں گے۔ اور ان سب نے مل کر ہندوستان کی تاریخ کے اس دور کے Frescoes کو بڑے دلآویز رنگوں کے ساتھ مکمل کر دیا ہے۔

پریم چند اور محمد علی، دونوں کے یہاں پرانے ماحول اور پرانی اقدار سے ہندوستانی لگاؤ اور ذہنی وابستگی موجود ہے۔ لیکن دونوں برابر راجہ پر تھوی پال سنگھ اور گھاکر گاہی خاں کی رعیت کے ساتھ بھی ہیں۔ جہاں تک اس بحرانی دور میں کوئی واضح راستہ سامنے نہیں آ سکا وہاں تک پریم چند کے یہاں بھی شدید confusion ملتا ہے اور کہیں کہیں پر محمد علی کے یہاں بھی۔

محمد علی رودلو کی قدر بحیثیت فن کار ہمیں اس وقت کرنی پڑتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہایت ایمان داری سے انسانیت پرستی کی اقدار کو سنبھالے اور برابر اونچا اٹھائے رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ جس طبقے اور ماحول سے وہ خود وابستہ ہیں وہ اپنی ساری values کھو چکا ہے۔

محمد علی گنتی کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو نئے لکھنے والے بھی اپنا رفیق سمجھتے ہیں اور جنہوں نے غیر شرع طریقے سے ادب کی نئی تحریک کا شروع سے ساتھ دیا ہے۔

اردو افسانے میں جو طرز بیان، برجستگی، شوخی اور بائکن محمد علی اپنے ساتھ لائے، میں نے اوپر کہیں لکھا تھا، کہ وہ اتنا انوکھا اور منفرد ہے کہ کوشش کر کے بھی اس کی طرح کی دو سطر میں نہیں لکھی جاسکتیں۔ انداز بیان اتنا فطری ہے کہ جب دفعتاً یہ احساس ہوتا ہے کہ قصہ گو یہ واقعہ اپنے مخصوص

انداز میں خود اپنی زبان سے نہیں سنا رہا تھا بلکہ یہ لکھی ہوئی تحریر ہے تو عجیب سا لگتا ہے۔

ملاحظہ کیجیے گا:

”بھلا بتائیے تو اس کہانی کا ہیرو کون ہے۔“ اسنے کے بچ مورے بندیا پرانی۔“ ہے انھی لوگوں میں مگر نیکے اوٹ پہاڑ۔ بلی کے ساز و سامان میں بچھونے، لالہ کی لونیا، مرزا صاحب کا لونگا، چانماز، ایک مرد تو، دو چیلیاں۔ مگر لالہ جی اور بڑے مرزا صاحب کے درمیان میں گاڑ بیان کے پیچھے یہ کون چیز رکھی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کہاں ہم کہاں آپ۔ کہاں یہ کہانی، بڑے مرزا صاحب کے ایسے ہزاروں سفر کر گئے۔ ہزاروں سفر کر رہے ہیں۔ اور لاکھوں سفر کریں گے۔ مگر ہر مسافر کی کہانی تھوڑے سی لکھی جاسکتی ہے۔ داستان گواہ و قدردانوں کو جمع کرنے والی دہی ہے جو بلی کے بچوں کے بڑی حفاظت سے رکھی ہے۔ (یہ منٹائی کی ایک نوکری کا تعارف تھا۔)

میر باقر مرحوم کا قصہ سنئے:

”ہیں سے سنا کہ بھر کھرام پڑ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یہ چاروں بھائی جمع ہیں اور نئی طرح کے بین کر رہے ہیں۔ ایک کہہ رہا ہے خدا کی قسم والد مرحوم آٹھ آٹھ دن منہ نہیں دھوتے تھے۔ اس پر سب مل کر بڑی زور سے روتے ہیں۔ پھر دوسرا کہتا: رسول مقبول کی قسم دانت بھی تو نہیں مانگتے تھے۔ اور پھر دہی گھسان پڑتی ہے۔ تیسرا کہتا ہے اور نہاتے کب تھے۔ قسم کلام مجید کی اماں کے ذر کے مارے پونجی غسل خانے میں پانی پھینک کر چلے آتے تھے اور دہی شور مچا ہے۔ چوتھا ہاڑیں مار کر کہتا ہے: دو بجے رات کو مرحوم کا چھینکے سے ہانسی اتار کر کپ کپ دہی بڑے کھانا یاد آتا ہے... اس پر تو پوری محفل مایا ہے آب کی طرح تر پئے گئی ہے۔“

”...ان صاحبزادی سے تعارف میرا کر لیا گیا کہ فلاں شخص کے والد ہیں۔ ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف لوگوں سے اس طرح کر لیا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ فلاں کے داماد ہیں۔ اور اب یہ زمانہ لگا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں، فلاں کے سر ہیں۔ مگر ہم چکنے گھڑے۔ ہماری کچھ

ہی میں نہیں آتا کہ ہم وہ نہیں رہے۔۔۔۔۔“

(’عشق بالواسطہ‘)

’دھوکا‘ میں بی بی ناظر اور ’اندر والے‘ یعنی ان کے دل کا مکالمہ ملاحظہ فرمائیے:

”نیے صاحب۔ میں کہانی لکھتا نہیں ہوں۔ کہانی کہتا ہوں۔

ابھی معلوم ہوتا سنتے جایئے۔“

اندر والا: سنو بی بی ناظم اور صفر جو پردے سے لگے گھڑیوں

باتیں کرتے ہو، اور جو کوئی کچھ کہہ دے۔

ناجم: بھال ہے جو کوئی کچھ کہہ دے۔ کرتے نہیں تو ڈر کس کا بھلا،

مجھ سے آٹھ سال چھوٹا اور پھر وہ تو مجھے چچی کہتا ہے۔

اندر والا: تم ہنسنے زیادہ لگی ہو۔

ناجم: ”بہی آتی ہے جو کوئی کیا کرے۔“

پھر ٹھاکر درگا ہی خاں سے ملیے۔ کہ صوبے کے اس ماحول اور اس زمانے کی ایک نمائندہ

ہستی ہیں۔ ”جس قدر تعلیم حاصل کی تھی، اسے بھی نہایت احتیاط سے چھپاتے تھے۔ بچپن میں کچھ

انگریزی بھی پڑھی تھی مگر کیا بھال جو کوئی اس کا پتہ پا جائے۔ زبان انھوں نے مارے وضع داری

کے ہمیشہ اودھی مگر مطالب کس، جرحی پنھنم اور حافظ شیرازی کے ہوتے تھے۔ انداز گفتگو میں

جانسن کی جھٹک پائی جاتی تھی۔ ایک دفعہ دھوم دھام سے ہزاروں خرچ کے مچھلی کا بیاہر چایا تھا۔

اکسار و خاکساری کی تصویر۔ اپنے سے زیادہ صاف کپڑے پہنے ہوئے ملازم کے لیے کہتے ہیں۔۔۔

”ای اچھ نہ آئیں، لالہ ہوئیں۔ ریل پر سب کو ڈھیس کا دھکیاوت ہیں۔ ان کا رستہ دیت ہیں۔“

اندر سبھا کی امانت کا تذکرہ سنئے:

”جن لوگوں نے سلطان عالم کا زمانہ دیکھا ہوگا ان کا ذکر نہیں۔ جو لوگ بعد کو آئے۔ وہ

کیوں متاثر ہوتے تھے۔ جو کچھ اچھا رہا ہوگا وہ انھوں نے نہیں دیکھا۔ جو سنا ہوگا وہ دل خوش کن نہ

تھا۔ پھر یہ دل پر چٹ کیوں لگتی تھی۔ اس زمانے میں دل کی بات کہہ کر کون اپنے کو ہنسائے اور

جوان نگر لوگوں میں بوڑھا کہلائے۔ مگر تاب نہیں ہوتی۔ کہے دیتا ہوں۔ کہیں ان کے ٹک کا اثر نہ

رہا ہو۔

داستان گو صاحب آپ واقعی سلویا گئے ہیں۔ نمک کی آپ نے خوب کھئی۔ نمکین ملک میں پیدا ہوتا تھا۔ کوئی ان کے باپ کا تھا۔

اے ہے میرا مطلب آپ نہیں سمجھے۔ خیر ہوگا۔ جانے دیجیے۔ کہانی سنئے:  
'سنگھول' میں سے ایک اور نمونہ ان کے اسلوب کا دیکھ لیجئے۔ ایسے مضمون تو بہت طویل ہوا جاتا ہے۔ لیجیے:۔۔۔

”راستے میں چھوٹا پھول کھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چر گیا۔ بیماری چھوٹی چڑیا۔ یہ ننھی ننھی کبھی پھولوں کے بیج میں مگن ہے۔ اس کو کیا کرو گی کھا کے۔ دودرا کی جھیل مدتوں سے سکون کی نیند سوری تھی۔ نہ لہر، نہ چٹکولا۔ اسے لومینڈک اس میں کود پڑا۔

بوڑھے سفید بالوں والے کا جنازہ باپ دوا کی ہڑداڑ میں رکھا ہے۔ جو زندہ ہیں لٹھیا پر ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔

(سات جاپانی اشعار)

اے ہے ان اشعار سے تو فہم کے بادل چھا گئے۔ میری محفل سے رنجیدہ نہ اٹھیے۔ ایک ہوئی سن لیجیے اور خوش خوش گھر کو جائیے۔ نہیں تو مجھ کو شرمندگی ہوگی۔۔۔“

چودھری محمد علی کے یہاں قصے اور ان کے کردار خیالی یا فرضی نہیں ہیں۔ مولوی ابراہیم، رجبہ پرتھوی پال سنگھ، بی بی تاجو، بھگن تنبلی، امانتہری، میر یوسف، حسو کی بی بی، یہ سب اصلی بیج کے لوگ ہیں۔ داستان طراز نے واقعیت رنگ قائم رکھنے کے لیے ان کے نام بھی نہیں بدلے۔ ان میں سے چند ایک اب بھی نکھنوت اور اس کے اطراف کے قصب جات میں غالباً موجود ہوں بہت سے سرکھپ گئے۔ ان میں سے اکثر کا تذکرہ میں خود بھی گھر کے لوگوں سے سن چکی ہوں۔ لیکن ان کو قصے کے پیرائے میں پیش کرنا محمد علی کا کمال ہے۔ یہ ہماری رچی ہوئی عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کی کزوریاں، ان کی نیکیاں، ان کی مصوویت۔۔۔ اس کی

بہتی ہوئی دنیا میں یہ حکایتیں لگتا ہے جیسے کسی اور سیارے کے قصے ہیں۔ وہ سیارہ جو کہیں کھو گیا ہے۔ یہ حکایتیں جزئیات نگاری کا شاہکار ہیں۔ یہ لوگ جنہیں تلخے والے نے انتہائی ہمدردی، یگانگت اور خلوص کے ساتھ اپنے پڑھنے والوں سے متعارف کیا ہے۔ گویا دیکھیے یہ میرے لوگ ہیں، میری دنیا کے باسی، شاید کوئی دلچسپی کوئی رنگینی، کوئی سنسنی خیز امکانات آپ کو ان میں نہ ملیں۔ لیکن یہ میری، میرے پرکھوں کی زمین کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ میری زمین، جو سارے ہندوستان کی زمین ہے۔ ان کا دکھ کچھ جو ہماری ساری تاریخ کا دکھ کچھ ہے۔

’سنگھول محمد علی شاہ فقیر‘ کی اشاعت سے برسوں پہلے چند اور کہانیوں کے مجموعے اور مختلف موضوعات پر کتابچے اور رسالے انھوں نے تصنیف کیے تھے۔ ان میں سے ایک ’میرا مذہب‘ ہے جو غالباً 1938 عیسوی میں چھپا تھا۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے لکھا تھا: ”راقم الحروف انانیت کا شکار، باوجود استغفار کے بھی انانیت کا شکار ہی رہتا ہے۔‘ میں‘ کے استعمال سے پریشان ہے۔ مگر‘ میں‘ کا چھپنا نہیں چھوڑتا۔۔۔“

اس معذرت کی ضرورت انھیں اس لیے پیش آئی کہ عقلیت پرستی اور جذبات میں ہمیشہ ان کے یہاں جنگ رہی۔ شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے اور خود بھی شیعہ ہیں لیکن شیعوں کے بہت سے عقیدوں اور خصوصاً رسوم و تعزیر داری اور تہرہ وغیرہ کے خلاف برابر شدید احتجاج میں مصروف رہے۔ اسی سلسلہ میں یہ کتاب ’میرا مذہب‘ لکھی۔ ہمیشہ مولویوں کی جان کو آئے رہے۔ لیکن مجتہد العصر جناب قبلہ ناصر حسین مرحوم کے بہت مداح ہیں اور اس ساری عقلیت پرستی کے باوجود عالم یہ ہے کہ حسین کا نام بھی کوئی ان کے سامنے لے لے تو بے اختیار روئے نکلے ہیں۔

آزادی نسواں کے شدید حامی۔ آج سے تیس پینتیس سال پہلے، اپنی لڑکیوں کو اپنے گوروں کرامت حسین مرحوم کے قائم کیے ہوئے اسکول میں انگریزی تعلیم دلوائی۔ چونکہ زندگی بھر مشغلہ لڑکچہ رہا۔ لہذا نظریاتی طور پر عورت بھی آرٹ اور لٹریچر کے زمرے میں آگئی۔ ان کا کہنا ہے کہ ”عورت بد صورت ہو ہی نہیں سکتی۔“

آداب محفل اور فن گفتگو میں ماہر ان کے ایسے لوگ بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ ان کے

متعلق یہ مشہور ہے کہ انھوں نے آج تک اپنا ایک دفعہ کا سنایا ہوا قصہ یا لطیفہ دوبارہ کبھی نہیں دہرایا۔ ہندوستانی کلاسیکل موسیقی پر Authority ہیں۔ اگر گانے والے سے ذرا سی بھی کوئی چوک ہو جائے تو اسے فوراً خاموش کر دیتے ہیں یا وہاں سے اٹھ جاتے ہیں۔

پریکٹیکل آدمی بالکل نہیں۔ آج تک کبھی خود اٹھ کر پانی نہیں پیا۔ نو جوانی کے زمانے میں، جب ان کا علاقہ کورٹ میں قحطاب چند روز کے لیے بینک میں ملازمت کر لی تھی۔ لیکن کچھ دنوں بعد اسی صدمے اور دہشت سے بخار آنے لگا۔ اور بیمار پڑ گئے۔ کہ نوکری کرنا پڑ رہی ہے۔

ان کا چاندی کا حصہ بھی بے حد مشہور ہے جسے ہمیشہ فصل کے نئے پھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ یوپی میں زمین داری کے خاتمے کی وجہ سے اپنا تعلق ضبط ہونے کا ان کو اتنا زیادہ ذاتی رنج تو نہیں ہے لیکن اس کا بہت صدمہ ہے کہ اس قدر اہتمام و نفاس سے وہ قحطاب تیار نہیں ہو سکتا۔ لہذا انھوں نے اسے ترک کر دیا ہے۔

اودھ کی بہت سی باتوں سے بخار ہے، لیکن اسے چھوڑنے کے لیے کسی حالت میں تیار نہیں۔ لکھنؤ، ردولی اور سارے اودھ کے اُجڑنے کی انھیں شدید ڈھنی اور روحانی تکلیف ہے۔ اور اس وقت بھی جبکہ ان کی ساری اولاد اور پوتے، نواسے، پاکستان اور سمندر پار کے ممالک میں سکونت پذیر ہیں۔ یہ گزرے وقتوں کے سائے کی طرح اب بھی اپنے پرکھوں کے وطن ردولی میں رہتے ہیں۔

دو تین ماہ ادھر کی بات ہے، انھوں نے اپنے اسی پرانے شگفتہ انداز میں، اپنی ایک صاحبزادی کو جو یہاں سے ان سے ملنے کے لیے ردولی گئی تھیں۔ ایک واقعہ سنایا، کہ چند روز ہوئے وہ حضرت گنج میں سے گزر رہے تھے، راستے میں چند جاننے والے نو جوان لڑکے مل گئے۔ ان کے ساتھ کچھ دیر ایک قہرہ خانے میں جا کر بیٹھے۔ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ جوانی کی جھلک دیکھی۔ اپنا بڑا چاہا بھولے۔ پھر لڑکے اپنی راہ چلے گئے۔ سامنے سے ایک بوڑھا آنا نظر آیا خیال آیا کہ اب پھر بڑا چاہا دکھائی دیا۔ بڑی کوفت ہوئی کہ اب دو گھڑی رک کر ان سے ملنا پڑے گا۔ صورت آشنا معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ان سے ملیں۔ بادل ناخواستہ ان کی



طرف بڑھے۔ دو قدم قریب پہنچ کر دیکھا تو سامنے قد آدم آئینہ تھا۔  
 مجھے احساس ہے کہ محمد علی رودلوئی پر یہ مضمون سیر حاصل نہیں ہے۔ چودھری محمد علی کی  
 کتاب کو پڑھنے کے لیے یا ان کی عظیم اور دلآویز شخصیت کے تذکرے سے لطف اندوز ہونے کے  
 لیے اس شائقِ درشتے اور اس پس منظر سے محبت لازمی ہے ورنہ ان کی اور سیری کھینچی ہوئی یہ  
 تصویریں آپ کے نزدیک بالکل بے معنی ہوں گی۔

---

(’سویرا‘، لاہور، شمارہ نمبر 15، 16)



## اندھیری رات کا مسافر

(اسرار الحق مجاز)

بہت جگ جیتے، غالباً 1941 عیسوی کی بات ہے۔ ہم لوگ فرسٹ انیر میں پڑھتے تھے۔ ایک روز حیدرہ آپا نے جو ہم سے بہت سینئر اور بلی اسے فائل میں تھیں۔ ہم سے کہا کہ بھی لڑکیوں جب کالج میں بزم ادب ہے تو ایک مشاعرہ بھی کر ڈالنا چاہیے۔ چار قدم پر یونیورسٹی تھی۔ جہاں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اور اسی قسم کی دوسری شاندار باتیں۔ ہمارا کالج ایک تو امریکن اور اس میں پڑھنے والیاں زیادہ تر انگریز اور عیسائی۔ ویسے ہی سب پر انگریزیت سوار تھی۔ ہمارے یہاں ہوا کرتے تھے پٹھوون کے کونفرٹ، اور اوپیرا، اور ہسن کے ڈرامے۔ حیدرہ آپا نے کہا کہ مشاعرہ کرتے ہیں، ایک تو یہی اپنے اسرار بھائی کو بلا لیں گے اور ایک آدھ کسی اور شاعر کو۔ یوں تو شہر اور یونیورسٹی میں شاعروں کی کیا کمی تھی اور سب ازابلہ تصور بن کالج آنے کو تیار۔ کیونکہ بھائی لوگوں نے ایسے ایسے رومانی تصور باندھ رکھے تھے۔ آئی ٹی کالج کے متعلق آزاد نظمیں تک لکھیں جا چکی تھیں اور چند ایک حیدر آبادی لڑکیوں کو تو باضابطہ ہیر و رن کا مرتبہ بخش دیا گیا

تھا۔ اگر جھوٹوں بھی کہہ دیا گیا کہ آئی ٹی کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے تو پھانک پر شعرائے کرام کا کیو لگا ہوگا۔ فوجداری ہو جائے گی۔ لہذا ملے ہوا کہ صرف اسرار بھائی اور علی سردار جعفری کو مدعو کیا جائے۔ اسی زمانے میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کا چہ چاڑ سے زوروں میں شروع ہو چکا تھا۔ لکھنے پڑھنے والوں اور طالب علموں کی دنیا پر ایک عجیب قسم کا جوش اور سرمت کا احساس طاری تھا۔ ادب میں احساسات اور تجربات اور مشکلات کی ایک نئی کائنات دریافت کر لی گئی تھی۔ بہت سے نئے لکھنے والے... نئی پود کے ترجمان اور بڑے چہیتے آئیڈیل بن کر سامنے آ چکے تھے۔ وہ دور دراز کے صوبوں میں رہنے والے بہت قریب آ گئے تھے اور ان سب کی ایک بڑی انوکھی برادری سی تھی، لاہور میں راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر تھے۔ بمبئی میں خواجہ احمد عباس، علی گڑھ والے عصمت آپا پرنازاں تھے۔ ادھر لکھنؤ میں سردار علی جعفری تھے۔ رشیدہ آپا، حیات اللہ انصاری، سبط حسن، علی جواد زیدی ایک پورا گروہ تھا۔ اس مہم اور اس ماحول کی یہ بڑی مکمل تصویر تھی اور پھر اسرار بھائی۔ (اسرار بھائی جو علی گڑھ میں رہتے ہیں، بڑے سخت انتظامی ہیں اور جنھوں نے 'نذر خالده' اور 'اندھیری رات' کا سفر 'اور' آوارہ' لکھا ہے۔ جو بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔ مگر شراب بہت پیتے ہیں بھارے۔)

چنانچہ انھیں اور ان کے دوست علی سردار جعفری کو بلایا گیا اور اسمبلی ہال کی اسٹیج پر بٹھا دیا گیا (جہاں بیٹھے ہوئے دونوں خامسے پور ہوتے نظر آئے۔) ان کی نظمیں سنی گئیں اور بعد میں ایک آدھ اردو داں قسم کی لڑکی نے ان کا آؤ گراف بھی لیا۔ عصمت آپا نے جن لڑکیوں کا ذکر کیا ہے جن کے اسرار بھائی ہیرو تھے، وہ لڑکیاں ہمارے کالج سے تھیں۔ اس قسم کی ہیرو وورشپ علی گڑھ کالج کی چہار دیواری ہی میں ہو سکتی تھی، ہمارے کالج کے ماحول میں اور علی گڑھ گڑ کالج کی فضاؤں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہاں اردو ہی بہت کم لڑکیوں کو آتی تھی۔ اردو شاعری یا شاعروں سے دلچسپی تو بہت دور کی بات ہے۔ پھر بھی جن لڑکیوں نے اس روز اسرار بھائی کی نظمیں سنیں وہ بہت خوش ہوئیں اور لٹریچر کی سینئر لڑکیوں نے آپس میں کہا کہ شاعری کی انیسویں صدی والی، رومانی روایت پر یہ پورے اترتے ہیں اور ان کے ڈکشن میں موسیقی بہت ہے اور

رومانیت اور انقلاب پرستی کا نہایت خوبصورت استخراج وغیرہ وغیرہ۔

ہم فرسٹ اسیر والے سودا کے قصیدوں اور متواتر انیس و دہر میں جھٹکتے۔ اس کے علاوہ کھیل کود اور دوسری خرافات ہی سے فرصت نہیں تھی جو اسرار الحق مجاز ردولوی کی شاعری کا مطالعہ کرتے۔ پھر علاوہ ازیں حمیدہ آقا اور صفیہ آقا کے بڑے بھائی جو اپنے پڑوس میں 'دارالسرانج' رائے بہاری لال روڈ پر رہتے ہیں، اب یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ بھی کیجیے اور پھر ابھی اتنی عقل آئی بھی نہیں تھی کہ ایسی سنجیدہ باتوں کی طرف دھیان دیا جاتا۔ ویسے ذاتی طور پر میرے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ بچپن سے گھر پر آس پاس، اور والد کے دوستوں کے حلقے میں ایسی ایسی زبردست قسم کی ہستیوں کو دیکھتی آئی تھی جن میں سرودجی، مائینڈ واور آصف علی سے لے کر فرنگی محل کے علامہ علمی، ادبی، سیاسی سبھی کی ایک سے ایک جید شخصیتیں شامل تھیں لہذا ان کے متعلق یہ احساس کبھی نہ ہوا کہ خالہ فلاں یا چچا فلاں یا بھائی فلاں کے یہ لوگ اتنے بڑے شاعر، اتنے بڑے سیاستدان یا اتنے بڑے ادیب بھی ہیں۔

چنانچہ اسرار بھائی شاید 1938 عیسوی کی گرمیوں میں، جب ان کا مجموعہ 'آہنگ' پریس سے آیا تو شام کے وقت جھپٹتے ہوئے والد کے پاس آئے۔ میں اس وقت اسکول میں پڑھتی تھی اور اردو سے میری واقفیت محض بچوں کے اخبار 'پھول' تک محدود تھی۔ اور یہ صاحب جو ہاتھ میں آہنگ لیے لیے لے لے بالوں والی ٹوپی پہنے سگریٹ پیٹے ذرا جھکے جھکے چلے آ رہے تھے (بچپن سے مجھے ان کا صرف یہی ایک حلیہ یاد ہے) اس سے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ ایک بہت بڑا شاعر ہے اور اس نے اردو شاعری میں ایک نئی آواز کا اضافہ کیا ہے اور یہ کہ دوسرے روایتی شاعروں کی طرح یہ بھی جوانی ہی میں مر جائے گا۔

جب اسرار بھائی اپنی نظمیں سنا چکے اور ہماری امریکن پروفیسروں نے ان کا بہت بہت شکر یہ ادا کر لیا اور یہ دونوں آدمی چلے گئے اور لڑکیوں نے طے کیا کہ اردو کتابوں کی الماری میں سے جو اردو اور فارسی کے کلاس روم میں منتقل کی تھی، مجاز کی کتاب نکال کر پڑھنا ضروری ہے۔ 'آوارہ' چونکہ بہت پسند کی تھی اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں وہ پہلے ہی بہت مقبول ہو چکی تھی،

لہذا ملا نے نہایت اہتمام سے اس کا ترجمہ سیکھا اور یہ نظم بھی Repertoire میں شامل ہو گئی۔ اسی زمانے میں ہم لوگ کالج کی طرف سے ہر مہینے ایک درائی پروگرام 'پگھڑیاں' کے عنوان سے براڈ کاسٹ کرتے تھے۔ اسرار بھائی کی نظمیں خود ان کی زبانی سن چکے تھے۔ لہذا طے ہوا کہ اب کے سے پروگرام میں 'گر باؤ انس' موقوف۔ ایک عدد نقلی مشاعرہ کیا جائے جس میں سارے شاعروں کی نظمیں ہوں (کیا بچپن اور ہزدنگا پن تھا)۔

یاد پڑتا ہے کہ ساغر، جوش اور ایک دو کسی اور شاعروں کی نقل کی گئی تھی۔ مشاعرے کا اسکرپٹ نہیں لکھا گیا۔ کیونکہ یہاں براڈ کاسٹ کر دیا جائے۔ پروگرام آرگنائزر سعیدہ آقا تھیں۔ انھوں نے کہہ رکھا تھا کہ جوجی میں آئے کرو مگر کسی شاعر کا مذاق نہ اڑانا۔ یہ لوگ براہمان جاتیں گے۔ طے ہوا کہ اندجیری رات کا مسافر میں پڑھوں، کیونکہ ملا جو اس نظم میں بھی ایکسپرس تھی، لکھنؤ سے باہر گئی ہوئی تھی۔ میں نے یہ نظم ایک ہی سرجیسی تھی اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ نقل بالکل اصل کے موافق ہو اور اسرار بھائی کو آخر تک معلوم نہ ہونے پائے کہ ان پرائیکٹوٹی کی جاری ہے۔

انھیں دنوں رضیہ آلالہ آباد سے لکھنؤ آئی ہوئی تھیں۔ (بنے بھائی مجھے یاد پڑتا ہے شاید اس وقت بھی جیل میں تھے) رضیہ آلالہ آباد اور ابا جان کو میں نے 'نئی پڑھائی' کہ مجاز صاحب کو بلا کر ان سے اسی نظم کی فرمائش کیجیے گا۔ میں ذرا اس کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں۔ چنانچہ مجاز کو بلایا گیا اور ان سے بار بار یہی نظم سنی گئی۔ اور اس کے چند روز بعد 'پگھڑیوں' کے پروگرام میں نہایت دھوم دھام کا مشاعرہ ہوا۔

مجاز صاحب علی گڑھ چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے ریلوے پر یہ پروگرام سنا۔ علی گڑھ سے میری چچا زاد بہن نے لکھا کہ مجاز تم سے بہت خفا ہیں کہ تم لوگوں نے مجب لوٹ ہار پن کیا۔ پہلے تو اصرار کر کے ان سے نظمیں سنیں پھر ان کی بیروڑی کی۔

حالانکہ ہم لوگوں نے بیروڑی نہیں کی تھی۔

1914 عیسوی کا زمانہ مجاز کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہر طرف ان کی دھوم مچی تھی۔ اس

ماحول اور عہد کی ترجمانی انھوں نے بڑی لگن سے کی اور پھر دفعتاً اسے ادھورا چھوڑ دیا۔ ان کے فن اور ان کی شاعری پر ان گنت مضمون لکھے جا رہے ہیں اور لکھے جائیں گے۔ میرے پاس کوئی نئی بات ان کے متعلق کہنے کے لیے نہیں ہے۔ سبھی کو معلوم ہے کہ بڑے شریف آدمی تھے بھارے۔ بڑے مزاجیہ تھے۔ بہت ہنساتے تھے۔ بہت شراب پیتے تھے اور قصہ مختصر یہ کہ بقول علی گڑھ کی لڑکیوں کے 'بڑے سوئیٹ' تھے اور افسوس کہ بھارے اس بری طرح مر گئے یعنی اپنی بوہمسین روایات کو انت سے تک اس شان سے نبھایا کہ مرے بھی تو شراب خانے میں جا کر۔

یہ بوہمسین ازم کا ریکٹ بھی خوب چلا ہے۔ عرصہ چندہ بیس سال کا ہوتا ہے کہ یہ ریکٹ چلتا شروع ہوا تھا۔ اس کے بانی یہی حضرات تھے اختر شیرانی، میراجی، مجاز وغیرہ۔ اس میں یہ تھا کہ یہ لوگ انتہائی پٹری سے اتری ہوئی زندگی گزاریں گے۔ سخت انقلابی یا سخت رومانی نظمیں لکھیں گے، بے تحاشہ اور بے لگانہ شراب پیئیں گے اور ادھر ادھر مارے مارے پھریں گے (دیکھو آدشت اور سوسائٹی کی باہم جنگ پر جو اس کے خیالات) اور دنیا پر یہ ثابت کریں گے کہ کلاکار ہمیشہ سخت تنہا ہوتا ہے۔ جنم بھر تنہائی کے حصار میں بند رہتا ہے اور اسی میں مقید ایک دن ختم ہو جاتا ہے اور جو جوانی میں مرا، اور شراب پیتا ہوا مرادہ اور بھی شدت سے کلاکار ہوا۔ (دیکھو میرا جی، اختر شیرانی، سعادت حسن منٹو کے حالات زندگی) ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ لوگ واقعتاً سچے آرٹسٹ تھے۔ ان سب کی طرح مجاز بھی اونچے کلاکار تھے۔ انھوں نے سچے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا اور دے کر اپنی راہ چلے گئے لیکن ایک یونیوی ہوئی کہ بوہمسین ازم کا جو Cull انھوں نے قائم کیا تھا ان کی دیکھا دیکھی ان سے بہت کم، مچھوٹے پائے کے کلاکاروں نے بھی وہی حرکتیں شروع کر دیں۔ تحریک کی جو بدنامی ہوئی وہ الگ اور ذاتی طور پر فرسٹریشن ہوا وہ الگ۔ مچھوٹے کلاکار تو ایک طرف رہے۔ ہمارے ادب کے جو تین چار نا خدا تھے انھوں نے پچھلے دس سال میں اس ملک میں آکر کون سے تیر مار لیے۔ اب تو خیر کوئی جدوجہد وغیرہ جیسے الفاظ کا بھولے سے بھی نام نہیں لیتا۔

مجاز کی موت کے بعد ایک روز دفتر میں اسی بات پر جلال الدین احمد سے گفتگو ہو رہی تھی

کہ ملک میں ہر طرف جمود اور فرسٹیشن کے غرے لگ رہے ہیں۔ ہر شخص یہاں کی زندگی سے عاجز آ کر کینڈا جانے پر تلا بیٹھا ہے۔ سب اپنے آپ کو دہراتے دہراتے تھک گئے ہیں اور نئی بات کوئی بھائی نہیں دیتی۔ کیا یہ حکومت کا قصور ہے؟... نہیں کیا یہ سیاست، سیکشن A-92 اور سیکورٹی ایکٹ کا قصور ہے؟... نہیں... کیا ہماری پچھڑ، ذلیل مسلمان قوم کا قصور ہے؟ نہیں (یہ ایک اور نظریہ ہے جس پر ڈوڑی نے روشنی ڈالی ہے اور آج کل ابن سعید دورانِ گفتگو ڈوڑی کا حوالہ بہت دے رہے ہیں) میرے تینوں والوں کا جواب نفی میں ملا۔ اور اس کے بعد جلال بہت پر اسرار نظر آئے اور انھوں نے سر ہلا کر کہا کہ یہ دراصل ہمارے اپنے ادیبوں کا قصور ہے۔ ہمارے ادیب خود سخت پچھڑ ہیں۔ ان میں کلبر (Calibre) نہیں ہے اور نہ اپنے عقیدوں کی ہمت۔ خود نہایت سیکنڈ ریٹ ہیں اور حالات کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا کہ ہماری نسل کیا ساری کی ساری ایسی سپردہ نکل گئی؟ اور مجاز جو ہمارے لیڈروں میں سے تھا۔ مجاز تو بہت بڑا کلا کا تھا۔ میرا ایک عقیدہ ہے (جو دراصل رشید احمد صدیقی کا نظریہ ہے۔ میں ان کی نقل میں لکھ رہی ہوں) کہ بڑا فنکار لازمی ہے کہ بڑا انسان بھی ہوگا۔ گھٹیا انسان بڑا فنکار ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی مثال پرانی نسل میں موجود ہے کہ ایک سے ایک پائے کے لوگ تھے۔ پریم چند، دتاتریہ کنتی، آرزو کسنوی، کاظمی عبدالغفار۔ اب ہم چھٹ بھینے بیٹھے ہوئے سمجھ رہے ہیں کہ ادب کا، قوم کا، خیالات کا اور نظریات کا سارا بوجھ ہم نے اٹھا رکھا ہے۔ ہم سے پہلے والی نسل نے بھی بہت بڑھیا لوگ پیدا کیے ہیں بھائی بٹے کو دیکھ لیجیے۔ پھر فیض ہیں۔ احتشام صاحب ہیں۔ احمد عباس ہیں... اور مجاز بھی تو اسی نسل کے فرد تھے۔

مجھے معلوم نہیں پچھلے آٹھ سال میں علاوہ بہت کم شعر کہنے اور بہت زیادہ لطیفہ گوئی کے انھوں نے کیا کیا۔ 1951 عیسوی میں وہ غالباً پہلی اور آخری دفعہ کراچی آئے تھے۔ ہمارے پڑوس میں ایک بہت ردائی قسم کا ڈرنہوٹے والا تھا۔ میزبان کھلونے کہا کہ سنا ہے آج کل انڈیا سے مجاز و جاز آئے ہوئے ہیں ان کو بلا لیا جائے۔ ذرا دلچسپی رہے گی۔ یعنی رو یہ کچھ یہ تھا کہ ڈرنہ کے ساتھ بال روم ڈانس نہ کیا ترنم سے پڑھنے والوں کے اشعار سن لیے ایک ہی بات ہے۔ کراچی



کے اعلیٰ طبقے میں مشاعرے اسی طرح کروائے جاتے ہیں جیسے، صحاف کیجیے گا، ایک زمانہ میں نوابوں کے یہاں بحرے ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ مجاز اور روشن صدیقی اور شاید ایک دو اور شاعروں کو ترنت بلوا بھیجا گیا۔ اس زمانے میں مجاز کی حالت بہت دگرگوں ہو چکی تھی۔ بہر حال، انھوں نے اپنی تازہ غزلیں سنائیں۔ مجمع فوج کے ان بہت ہی اعلیٰ افسروں کا تھا، جن کا ادب اور اردو زبان سے اتنا ہی تعلق ہے، جتنا میرا میکینیکل اینڈ الیکٹریکل انجینئرنگ سے۔ خیر، وہ بیچارے صبر شکر کر کے مجاز کے شعر سن رہے۔ اور مجاز صبر شکر کر کے سناتے رہے۔ مجمع کو سانپ مونگھٹا ہوا تھا۔ بالآخر جہلم کے ایک ہیجر جنرل صاحب نے ان سے کہا کہ جی اب آپ ایک آسان سی غزل سنا دیں تو پھر ہم لوگ چلیں۔

اس ذکر کے بعد ہم لوگوں نے مجاز کو نہ دیکھا۔ سمندر پار ان کی بھانجی زریںہ اور ان کے بہنوئی یعنی حمیدہ آپا کے میاں سے جب کبھی ملاقات ہوتی تھی، وہ لوگ ذکر کرتے تھے کہ اب مجاز رانچی میں ہیں۔ اب رانچی سے باہر آ گئے ہیں۔ اب لکھنؤ میں ہیں۔ اب دہلی میں۔ ڈھاکہ کے ہیں۔ ایک روز اطلاع ملی کہ مجاز اپنے شہر نگار کے بگرام پورا ہسپتال میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

موڈ ہو تو بھائی لوگ موت کے واقعے میں معرفت، اُنپشددوں اور خود جو دیت کے فلسفے اور رموز و نکات ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ردمان پرست کی موت ایسی ہوتی ہے کہ زندگی میں مرتا ہے (دیکھو کلیس کی سوانح حیات)۔ علاوہ ازیں روپرت بروک، سنڈنی کیز ایلین لوئیس، کرسٹر کاڈویل، ڈی لن طامس، سب کے سب جواں مرگ شاعر تھے۔ کچھ جنگ کے مجاز پر خود اپنی لڑائی لڑتے ہوئے کھیت رہے۔ سبیل کچھ بھی ہو، واقعہ صرف ایک ہے کہ اسرار بھائی، یعنی اسرار الحق مجاز، ردولوی تم لکھنوی سردیوں کی رات میں ایک شراب خانے کی چھت پر نیم مردہ پائے گئے اور ہسپتال پہنچ کر ختم ہو گئے۔ ہماری زندگیوں کی موربڈٹی (Morbidity) کی بھی کچھ انتہا ہونی چاہیے۔

مجاز اور ان سے پہلے ان کی چینی، بہمن صفیہ آپادونوں کی موت پر اظہار افسوس کرنا بڑی بہت کا کام ہے۔ ان کی موت ہمارے پورے دور پر ایک نہایت خوفناک طغی ہے۔ صفیہ آپا نے

کھتے دکھ میں اور کس بہادری سے جان دی۔ میں نے ان کے خطوط کا مجموعہ نہیں پڑھا۔ صرف اس کا تذکرہ سنا ہے مجاز کس طرح مرے۔ اس کے بہت سے قصے لکھنے سے آ کر لوگوں نے بیان کیے ہیں۔

مجاز کی گاڑی عرصہ ہوا پٹری سے اتر چکی تھی۔ اور اب گھٹا ٹپ اندھیرے میں کھڈ میں جا گری۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کم از کم مجھے تو مجاز کی موت پر ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوئی۔ دراصل ہم ایسے موردِ ماحول میں زندہ رہے ہیں کہ موت و زندگی کی اہمیت کا احساس روز بروز ختم ہوتا جا رہا ہے۔ لاکھوں 1974 عیسوی میں مر رہے۔ اتنے ڈھاکہ میں شہید ہوئے۔ اتنے کھوکھر پار عبور کرتے ہوئے جاں بحق تسلیم ہوئے۔ موت عجیب چنڈو خانہ معلوم ہوتی ہے۔ مجاز کا مرنا بھی عجیب سحرہ پن لگتا ہے۔ یعنی سرمے۔ یعنی اگر نہ مرتے تو ان کے زندہ رہ جانے سے دنیا میں بڑا فرق پڑتا۔ سارے حالات سدھ جاتے۔ ہندو پاکستان گلے ل جاتے۔ امریکہ اور روس میں وائٹ کافی روڈنی کی دوستی ہو جاتی۔ کراچی کے سارے کروڑ پتی اپنا سارا روپیہ مہاجرین میں تقسیم کر کے خود جنگل کی راہ لیتے۔ مجاز اگر کہیں دس بارہ سال اور یوں ہی جی جائیں تو بس عہد زریں آیا ہی سمجھو... مطلب یہ کہ موائس کے ہم موردِ بڑ ہیں اور مرنے والوں کے لیے بین کرنے میں ہمیں حزا آتا ہے۔ آخر بتائیے کہ مجاز پر مزید ایک مضمون لکھنے کا فائدہ کیا ہے، اس سے مجاز زندہ ہو کر واپس تو آنے سے رہے اور اگر ایک دفعہ پھر ہم نے داویلا چائی کہ ادیبوں کا یہ حال ہے کہ بھوکے مر جاتے ہیں اور گور ز اور فشرڈ نر ازار ہے ہیں، تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یعنی معاف کیجیے گا، مجاز کا مرنا کسی قسم کی شہادت نہیں ہے۔ نہ مجاز کے مرنے سے بقیہ ادیبوں کی عاقبت سنوری۔ بقیہ ادیب بھی بہت سے اسی طرح مریں گے۔ میری سمجھ میں آج تک یہ نہ آیا کہ ادیب لوگ ہیں کہ دھڑا دھڑا مرتے چلے جا رہے اور باقیوں کے کان پر جوں تک نہیں رہتی کہ یہ لکھنا لکھنا چھوڑ کر کوئی اور کام شروع کریں تا کہ اس آئے دن کے داویلا سے نجات ملے۔ اور یوں بھی یہاں لکھنے کے لیے کون سا میدان رہ گیا ہے۔ لہذا مجاز کے واقعے سے عبرت حاصل کیجیے۔

لیکن ایسی تلخ باتیں کہنے سے بھی کام نہ چلے گا۔ آخر ذرا بیجا یہ تھی کہ ادب کا یہ لپکتا ہوا

شعلہ محض دتی کا شرابی بن کر رہ گیا اور اس کی موت منٹوں کی طرح ہمارے لیے مور بڑی کی ایک اور علامت بن گئی۔ مجاز محض چاند کی دایوں میں بھٹکنے والا رومانی نہ تھا۔ وہ شروع سے تحریک کے ساتھ رہا۔ اس نے ہندوستان کی ادبی تاریخ کے ایک بہت اہم دور میں ایک خاصا اہم رول ادا کیا۔ وہ ہماری نئی روایت میں پوری طرح رچا ہوا ہے۔ اپنی رومانیت کی وجہ سے اس نے خود کو انفرادیت کے حصار میں مقید نہیں کر لیا۔ لیکن پھر بھی اس نے Main stream کا آخر تک ساتھ نہیں دیا اور تھک کر ایک طرف کو بیٹھ رہا۔ سوال یہ ہے کہ آرٹس اور سوسائٹی کی باہم پیکار کی وجہ کیا محض آرٹس کی شخصیت اور اس کی ذہنی، جذباتی اور رومانی (اگر اس اصطلاح کا کوئی مطلب ہے) Intensity ہے۔ جو اس کے گرد و پیش سے لگا نہیں کھاتی اور وہ بھٹکتا پھرتا ہے۔ روح کی تاریک گہرائیاں، ذہن کے پرچھ عقیقے، احساسات کے دھند، ان سب سے گھرا ہوا فرد اپنا اندرونی توازن حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے۔ اپنے اظہار کے لیے، نثر اور رنگوں کی تلاش کرتا ہے۔ جذباتی تجربے ہر شاعر نے ہر زمانے میں کیے ہوں گے انگلستان کے ہوکنز، آئرلینڈ کے سٹیس، امریکہ کے ایڈرا پاؤنڈ، جرمنی کے رٹکے، بلجیم کے ہٹلر لیک، سویڈن کے اسٹرنبرگ، اسپین کے لورکا، اور پھر انیسویں صدی کے سارے رومان پرست اور مترجموں صدی کے مابعد الطبیعیاتی شعراء۔ یہ سب ذہن اور جذبات کی بہت طویل اور پرخطر سیاحتوں پر نکلے تھے۔ سارے حضرات جن کا میں نے اوپر ذکر کیا بڑی شدید انفرادیت کے مالک تھے۔ یہ لوگ Main Stream میں شامل ہونے کے بجائے کنارے پر کھڑے رہے اور پھر تاریک جنگلوں میں جا گئے۔ لیکن اسرار الحق مجاز نے اپنی انفرادیت کے باوجود نہ پہیلیں سمجھوائیں نہ کسی بھول بھلیاں کی تعمیر کی۔ تعجب کی بات ہے کہ محض ذاتی ناکامیوں کے کارن انھوں نے ہار مان لی۔ کیونکہ ذاتی ناکامیاں بڑے کھاکار کو وقتی طور پر اداس کر دیں لیکن اس کو، اس کی روح کو ختم کبھی نہیں کر سکتیں۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔

میں نے اوپر کہا تھا کہ مجاز ہماری نئی روایت کا بہت اہم حصہ ہے۔ ہماری یہ روایت آج سے بہت عرصہ قبل شروع کی گئی یہ خالص دینی روایت نہ تھی کیونکہ ہمارے ذہن مغرب کے نظریے

کائنات کو سمجھنے اور اپنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ زندگی بہت مشکل، بہت پرہیز اور بہت دیکھی غنتی جاری تھی اور اپنے اظہار کے لیے نئی علاقوں، نئے اسلوب درکار تھے۔ پرانا طرز بیان اودھ کے آخری دور کے ساتھ رخصت ہوا۔ گو پروفسر آنرک کا کہنا ہے کہ شاعری ہمیشہ جدید رہی ہے اور اس کے مسائل حقیقی۔ اس طرح چار اور کبیر داس بھی جدید تھے۔ پوپ اور سودا بھی۔ میں ادب کو تاریخ کے سیاسی، سماجی اور سماجی و صا رہے سے الگ کر کے کبھی نہیں دیکھ سکتی۔ جس سے آج سے تقریباً نصف صدی قبل اردو شاعری میں نئے تجربات کیے جا رہے تھے اور یہ اس کے بعد کا وہی زمانہ تھا جب رابندر ناتھ ٹیگور کو یورپ میں مقیم رکھا گیا اور مغربی تہذیب کے سارے دکھوں کا علاج گیتا ملی کی تلاوت قرار پائی۔ اسٹنکر کا زوال مغرب خود اپنی تفسیر تھا۔ برنارڈ شا کی طور، برنارڈ رسل کا فلسفہ، ہینلین کا تصوف کسی چیز کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ سارے راستے ایلیٹ کے دیرانے کی طرف جا رہے تھے۔ مغرب کے ذہن پرست نردان کے لیے ہندستان کی اور دیکھ رہے تھے۔ ہندستان کی روحانیت سے متاثر ہونے کا فیشن بیلنس نے شروع کیا تھا۔ اس کے رد عمل کے طور پر بہت سے یورپین ذہن پرستوں کو خالص مغربی تہذیب خطرے میں نظر آئی۔ رومن کی تھوگک کلیسا کی اقدار، یورپ کی کلاسیکل یونانی روایات وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کو ایک ٹیگور کی گیتا ملی قسم کیے ڈال دی تھی۔ کہاں ایک زمانہ میں وکٹورین انگلستان مزے میں بیٹھائی سن پڑھتا رہا تھا۔ کہاں اب ایک کے بعد ایک چلے آ رہے تھے۔ حفاظت اب کہاں پاتی تھی؟

اسی وقت سے ہندستان میں روس کا اثر شروع ہوا۔ یہ اثر محض انقلاب کا نہیں تھا۔ سوویت روس نے مغرب کی روایت سے ہٹ کر اپنی روایت بنا ڈالی تھی۔ جو بالآخر ایشیائی روایت تھی۔ ایشیا اور ایشیائیت، ہندستان اور ہندستانیت کا احساس ہمارے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ملک کی سیاسی اور تہذیبی نشاۃ الثانیہ میں پنڈت نہرو اور سہاش چندر سے لے کر اودے شکر، لیزلی صاحب سنگھ، سکھو، نیو جھیڑ، زککنہ کے جنگلی فلم ڈائریکٹر، شانتی کپتن والے، مرانی اور گجراتی اور نال لیکھک، جاموہر دتی کے لوگ پریم چند، ملک راج آنند، ہمایوں کبیر اور خواجہ احمد عباس بھی شامل تھے۔ یہ سارا پس منظر اردو کی ترقی پسند تحریک کا تھا جس میں علی گڑھ کے ایک نوجوان طالب علم

نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ دہلی ارٹھ کی منزل میں طے کیں۔ لکھنؤ تو عالمی مجاز نے 1892 عیسوی کے لگ بھگ ہی شروع کر دیا تھا۔ اس وقت علامہ اقبال اردو میں ایک نئے اور بے حد عظیم الشان Dimension کا اضافہ کر چکے تھے۔ جوش کی گھن گرج سے شاعری کے ایوانوں میں بھونچال سا آ رہا تھا۔ اقلیم غزل پر فانی اور اصغر گوٹھی وغیرہ کی عمل داری تھی۔

اس سے سارا ہندوستان دہلی طور پر بہت آگے بڑھ چکا تھا اور اب ٹیکور اور گاندھی کو کسی ایذا پہنچانے اور کسی روہین رولاں کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ برطانیہ اور ہندوستان کے متوسط طبقے گاندھی، نہرو، لینن اور گورکی کے ناموں سے چونک اٹھے تھے۔ لیکن پھر بھی، ابھی خطرہ بہت دور تھا اور ان کے قلعے بہت محفوظ۔

ہندوستان کی تہذیبی زندگی کا یہ نیا دور جس شان سے طلوع ہوا مجاز اسی شان سے اس کے نقیب بن کر آگے بڑھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ اور پٹنہ اور الہ آباد اور لکھنؤ اور علی گڑھ کی یونیورسٹیاں ملک کی علمی ادبی اور کچلڑی زندگی کے مرکز بنی ہوئی تھیں۔ جب ملک میں روز ہر طرف نت نئے چراغ جلتے جا رہے تھے۔ اودے شکر نے رقص کی تہذیب و ترویج کے لیے الموزے میں کچلڑی سینئر قائم کیا تھا۔ گردپ تھینر مومنٹ شروع کیا گیا تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد بنی گئی تھی۔ شائع کر رہی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ادب پر شہسوں کام کیا جا رہا تھا۔ الہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں کے طالب علم اپنے گروؤں کے قدموں میں بیٹھ کر علم حاصل کرنا اپنی زندگی کا واحد مقصد گردانتے تھے۔ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور آل انڈیا یونیورسٹیز کانفرنس کے پلیٹ فارموں سے دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ اس سہانی صبح کے خواب دیکھے جا رہے تھے جب قوم، ہندو اور مسلمان، پنجابی اور بنگالی اکٹھے قدم بڑھا کر آزادی کا سواگت کریں گے۔ ہندوستان کی قدیم ہندو مسلم تہذیب کی تہذیب کی جائے گی۔ کانپور اور ٹانگا نگر اور کلکتہ اور بمبئی اور احمد آباد کی طوں کے مزدور اپنا اپنا جیون شروع کریں گے۔ نئے پن کے اس جوش نے ملک کے نوجوان طبقے میں ایک عجیب طرح کا دالہانہ پانکھن اور سرفروشی اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس میں تخیل پرستی کو کتنا دخل تھا اور حقیقت پر کتنوں کی نگاہیں تھیں اس کا جواب ہمیں بہت جلد

مل گیا۔ ہمیں خواب دیکھنے کے جرم کا بڑا بھیانک کفارہ ادا کرنا پڑا۔ لیکن نوجوانوں نے ہمیشہ خواب دیکھے ہیں۔ اگر وہ خواب نہ دیکھتے تو دنیا کبھی آگے نہ بڑھ سکتی۔ مجاز نے اس نوجوان طبقے کی بڑے ٹھانڈے سے نرا زندگی کی۔ انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ قدم قدم پر مستقبل کے گمن میں (Gun men) کی ٹاک میں کھڑے ہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب انہیں اپنے اس چین اور اپنے غزالوں کا نوک لکھنا پڑے گا۔

وہ زمانہ اور اس زمانہ کے طالب علم غالباً اس وقت سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اس سارے ماحول اور آج کل کے ماحول کے فرق کا محض اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے کے طالب علم جب تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان جاتے تھے تو اپنا سارا روپیہ خرچ کر کے وہاں سے کتابیں خرید کر لایا کرتے تھے۔ آج کل طالب علم انگلستان اور امریکہ سے کتابوں کے بجائے موٹر کار خرید کر لاتے ہیں۔ تجارتی اقدار نے ابھی زندگی پر چھاپہ نہیں مارا تھا اور طالب علموں کی دنیا کی بنیادیں تو بہت اونچے آدرشوں پر قائم تھیں۔ یہی لوگ جنگ آزادی میں سب سے آگے آئے رہے اور انھوں نے ہی ملک کے ادب، سیاست، آرٹ، صحافت، ہر شعبے کو اپنی تخلیقات اور اپنی کاوشوں اور قربانیوں سے مالا مال کر دیا۔

مجاز کے شعروں میں بڑی گونج تھی۔ جھنکار، رنگ، توانائی۔ ان کے لہجے کا یہ ٹھیکھا پن پوری نوجوان نسل کی کیفیت مزاج کی عکاسی کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے جوش و خروش میں ہر اُس پرانی چیز سے بغاوت کی جو ان کے نزدیک تلخی اور ذہنی پسماندگی کی یادگار تھی۔ یہ انگارے کے مستحقین کی نسل تھی۔ اسی دور میں راشد اور فیض بھی اردو داں طبقے سے متعارف ہو چکے تھے۔ ان نوجوانوں نے خدا کو طعنے دیے۔ حوروں اور فرشتوں اور مولویوں کا مذاق اڑایا۔ متوسط طبقے کی نشتر زنی کے لیے عصمت چغتائی قلم اٹھا چکی تھیں۔ منٹو نے طوائفوں، اچکوں اور شریعوں کو بڑے پیار سے اپنا لیا تھا۔

ایسے میں مجاز کو کہاں فرصت تھی کہ وہ سائل تصوف یا مابعد الطبیعیات کے نکتے بیان کرتے۔ زندگی میں دشت اور دیرانی تھی۔ اور انھیں ایک نئے نظام کا کھوج لگانا تھا۔ لہذا ان کے

شعروں کا آبشار انقلاب کے نئے منظر نامہ نہایت سبک خرامی سے رواں رہا۔ مجاز کی شاعری کے فنائے عصر کو میں بہت اہمیت دیتی ہوں۔

خالص شاعری کی جس لہر نے ولایت میں کولرج، کیلس اور شیلے پیدا کیے مدتوں بعد وہی لہر بذریعہ علی گڑھ تحریک اور انگریزی تعلیم اور نئی شاعری وغیرہ ہندوستان کے اردو داں طبقے تک پہنچی۔ اس وقت تک ولایت میں رد مانک تحریک کی دوسری لہر فرانس کے سمبلست (Symbolist) خبرداروں، اور ملارے، رلکے، اسٹیفن جارج اور پھر میٹیس، ایلٹ ایڈتھ سسٹ ویل اور دوسرے شعرا کے ذریعے شاعری کے جدید تر عہد کے لیے راستے تیار کر رہی تھی۔ ایلٹ اور ان کے ساتھیوں کی نئی شاعری بھی ہمارے یہاں بہت دیر میں پہنچی۔ الفاظ کا ظلم اور الفاظ کی موسیقی۔ اقبال نے ان نئے تجربوں کے ساتھ شاعری میں ایک عظیم الشان عہد کا آغاز کیا تھا۔ مہارشی رابندر ناتھ ٹیگور نے کہیں پر سوال کیا ہے کہ "شاعری کس چیز کی تشریح کے لیے کی جاتی ہے؟ جو کچھ دل محسوس کرتا ہے اس کی نظم بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں نظم میری سمجھ میں نہیں آئی تو مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر کوئی صاحب پھول کی خوشبو سونگے کہہ رہے ہیں کہ پھول میری سمجھ میں نہیں آیا تو انھیں بھی میرا یہی جواب ہے کہ اس میں سمجھنے کی کون بات ہے۔ یہ محض خوشبو ہے۔ اگر اب بھی وہ صاحب یہی پوچھیں کہ خوشبو کا کیا مطلب ہے تو صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ آفاقی مسرت خوشبو کا رد پد حمار کر پھول کی صورت میں نمودار ہوئی۔ لیکن الفاظ کے ساتھ یہ علت ہے کہ ان کے معنی بھی ہوتے ہیں اسی وجہ سے کوئی کو بجز اور وزن کے چکر میں مبتلا ہوتا پڑتا ہے تاکہ الفاظ اس کے قابو میں رہ سکیں۔ احساسات کا اظہار کسی بنیادی یا ساختہ حقیقت یا کسی فائدہ مند اخلاقی اصول کا بیان نہیں ہے۔ آنسو یا جسم کی مانند یہ اس حالت کی تصویر ہے جو دل کے اندر پیدا ہو رہی ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

گرد و پوک اس آئینہ بلزم نے بہت سوں کا پڑا کر دیا۔ لیکن مجاز نے جو الفاظ کے بحر اور فنائیت دونوں کے بادشاہ تھے، مقصدیت کو کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ شعروں کے اس فنائے عصر، ایک آفاقی اداسی کے احساس، ایک رچی ہوئی معصومیت اور جذبہ اور خیال کی ہم آہنگی

کے ساتھ ساتھ ان میں سماجی شعور بھی موجود تھا جس کی بدولت وہ نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں گھلے لئے رہے۔

انیسویں صدی کے جمال پرستوں نے جس میں بودیزم، والڈ پیٹر، سوئین برن، سبھی شامل تھے کہا تھا کہ شاعری a condition of music ہے۔ یہی موسیقی کی کیفیت ایلٹ کے یہاں بھرپور موجود ہے۔ کلیس سے لے کر ڈی لن طاس تک سب اس روایت میں شامل ہیں۔ ہمارے یہاں کے جدید شعرا نے بھی دماغی Sensation، مدہم اور گہرے رنگوں اور عکسیت کی Overtones کی اس روایت کو اپنالیا۔ ان کی اس نئی شاعری میں ایک طرف سادہ بھادوں کے طوقانوں کی گھن گرج سنائی دی اور دوسری طرف:

اور بہت دور آسمانوں سے

موت آواز دے رہی ہے مجھے

جیسے اشعار میں رگ دید کی حمدوں والا آفاقی سناٹا یکلفت سامنے آ گیا۔

سبکی جانتے ہیں کہ الم پسندی، خواہش مرگ، وغیرہ وغیرہ رومانیت کے لازمی جزو ہیں۔ نیگور نے اپنشدوں کے زیر اثر کنول کے پھولوں کی اس اداسی کو رومانیت کا جامہ پہنایا۔ اختر شیرانی نے اسے خالص رومان بنا دیا۔ مجاز کے یہاں یہ دھبی دھبی کیفیت ایک بڑے خوبصورت نغمے میں تبدیل ہو گئی جسے انھوں نے مزدور، انقلاب، بغاوت اور اپنے عہد کے سارے مہلو کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔

ہمارے یہاں خیالات کا اتار چڑھاؤ بڑی پابندیوں سے مغرب کے ذہنی مد و جزر کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ ہم کولونیل (Colonial) لوگ تھے۔ سلطنت برطانیہ، یورپ کے سیاسی اکھاڑے میں معاشی اقتدار کے لیے جیسے جیسے لڑائیاں لڑی گئیں۔ ہم بھی ان سے متاثر ہوتے رہے۔ یورپ میں پہلی جنگ عظیم کے بعد کے احساس محرومی اور بے اطمینانی کی عکاسی ایلٹ نے 'ویسٹ لینڈ' میں کی تھی۔ اس کا علاج اب بدھ ازم اور فلسفہ نروان کے پاس بھی نہ تھا۔ زیادہ لوگ کارل مارکس پڑھ رہے تھے اور ذہن پرستوں کا بائیس باز دم میں شامل ہونا تو فیشن ہی بن چکا تھا۔



1918 عیسوی کے بعد اور اقتصادی ڈپریشن کے دور میں انگلستان اور امریکہ کے شاعر باضابطہ طور پر ایک گہرا سماجی شعور حاصل کرنے کی کوشش میں جٹ گئے (یہ دوسری بات ہے کہ ان میں سے بیشتر کا انسانیت کے متعلق یہ نیا رویہ جذباتیت پر مبنی تھا۔ لہذا عرصہ ہوا ان اٹھلایوں کے قدم اکھڑ چکے ہیں۔ اور یہی عالم ایک حد تک ہمارے یہاں بھی پایا جا رہا ہے۔

مجاز اور ان کے گروہ کے دوسرے ساتھی 30 عیسوی... 39 عیسوی کے ان انگریزی شاعروں کے ہم عصر تھے۔ اوڈن اور لوئی مک نیس کی طرح انھوں نے بھی شہروں کی جگہ لگاتی، جاگتی سڑکوں اور اس عہد کے بھرپور دھڑکتے ہوئے دل کی عکاسی کی... اسی دور اور اس نسل کی ترجمانی کرتے ہوئے لوئی مک نیس نے 1941 عیسوی میں 'پیدائش سے پہلے کی دعا' میں لکھا تھا:

میں ابھی پیدا نہیں ہوا ہوں، خداوند امیری دعا سن لے۔

خداوند!

خون چہ سنے والی چمکاؤروں

اور چہ ہوں اور نکلوں

اور مکمل پائی غول بیابانی کی یلغار سے مجھے بچا۔

میں ابھی پیدا نہیں ہوں۔ خداوند امیری اشک شوقی کر۔

مجھے ڈر ہے کہ میرے ہم جنس ادنیٰ ادنیٰ دیواروں میں مجھے قید کر دیں گے

نشا آور چیزوں سے میرا دماغ معطل کر دیا جائے گا

بڑے بڑے عالمانہ جھوٹ مجھ سے بولے جائیں گے

سیاہ شکنجوں میں ڈال مجھے کھینچا جائے گا۔

خون کے تالاب میں میں نہاؤں گا۔

میں ابھی پیدا نہیں ہوا ہوں۔ میرے ذریعے دنیا جن گناہوں کی مرکب ہوگی

ان کے لیے مجھے معاف کر

میرے الفاظ جو دنیا مجھ سے منسوب کرے گی۔  
 میرے خیالات جو دوسرے میری طرف سے سوچیں گے۔  
 میری خدایاں میرے نام سے دوسرے خدا، جن کے مرکب ہوں گے  
 میری زندگی جب میرے ہاتھوں کے ذریعے دوسرے نقل کریں گے  
 میری موت، جس کے ذریعے دوسرے زندہ رہیں گے

میں ابھی پیدا نہیں ہوا ہوں۔ میرے پارٹ کی مجھ سے رہنمائی کروا  
 ان موقعوں کے لیے مجھے رکالے سکھلا دے  
 جب بزرگ مجھے ہیبت کریں گے۔  
 حکام مجھ پر عیب ڈالیں گے  
 پہاڑ مجھ پر دانت نکھیں گے، صحرا مجھے میری تباہی کی اور کھینچیں گے  
 بھکاری میری دی ہوئی بھیک قبول نہ کریں گے۔  
 میری اولاد مجھے بدعنائیں دے گی۔

میں ابھی پیدا نہیں ہوا ہوں  
 مجھے ان لوگوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت عطا کر  
 جو میری انسانیت کو ختم کر دیں گے  
 مجھے زبردستی کل کے ایک فطرناک پتلے میں تبدیل کر دیا جائے گا  
 میں مشین کا ایسا پرزہ بنا دیا جاؤں گا۔ جس کا صرف ایک چہرہ ہوگا۔  
 میری کلیت کو دھتک کر رکھ دیا جائے گا۔ میں  
 سہل کی روٹی کی طرح آوارہ یہاں سے وہاں  
 دوسرے ادھر ڈولتا پھروں گا

یا چلو بھر پانی کی طرح بہاؤ یا جاؤں گا۔

مجھے پتھر میں تبدیل نہ ہونے دے۔ میں چلو بھر پانی کی طرح بہنا نہیں چاہتا اور نہ مجھے مار ڈال۔

یہ اس زمانے کی ان محنت نظموں میں سے ایک ہے۔ لیکن انگلستان کے یہ جدید شعرا بھی یاسیت کا شکار نہیں ہوئے تھے۔ انسانیت کے مستقبل پر ان کو مکمل اعتماد تھا۔

ہندستان میں بھی اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ جس طرح اوڈن کا 'سال نو کا خط' مکس کازن اس نامہ اور اسٹیفن اسپنڈر کی نظمیں اپنے وقت کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح مجاز بھی اپنے زمانے کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے نمود سرا ہے۔

لیکن، وہ زمانہ نشاۃ الثانیہ کی رونق اور چمیل پھل اور جوش و خروش کے باوجود بڑا دشمن اور بڑا پرہیزگار اور بڑا خطرناک تھا۔ ہم سب ایک کھمی کے کنارے پر بیٹھے تھے جگا مٹا رہے تھے۔ ملک میں کئی نسلیں یا قومیں ہستی تھیں ان میں سے ایک کا نام مسلمان قوم تھا۔ اس مسلمان قوم کا سیاسی سماجی ارتقا جس طور سے ہو رہا تھا، ہوتا رہا۔ 1935 عیسوی کے بعد جب مجاز اور ان کے ساتھیوں نے نیشنلسٹ انقلابی شاعری شروع کی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاست کی سطح پر مختلف تحریکوں نے زور پکڑا جن کو اس نئے سماجی شعور سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ جس کے تحت پہلے ماہتاب کو ملا کے عماسے، پینے کی کتاب سے تشبیہ دی گئی تھی ترقی پسند تحریک کی جڑیں تو اسی وقت سے کھوکھلی ہوتا شروع ہو گئی تھیں۔ جس کا نتیجہ آج اس ملک میں ہمارے سامنے موجود ہے اور اس کا علاج بہر حال، نہ کرشن چندر کے پاس تھا اور نہ اسرار الحق مجاز کے پاس۔

علاوہ ازیں بد قسمتی سے کلچرل زندگی کی اس گہما گہمی کے باوجود، ہمارے شاعروں کا عام زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ یہ نیا دور جس کام میں نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔ محض، اعلیٰ سطح پر ایک محدود تھا۔ ہمارے شاعروں نے مزدور اور انقلاب کی باتیں تو بہت کیں لیکن صحیح معنوں میں عوامی شاعر بہت کم لوگ بنے۔ ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ملک کی

چالیس کروڑ آبادی کے کتنے کم حصہ پر اس کا اثر ہوا کہ لہذا جب ہمارے شاعر انقلابی شاعری کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں ہماری قوم (اس سے میری مراد انسانیت کے اس سارے طبقے سے ہے جنہوں نے لکھنؤ اور علی گڑھ کی یونیورسٹیوں سے انگریزی اور اردو میں ایم اے نہیں کیا) کو اس کے لیڈر ایک بالکل دوسری راہ پر چلا رہے تھے۔

اس سارے کنفیوژن کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ 1974 عیسوی میں بہت سے ادیب ذہنی افرا تفری کا شکار ہو گئے اور پچھلے بارہ سال میں جو شاید ہوئی تھی وہ ہل کی پل میں اس طوفان کے اس خوفناک رویے میں بہہ گئی۔ معلوم یہ ہوا کہ کلچر کو مذہب کی بنیاد پر پرکھنے والے اللہ کے فضل سے سو فیصد بالکل ہی بے بہرہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ 1974 عیسوی کے دورا ہے پر پہنچ کر ہمارے بڑے بڑے دانشور بھی بہک گئے۔ جو لوگ اصرار آئے تھے انہوں نے کچھ نہ کچھ چپکے ہو رہے اور چند ایک قلابازی کھا کر کچھ سے کچھ بن گئے (اور بہر حال یہ تو وہ ملک ہے جہاں بڑے بڑے شاعر انقلاب ہجرت کر کے آ جاتے ادب میں جہ چارہا دہی جمود کا اور خالص شاعری کا اور میر کی غزلوں کا۔ ایسے میں مجازی وہ کھٹکتی ہوئی دلول انگیز شاعری کسی دوسری دنیا کی آواز مخصوص ماحول اور پس منظر جس نے اس شاعری کو جنم دیا خواب و خیال کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔

مجاز نے برسوں پارٹی کا ساتھ دیا۔ 1945 عیسوی میں جب پارٹی نے کہا کہ پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے اور لینن اسٹالن نظریوں کے مطابق، تو مجاز مسلم لیگ میں جا شامل ہوئے اور یوم پاکستان کے ترانے لکھنے لگے، لیکن اب مجازی آواز مدہم پڑتی جا رہی تھی اور آخر میں انہوں نے تھک کر اطلاع دی کہ:

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبح نو مجاز

ہم پر ہے قسم شامِ غریباں لکھنؤ

میں نے اور میرے ساتھیوں نے اکثر سوچا ہے کہ پچھلے برسوں میں جو کچھ ہوا وہ ذہنوں کے اندر ہوا ہے باہر کی دنیا میں طرح طرح کی ترقیاں ہوتی ہیں۔ اندر کی دنیا میں لاشوں کے انبار لگتے چلے گئے۔ ہمارے ایک عزیز دوست جو نقاد بھی ہیں، پانچ برس انگلستان کے ذہن پرستوں

اور دانشوروں کی صحبت میں گزرا کر لوٹے ہیں۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ”مجھے لگتا ہے جیسے میں اپنے کاندھوں پر بہت سی لاشیں اٹھائے گھوم رہا ہوں“ یہ ہے کہ یہ احساس ہمیں کیوں ہو رہا ہے۔ اس ملک میں ہم زندگی سے کیا اتنے کٹ گئے ہیں کہ اب ہمیں سو لاشیں اٹھانے کے کوئی کام نہیں رہا۔ مجاز نے سر کے ایک اور لاش ہمارے حوالے کر دی۔ لیکن جب بھی ہم یہ دیکھنے کے لیے بیٹھیں گے کہ پچھلے بیس سال میں ترقی پسند تحریک کی اس جدوجہد میں جس میں بہت سے چھوٹے بڑے چراغ شامل ہیں، اس میں کچھ Individual achievements بھی ہوئی ہیں، یا نہیں۔ اس وقت ہم دو تین نظمیں ضرور ذہن میں آ جائیں گی۔ جو کسی بھی کلاکار کو امر بنانے کے لیے بہت ہے۔

مجاز اور صغیر آپا کی موت پر مجھے سی، ڈے لوئیس کی ایک نظم یاد آ رہی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے:

فرض کیجیے کل یا برسوں ہم ختم ہو جائیں  
آندھی آئے اور ہم پر پھیر دی ٹوٹ کر گر پڑے  
یا کوئی اور حادثہ... فرض کیجیے...  
تو کیا یہ موت قبل از وقت کہلائے گی؟ کیا اس پر افسوس کرنا ضروری ہے؟  
محبت کا ثبوت تو اس کی تخلیق میں ہے!  
اس کی ابدیت میں نہیں۔  
درخت کی جتنی  
اور گوریا چڑیا کی مانند  
بہادر دل کی محبت پیدا ہوتی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔  
اسے کسی ڈھارس کی تنہا نہیں

تاریک جنگلوں کے اوپر اوشا مسودا رہ رہی ہے۔

جاگتی سرسراہی چھاؤں کے درمیان  
 اس کے پتوں میں الپ کے آخری سر نکھرتے جا رہے ہیں۔  
 لمحہ بھر کے لیے جنگل اجالے سے نکھر جائے گا۔  
 یوں ہی ہمیں سرت ملتی ہے، اور اتنی سرت ہی کافی ہے۔

---

(’انکار‘، کراچی، مجاز نمبر، 1986)

## ایک مہذب ظرافت نگار

(شوکت تھانوی)

مدتیں گزریں جب میں نے سودیشی ریل پر دمٹی تھی۔ مگر اس کے بہت سے جیلے آج  
نکاس طرح یاد ہیں جیسے یہ مضمون ابھی ابھی پڑھ کر ختم کیا ہو....  
بابو جی لایئے... نہ ہماری بات نہ آپ کی بوائی کا وقت ہے، لایئے تیرہ آنے ہی دے  
دیجیے۔ "نکٹ بابو نے کہا اور ایک پرچے پر کچھ لکھ کر دے دیا۔  
"نکٹ کہاں ہے؟" ہم نے پوچھا۔  
"نکٹ چھپنے گئے۔"  
ریل چلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔  
"ارے صاحب جب مسافر پورے ہو جائیں گے تب ہی تو ریل چھوڑیں گے یا ایسے  
ہی چھوڑ دیں۔"  
مسافر کچا کچھ بھر گئے۔ ریل پھر بھی نہ چلی۔

"لکھنؤ فارمین کوئلہ لینے شہر گیا ہوا ہے۔ کہہ دیا تھا جلدی آ جاؤ... اسی لیے چھٹنے میں دیر ہو رہی ہے۔" گاؤ صاحب نے فرمایا۔

اسنے میں لکھنؤ فارمین بھاگتا ہوا آیا۔ "اپنے باپ کا نوکر سمجھ رکھا ہے؟ سوراخ کی خوشی میں شہر کی ساری دکانیں بند ہیں۔ کہیں کوئلہ نہیں ملا۔ بڑی مشکل سے ایک جگہ سے پانچ سیر لایا ہوں۔" اس نے کوئلے کی بوری غصے سے ہنسی دی۔

یہ جملے ممکن ہے بالکل اسی طرح نہ ہوں۔ میں نے حافظے کی مدد سے لکھ دیے ہیں۔ لیکن کتنے مضامین یا افسانے ایسے ہوں گے جنہیں میں پڑھے ہوئے جن کے پورے پیرا گراف یاد رہ جائیں؟

لکھنؤ میں جب ریڈیو اسٹیشن کھلا تو بچوں کا پروگرام بھی شروع ہوا۔ اس پروگرام کے تین کردار تھے۔ آ پا جان۔ ان کا نوکر بدھو اور تیسرے ایک پو پٹی سی آواز والے بزرگ 'چاچا'۔ مجھے ان تینوں سے سخت عقیدت تھی اور راسخ عقیدہ یہ تھا کہ آ پا جان واقعی آ پا جان ہیں۔ بدھو ان کا انتہائی بے وقوف نوکر ہے (جو تھلا کر بولتا تھا اور 'گڑسوڑے' کا شوقین تھا جسے وہ 'دل تھوڑا' کہتا تھا) جو چاچا سے مستقل جھگڑتا رہتا ہے اور 'چاچا' ایک بے حد دلچسپ بڑے میاں ہیں۔ کچھ عرصے بعد جب مجھے اس پروگرام میں شرکت کے لیے بلایا گیا تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یعنی یہ کہ ہم آ پا جان بدھو اور چاچا کو نہ صرف زندہ جیتا جاگتا اور بولتا دیکھیں گے بلکہ ان کے ساتھ پروگرام میں شرکت کا فخر بھی حاصل کریں گے۔

لیکن ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر معلوم ہوا کہ آ پا جان کا اصل نام تو عرش منیر ہے (یہ ایک اسٹاف آرٹسٹ تھیں۔ ان کی بے حد خوبصورت آواز تھی اور برسوں یہ لکھنؤ اسٹیشن کے ڈراموں کی 'اسٹار' صداکار رہیں اور بہت عرصے سے کراچی کی ایک دور افتادہ مہاجر بستی میں بڑی تکلیف اور تنگدستی کی زندگی گزار رہی ہیں) بدھو کے متعلق انکشاف ہوا کہ یہ آ پا جان کے نوکر قطعی نہیں ہیں بلکہ ریڈیو کے ایک رکن ہیں (یہ اب ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ افسر ہیں اور کئی برس سے اقوام متحدہ نیو یارک میں تعینات ہیں) اور چاچا کے لیے پتہ چلا کہ اری یہ تو شوکت تھانوی ہیں۔



آئندہ برس میں ہم بچوں کے پروگرام کے زمرے سے نکل کر بیڈوں کے پروگرام میں شامل ہونے لگے اور کچھ تھوڑی بہت 'نوں' ماں بھی شروع کر دی۔ یعنی یہ کہ عورتوں کے پروگرام کے لیے ایک آدھ 'اسکٹ' تصنیف فرمایا۔ اسکول سے نکل کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچے۔ ریڈیو اسٹیشن کی فضا ویسی ری۔ ویسی سب جانے پچانے لوگ اور مانوس، گھریلو سامان۔ ان دنوں لکھنؤ ریڈیو کے ڈرامے خاصے کی چیز ہوتے تھے اور لاہور ریڈیو سے دوستانہ مقابلہ اور چٹھک رہتی تھی کیونکہ لاہور والوں کو بھی اپنے فن کاروں پر بہت ناز تھا۔ شاید اسی دوران میں شوکت تھانوی کسی فلم کہانی میں مکالمے لکھنے کے لیے لاہور چلے گئے اور اس کے کچھ عرصے بعد لکھنؤ واپس آ گئے۔

غائب اگست 1947 عیسوی کی ایک شام، ریڈیو اسٹیشن اجڑا اجڑا سا لگ رہا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کے کئی اسٹیشن نئے نئے ریڈیو پاکستان میں شامل ہو جانے کی وجہ سے تازہ انڈین لسز یکھت بے حد بلا اور مدقوق سا معلوم ہو رہا تھا۔ لکھنؤ سے سعیدہ رضا اور آل حسن پہلے ہی تبدیل ہو کر دہلی جا چکے تھے۔ بیشتر مسلمان اراکین لاہور، پشاور، ڈھاکہ اور کراچی روانہ ہو گئے تھے۔ گوہر سلطان، شہید جاوید اور عطیہ حبیب اللہ انگلستان جا چکی تھیں۔ وہ پرانا ماحول راتوں رات بدل سا گیا تھا۔ عرش منیر نے بتایا کہ جنگل کشور مہرہ، شیخ احمد سلمان میں تبدیل ہو کر پاکستان چلے گئے۔ شمشیر سنگھ بترہ بھی (شاید یہی نام تھا) سلیم شاہد ہو کر لاہور گئے۔ شوکت صاحب بھی لاہور میں ہیں اور معترب اپنے گھر والوں کو وہاں بلانے والے ہیں۔

اس کے فوراً بعد ہی لاہور سے 'پاکستان ہمارا ہے' کا پروگرام شروع ہو گیا جسے امتیاز علی تاج اور شوکت صاحب مرتب کرتے تھے۔ اس کے بعد 'قاضی جی' کا سلسلہ شروع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر شوکت صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ 1965 عیسوی میں ایک مرتبہ کرشنا آل حسن میرے ساتھ ریڈیو اسٹیشن گئی کیونکہ وہ آل حسن سے شوکت صاحب سے پرانی دوستی کی وجہ سے مرحوم سے خاص طور پر ملنا چاہتی تھی۔

شوکت صاحب ریڈیو انٹیشن کے پہلو والے کمرے میں اپنی میز پر بیٹھے تھے۔ کرشنا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے کہا "شوکت صاحب آپ کا وہ ترکہ اب تک نہیں ملا، ہم لوگ بے تابی سے اس کے منتظر ہیں۔"

قصہ یہ تھا کہ چند برس قبل صدیق احمد مدنی نے بتلایا تھا کہ شوکت صاحب کے ساتھ ایک بڑی ڈرامائی بات ہونے والی ہے، وہ یہ کہ ان کے ایک چچا انگلستان میں بس گئے تھے اور مشہور نٹلے اینڈ پارٹنر کمپنی کے ڈائریکٹر یا مالک یا جنے کیا، بہر حال بہت سخت کروڑ پتی ہو گئے تھے۔ انھوں نے لاہور وہاں انتقال کیا اور شوکت تھانوی ان کے واحد قانونی وارث ہیں اور عنقریب یہ لاکھوں پونڈ کا ورثہ حاصل کرنے کے لیے ولایت آنے والے ہیں۔ یہ واقعی اکساٹنگ بات تھی۔ ظاہر ہے کہ جب شوکت تھانوی ملک انگلستان کے ایک کروڑ پتی بن جائیں گے تو کلرک جو یا ڈورچسٹر میں رہا کریں گے۔ ایک آدھ کلوہ وغیرہ خرید لیں گے اور ایک عدد رولس راس تو لامحالہ رکھیں گے۔ تو ہم سب پر کیا لازم آیا؟ ہم سب پر یہ لازم آیا کہ ہم لوگ موصوف کو ابھی سے کٹنی دینٹ شروع کر دیں اور اعلیٰ ولایت پر ثابت کریں کہ شوکت تھانوی مدظلہ کے نہایت قریبی رشتے دار ہیں تاکہ موصوف کے ڈورچسٹر ہوٹل اور رولس راس کار وغیرہ سے ہم صوفیا کو بھی فیض حاصل ہو سکے۔

چنانچہ میں نے شوکت صاحب سے پوچھا کہ وہ ترکہ آپ کو اب تک کیوں نہیں ملا۔ ہم لوگ آخر کب تک انتظار کریں۔ واقعی میں نے کہا ہم مقبول انگریزی نادلوں میں پڑھا کرتے تھے کہ فلاں کا بیٹا آسٹریلیا میں بے اندازہ دولت چھوڑ کر مرا۔ یا افریقہ میں بیرے کی کانیں اپنے کسی دور افتادہ اور گمنام بھتیجے کے نام منتقل کر کے دوسری دنیا کو سدھارا۔ آپ کے چچا نے یہ روایت سچ کر دکھائی۔

شوکت صاحب نے جواب دیا کہ بھئی اس میں ایک شاخسانہ نکل آیا۔ اس ترکے کی لندن میں ایک انگریزی خاتون و عویدار پیدا ہو گئی ہیں اور انھوں نے وصیت کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اب میرے پاس اتنا پیسہ کہاں ہے کہ میں اتنا ہنگامہ مقدمہ لڑتا پھروں۔ لہذا میں نے اس کا

خیالی مچھوڑ دیا۔

اسی وقت ن.م.راشد آ گئے۔ جوان دنوں نند یارک میں قیامات تھے اور رخصت پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ اس سے قبل میں راشد صاحب سے نہیں ملی تھی۔ شوکت صاحب نے بڑی برجستگی سے میرا تعارف کرایا "یہ ریڈیو کی بیٹی ہیں۔" اور کرشنا کا تعارف کیا "یہ ریڈیو کی بہن ہیں۔" (یعنی آل حسن کے رشتے سے وہ ریڈیو کی بہن تھی!)

کل کی بات ہے کہ صدیق احمد صدیقی، شوکت صاحب کے کروڑ پتی ہونے کی بشارت دے رہے ہیں۔ کل ہی کی بات ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر محمود نظامی نہایت جوش و خروش اور نفاست سے مارچ کا سالانہ جشن موسیقی منعقد کر رہے ہیں اور شوکت صاحب باتوں کی پھلجھڑیاں مچھوڑتے ادھر ادھر ٹہل رہے ہیں۔ اسے لیجیے... آج نہ صدیق احمد صدیقی ہیں نہ محمود نظامی نہ شوکت تھانوی، کمال ہے واقعی۔

مجاز کے لطیفوں جتنے تو نہیں مگر شوکت صاحب کی بھی بہت سے لطائف و طرائف مشہور ہیں کہ کیسے انھوں نے انتہائی رنج و الم کے موقع پر اپنے ایک جیلے سے روٹوں کو ہٹا دیا۔ یا کسی بے ڈھب اور نازک صورت حال کو ایک برجستہ فقرے اور بذلہ نجی کے ذریعے خوبصورتی سے سنبھال لیا۔ لیکن اختر شیرانی، میراجی، منٹو اور مجاز کی مانند شوکت تھانوی ایک 'ردایت' کی صورت اختیار نہ کریں گے۔ ان چاروں فنکاروں کے برعکس شوکت صاحب ایک سیدھے سادے اور گھریلو سے آدی تھے۔ ان کے کردار میں جہاں تک میرا خیال ہے کوئی غیر معمولی پیچ و خم یا نفسیاتی الجھنیں نہ تھیں اور ایک سیدھے سادے آدمی کا 'لچنڈ' (Legend) یا حکایت میں تبدیل ہو جانا ذرا مشکل ہے۔ محض یہ بات کہ وہ پان کے از حد شوقین تھے، دیو مالا کے لیے کافی نہیں۔ دیو مالا کی تخلیق کے لیے مرحوم ادیب کو شراب یا کسی اور جان لیوا اور مہلک نشے کا مادی ہونا بھی ضروری ہے۔

شوکت تھانوی بے حد ہر دلعزیز تھے اور آج سے نہیں سو دہائی ریل کے زمانے سے اب

تک ان کی ہر لکھری میں اضافہ ہوتا آ رہا تھا۔ یہ مقبولیت انہیں دونوں ملک میں حاصل تھی۔ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں ان کی تصانیف کا ہندی میں ترجمہ ہوتا رہا ہے اور وہ ہندی واں طبقے میں بھی بہت مقبول تھے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ناول، افسانے، ڈرامے، اخبار کے کالم، ریڈیو پیپر، وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ ایک ایسے محکمے سے ان کا تعلق تھا جہاں ادیب کو اخبار نویس کی مانند متواتر لکھنا اور لکھتے رہنا پڑتا ہے، لکھنا ایک عادت ثانیہ اور میکا کئی عمل بن جاتا ہے۔

مگر اس زود لکھی کے باوجود شوکت صاحب کی زیادہ تحریروں جو وقتی موضوعات پر لکھی گئیں تھیں، اپنی فلسفگی اور برجستگی کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہوتی تھیں۔ سوائے روزنامہ جنگ کے اس کالم کے جو انہوں نے مجید لاہوری کے انتقال کے بعد لکھنا شروع کیا تھا اور جس میں آمد کے بجائے محض آورد ہوتی تھی۔

’عظیم فنکار، عظیم ناول نگار، عظیم شاعر، عظیم مزاح نگار‘ میں اس لفظ ’عظیم‘ کو بہت شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ عظمت کا فیصلہ صرف تاریخ کے ہاتھ میں ہے اور یہ سوال بہت بعد کا ہے کہ ادب کی تاریخ کس لکھنے والے کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے گی۔ ایسا بھی ہے کہ برناڈ شاہ مرنے کے فوراً بعد بھلا دیے گئے۔ دور کیوں جائیے خود ہمارے یہاں منٹو کے سلسلے میں جوش و خروش اب مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ بہت سے اچھے ادیب اپنے دور کے بعد مختلف وجوہ کی بنا پر محض ’DATED‘ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ عظیم بیک چٹائی کا آج وہ غلط نہیں رہا جو آج سے تیس سال قبل ’نیرنگ خیال‘ کے دور میں تھا۔ وقت اور تاریخ دونوں انتہائی ظالم اور ستم پیشہ ہیں۔ وقت کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتا، نہ وہ خود ستائی، گردہ بندی، سن ترا حاجی، جگمگ، نئی نسل بنام پرانی نسل، سنسنی خیزی یا فقرہ بازی کے چکر میں آتا ہے۔ آپ اپنے فن کے متعلق خود کہتے ہی مقالے لکھ لیجیے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پچاس برس کے الٹ پھیر کے بعد معلوم ہوگا کہ کس ادیب کی تخلیقات کا کتنا حصہ باقی بچ گیا اور کتنا زمانہ برباد ہو گیا۔ ادبی رواجوں، تنقید کی نکالوں، نظریاتی بحثوں اور وقتی مقبولیت سے بالاتر کوئی چیز ہے۔ ادیب کی اپنی صلاحیت اس کا فنی اور نظریاتی وزن اور Artistic Consistency جو اسے زندہ رکھتی ہے اور اس کے لیے وقت کی کسوٹی درکار ہے۔

ادب کی دنیا بڑی انوکھی دنیا ہے۔ میرے نزدیک سید ابوالحسین فرید آباد ایک بہت اچھے مزاج نگار ہیں۔ لیکن میں نے کسی تذکرے یا جائزے میں ان کا نام نہیں دیکھا۔ بلکہ بہت سے لوگ تو ان کی تحریروں ہی سے ناواقف ہوں گے۔ عظیم بیگ چٹائی بہت بڑے مزاج نگار تھے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا آج وہ اتنے مقبول نہیں رہے اور بعض اوقات بعض مکالمات ادبی شخصیتوں کو ڈسکور کر لیا جاتا ہے اور فراموش شدہ فنکاروں کی 'تجدید' بھی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مرزا رسوا اور نظیر اکبر آبادی کے ساتھ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی چیزیں جن کو ہم ادب عالیہ کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں، ان کی محض ایک دستاویزی حیثیت ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے 1963 عیسوی سے پہلے کا بیشتر نثری اور افسانوی ادب خاصاً نحیف تھا۔ لیکن شوکت تھانوی نے 'سودیشی ریل' اسی زمانے میں لکھی اور 'پطرس کے مضامین' بھی جیسی لکھے گئے۔ لہذا ہم قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کسی ایک دور میں صرف دوسرے دور کے ادب تخلیق کیا گیا۔ ادب کے ترقی یافتہ اور درخشندہ زمانوں یا 'تنزل پند' اور 'کمزور زمانوں' سے بڑے ادیب کا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنا کام کر کے چلا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے ادبی رواج، معاشرے اور قارئین کے تبدیل شدہ تقاضات، مزاج اور مذاق، یا بعض اوقات چند نقادوں کی نظر کرم اور مبالغہ آمیز تعریف یا نقادوں کا عتاب، یا لاعلمی یا جہالت، تعصب یا بے نیازی، یہ ساری چیزیں مل کر ایک وقفے کے لیے کسی ایک ادبی شخصیت کو یا آسمان پر چڑھا دیتی ہیں یا پاتال میں گرا دیتی ہیں۔ مگر بات وہی رہتی ہے۔ اگر اس لکھنے والے میں کوئی 'چیز' تھی تو وہ وقت گزر جانے پر بھی زندہ رہے گا اور ہملا دیے جانے کے بعد پھر یاد کیا جائے گا۔

لہذا میں شوکت صاحب کے متعلق یہ حکم لگانے کا کوئی حق نہیں رکھتی کہ وہ کس قدر عظیم طرافت نگار تھے اور کتنے بلند پایہ فنکار تھے اور ان کا مزاجی ادب زندگی کی کن اعلیٰ ترین قدروں کا حامل تھا، وغیرہ وغیرہ۔ میں بحیثیت ایک قاری کے اتنا جانتی ہوں کہ زندگی کا بھرپور احساس اور ایک لطیف اور مہذب طرافت ان کی تحریروں میں جاری و ساری تھی۔ ایک اچھی طرافت نگاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ روزمرہ کے معمولی واقعات میں زندگی کے بے شکے پن اور بدصورتی اور الیے

میں، صورت حالات کی شدید معقولیت میں، لغویت کا رخ دیکھ لے اور اس پر فہم اور ہنسائے۔  
 اچھا مزاج نگار زور سے تہمت نہیں لگاتا صرف سکراتا رہتا ہے۔ وہ پھکا اور سو قیامت باتوں یا محض ضلع  
 جگت یا چند بندے کے جملوں یا چند STOCK مسخرے کرداروں کی بھراوے سے مزاح پیدا نہیں  
 کرتا، وہ زندگی کی گھسان میں اتر کر زندگی کا مضحک پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے شوکت  
 قحانوی کی تحریروں میں ہلکی مٹکی یا خالص نمبرے پن کے اجڑال کے بجائے محض مزاح کی قشقی  
 ملتی ہے۔ یہ فرحت بخش طراوت بکھرتی، خوش طبعی، ذہین زندہ دلی، پر مذاق اور لطیف فقرہوں اور  
 الفاظ کے گیس اور مہذب استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور شوکت قحانوی ہمیشہ اک مہذب طراوت  
 نگار ہے۔ یہی تہذیب اور متانت ہمیں رشید احمد صدیقی کے یہاں ایک بہت اونچی اور فلسفیانہ سطح  
 پر ملتی ہے۔

شوکت قحانوی اپنی زندگی میں ایک طویل عرصے تک اپنے الفاظ اور اپنی آواز کے  
 ذریعے لاکھوں انسانوں کو جہانے رہے اور اس روٹی بسورتی اعصاب زدہ دنیا میں اگر کوئی انسان  
 اپنی فطری قشقی کے ذریعے دوسروں کو تھوڑی دیر کے لیے محفوظ اور بتائش کر سکے تو ہمیں اس کا  
 شکر گزار ہونا چاہیے۔

کوئی دوسرے شوکت قحانوی اب دنیا میں نہیں آئیں گے۔

## دیار فرنگ میں ایک فرنگی

(صدیق احمد صدیقی)

آج صبح ڈان اخبار میں ایک سرخی پر نظر پڑی لندن میں اردو ادیب کا انتقال۔ آگے پڑھا... صدیق احمد صدیقی... دوبارہ غور سے پڑھا... صدیق احمد صدیقی....  
صدیق احمد صدیقی کا اچانک ہارٹ ٹل سے انتقال ہو گیا۔ یعنی آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بچپن میں...؟ ظہر ہے۔ ذرا ہم سب کچھ دیر چکے بیٹھ کر اپنے دل و دماغ کا اس خبر سے سمجھوتہ کر لیں۔

لیکن نیے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو بچپن کا خط آیا تھا جس میں حسب معمول انھوں نے اپنے مخصوص منفرد انداز میں ادھر ادھر کی کہیں کہیں تھیں۔ کل ہی اعجاز سے بچپن کا تذکرہ ہوا تھا۔ بچپن کا خط کبھی کبھار لندن سے آ جاتا تھا تو تمہارے سب سے بڑے تھے۔ بیٹہ کران کی باتیں کی جاتی تھیں۔ بچپن لندن میں تھے۔ ان کے ساتھی ساری دنیا میں بکھرے ہوئے تھے۔  
(بچپن کے لیے اب صیف ماضی استعمال کیا جا رہا ہے۔)

12 ستمبر کی شام تک وہ ہم لوگوں میں، یعنی ان انسانوں میں جو ابھی زندہ ہیں، مستقبل کے متعلق سوچتے ہیں، اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں، شامل تھے۔ 12 ستمبر کی شام کو ڈان اخبار نے لکھا ہے وہ دفتر سے گھر واپس جا رہے تھے اور بس میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لندن کی سرخ ڈیل ڈیکر میں جس کے ذریعے وہ پچھلے برسوں میں ہزاروں مرتبہ شام کو اسی طرح اسٹوڈیوز سے گھر گئے۔ ان کا خاتمہ ہو گیا۔ اللہ اکبر۔

چچا کس طرح ہو گئے۔ مرتے ہوئے انھوں نے یہ نہ سوچا کہ یہ کیا سفر ہوا کر رہے ہیں۔ ان کی نرالی حس کا سب لوہا مانتے تھے مگر نرالی حس کو اس حد تک پہنچانا بھی سخت زیادتی ہے۔ چچا نے ہم سب کے ساتھ بڑی چار سو میسج کی۔ انھوں نے اتنی جلدی مر کے ہم سب کو ابھا Down کیا۔

چچا کا خیال رہا ہو گا کباب میں مر رہا ہوں، اب سب میرے رعب میں آ جائیں گے کہ دیکھو میں نے کائنات کا سب سے بڑا معرکہ سر کر لیا۔ دیکھ لیجئے جناب عالی، میں مر سکتا ہوں۔ یعنی میں اس جسم کی حرکت کر سکتا ہوں کباب تک جو آپ میں سے کسی کو نہیں سوجھی۔ حالانکہ آپ سب ایک سے ایک افلاطون بنے پھرتے ہیں۔

مگر چچا نے مر کر کون تیر مار لیا۔ بھی مرتے ہیں۔ انھوں نے زندہ رہ کر ہی کون تیر مار لیا تھا۔ ہم سب زندہ ہیں تو ہم کون کمال دکھا رہے ہیں۔ ہم جو اس قدر زندگی اور زندگی کے مقاصد اور مسرت کی تلاش اور آدرشوں کی تکمیل کے متعلق جانے کیا کیا الم ظلم ہانکا کرتے ہیں۔ چچا خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں اسی طرح ہانکتے تھے۔ مگر 12 ستمبر کی شام کو انتقال فرما کے انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ہم سب سے تیز نکلے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ زندگی جو ہم سب کو اس قدر عزیز ہے، دنیا اس کی دلچسپیاں، خوشیاں، یادیں، ارادے، تمنائیں، اپنے دوسرے اور اپنے عزیز سب قطعی لایعنی ہیں۔ اصلیت محض یہ ہے کہ موت کسی وقت بھی ٹپکتی ہوئی ہماری طرف آنکلتی ہے اور ہمارا خاتمہ ہو جاتا ہے اس میں حضور والا نہ کوئی فلسفہ ہے نہ مابعد الطبیعیات، سیاست، ادب، شاعری، دولت، گھربار، کتابیں، مضامین، علم، سب چیزیں بکواس ہیں۔



مہابھارت میں لکھا ہے کہ دھرم نے جو بچے کے روپ میں نمودار ہوا تھا، یہ ہشتر سے پوچھا کہ اس حیرت انگیز دنیا میں سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز کیا ہے؟  
یہ ہشتر نے جواب دیا... وہ چیز یہ ہے کہ انسان اپنے آس پاس کے دوسرے انسانوں کو مرتے دیکھتا ہے مگر اسے یہی یقین رہتا ہے کہ وہ خود کبھی نہیں مرے گا۔ یہی دنیا کی سب سے حیرت انگیز چیز ہے۔

چچا مر گئے لیکن ہم ان کی موت کو اہل حقیقت محسوس کرنے کے بعد بھی مطمئن ہیں کہ ہم نہیں مریں گے۔

جس روز میں انگلستان سے کراچی کے لیے روانہ ہو رہی تھی چچا مجھے بوٹ ٹرین پر سوار کرانے کے لیے آئے تھے۔ پلیٹ فارم پر خدا حافظ کہنے والوں کا مجمع تھا۔ کافی بلا ہو رہا تھا۔ کوئی خاتون اپنے گھر والوں تک پہنچانے کے لیے مجھے لیے چوڑے پیغام ذہن نشین کر رہی تھی، کوئی صاحب بہت سے ٹرک میرے ساتھ بھجوا رہے تھے۔ اس کی ہنگ کے سلسلے میں کنفیوژن پھیل رہا تھا۔ سب پر (میرے سمیت) شدید رقت طاری تھی۔ جس وقت بوٹ ٹرین چھٹنے والی تھی چچا برساتی پہنچے ہوئے بھاگ بھاگ پلیٹ فارم پر پہنچے۔ ان کو پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے نکلے نکلے دیر ہو گئی تھی اور وہ بہت تیز رفتاری سے اسٹیشن تک پہنچے تھے کہ ٹرین نکل نہ جائے۔ اس ہنگامے میں ان سے زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ اچھا بیٹا خدا حافظ۔ انھوں نے کہا خدا حافظ... خدا حافظ چچا... میں نے جلدی سے جواب دیا اور ٹرین میں سوار ہو گئی۔ وہ فیروز جیس اور شیب کرمی اور راز بھائی اور حسن بھائی اور نسیم مہمانی اور تقی سید اور دوسرے لوگوں کے ساتھ پلیٹ فارم کے مجمع میں کھڑے رہ گئے۔ ٹرین روانہ ہو گئی۔ اس وقت میرے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہ تھی کہ یہ چچا سے آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد ان کی صورت کبھی نظر نہ آئے گی۔

چچا میرے ساتھ بڑے بھائیوں کی ایسی شفقت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ وہ علی گڑھ میں میرے بھائیوں سید ظہیر الدین حیدر اور سید جواد حیدر کے ہم جماعت رہ چکے تھے اور ان کے بے حد عزیز دوست تھے۔ ان کے جیسا اخلاق اور اخلاص اور رکھ رکھاؤ آج کل کی دنیا میں

تقریباً مفقود ہے۔ چچا پرانے تھمن، پرانی وضع داری اور کلچر کا مکمل اور دلاؤیز نمونہ تھے۔ چچا صحیح معنوں میں مہذب تھے۔ وہ پرانے لکھنؤ اور پرانے ہندوستان کے تھمن کے ان نمائندوں میں سے تھے جو اب تو خال خال ہی نظر آتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد صفحہ ہستی سے بالکل ہی مٹ جائیں گے۔ نہ معلوم چچا کو چچا کس نے کہا شروع کیا۔ یہ لقب غالباً علی گڑھ کے زمانے کی یادگار تھا جہاں وہ 1922 عیسوی سے 1939 عیسوی تک رہے تھے۔ چچا علی گڑھ کی زندہ ولی اور بیشاش اور ذہانت اور مجلس آرائی کی روایتوں کے بہترین مثال تھے۔ ان کے جانے سے علی گڑھ کا ایک اور ستون گر گیا۔

میں نے ایک مرتبہ ان کے لیے لکھا تھا کہ چچا اپنی ذات سے انجمن ہیں۔ ان کے ان محنت حیرت انگیز اور دلکش پہلو تھے۔ مگر مجموعی طور پر ان کے کردار کی تشریح کے لیے اس سے بہتر جملہ اور کوئی نہیں مل سکتا۔

چچا اس کلچر کی پیداوار تھے جس میں فن گفتگو اور آداب محفل کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ چچا بھی فن گفتگو کے ماہر تھے۔ ان کی ایسی دلچسپ باتیں کرنے والے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ ان کی خوش فطرتی، عظیم الطبعی، علیت، حاضر جوابی، انکسار، شرافت نفس، نزالی حس، سنجیدگی، اعتدال و سادگی ذہانت، کس کس بات کو یاد کیا جائے۔

لندن میں صدیقی احمد صدیقی جگت چچا تھے اور بی بی سی کی پاکستانی اور ہندوستانی برادری کے گرو۔ ہر ایک ان کے پاس اپنے اپنے پر اہم لے کر آتا اور چچا بیٹھے سب کے مسائل حل کیا کرتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اتنی بڑی دنیا میں چچا کا دشمن کوئی بھی نہ تھا۔ ان محنت لوگوں کی بچانے مدد کی اور آڑے وقت میں کام آئے۔ ہر کاہل ذکر Conversationalist کے ساتھ یہ ٹریجنڈی ہوتی ہے کہ اس کی باتیں اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کو بعد میں ری پروڈیوس نہیں کیا جاسکتا اور اگر ان باتوں کو یادداشت کے بھروسے پر قلمبند کر بھی لیا جائے، ان کے لطیفے اور ہر جت مکالمے دہرائے جائیں تو وہ بات نہیں بنتی۔ چچا نے بھی اپنی ساری جودت طبع باتوں میں ضائع کر دی اور ان کی مجلس آرائی کا ان کے دم کے ساتھ خاتمہ ہو گیا۔ چچا جس وقت اپنے

دوستوں میں بیٹھ کر چپکے تھے، اگر ان کی باتوں کو فرض کیجیے ٹیپ ریکارڈ کر لیا جاتا تو یقین فرمائیے تنقید، فلسفی، سیاست، ادبیات اور طنز و مزاح کی کتابیں تیار ہو سکتی تھیں۔

چچا اپنی زندگی میں بہت کچھ کرنے کے اہل تھے۔ مگر انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ بس بی بی سی کے پروگرام براڈ کاسٹ کرنے اور دوستوں سے گیمیں ہانکنے میں مگن رہے اور ایک روز خاموشی سے ختم ہو گئے۔ ہلکے پھلکے دنیا میں زندگی گزار دی۔ دوسروں کو اپنی سنور شخصیت سے سرور کیا اور ہلکے پھلکے کسی کو دکھ تکلیف پہنچائے بغیر دنیا سے چلے گئے۔ اس ستم ظریفی کا جواب نہیں۔ چچا، آپ نے مرکز ہم سب پر سخت ایکٹیوٹی کی۔

چچا کے ان محنت دوست تھے۔ ان لوگوں نے الگ الگ یہ خبر جب سنی ہوگی تو ان پر کیا گزری ہوگی۔ انور اور غزالہ کو یہ خبر ملی گڑھ میں ملی ہوگی۔ عطیہ حبیب اللہ (چچا کی عزیز عطیہ بہن) کو کس قدر صدمہ ہوا ہوگا۔ امینہ احمد (جواب سزا شنوا ہو چکے ہیں) کو یہ روح فرسا اطلاع ماسکوں میں ملے گی۔ ماجد امریکہ میں ہیں جلال اور اعجاز اور الطاف گوہر پاکستان میں ہیں اور نہ جانے کتنے ان محنت لوگ ہیں جو ان کے لیے رو رہے ہوں گے۔ چچا ان سب کو خدا حافظ کہے بغیر لندن کے ایک قبرستان میں جا لینے۔

چچا نے 22 اگست 1958 کو جو خط مجھے لکھا تھا (عالمیہ ان کا آخری خط تھا جو انھوں نے کسی کو لکھا) میں نے اپنی ایک دوست فیروز جہیں کا جو لندن میں رہتی ہے اور عرصے سے اس کی خبر خیر معلوم نہیں ہوئی تھی، چچا سے پتہ منگوایا تھا۔ اس کے جواب میں انھوں نے اس خط میں لکھا۔۔۔ ”کل ایک صاحب سے پتہ معلوم ہو گیا وہ لکھے دیتا ہوں مگر یہ بھی کوئی تین چار مہینے کا پرانا ہے۔ اگر اب بدل گیا ہو تو اسے بھی لندن میں ہم کالٹینوں کی بے سنگر زندگی کا کرشمہ سمجھو۔“

”اب میرے کام کی بات سنو۔ تمہارا دفتر یا شاید امریکنوں کا دفتر سنا ہے کتابیں لکھواتا ہے، ترجمے کرواتا ہے (تو بھر دانا تو ختم ہو گیا!) اور ادب کی خدمت کرواتا ہے کیا میرا نام کسی رزق کے دانے پر اس سلسلے میں تم کو لکھا ہوا تو نہیں ملا؟ اگر نہ ملا ہو تو لکھوادو۔ شان صاحب سے کہو کہ وہ پیام نہ سکی آپ کے ارمغان کلام کا تو اب بھی سستی ہوں۔“

ممکن ہے کچھ عرصہ بعد پاکستان آتا ہو۔ امیدیں بہر حال بندگی ہوئی ہیں۔“  
اس کے ٹھیک دس روز بعد آپ نے انتقال کیا۔

پچھلے چند سال سے میرا یہ طریقہ ہو گیا تھا کہ لندن جانے والے خواتین و حضرات جو وہاں کے دوران قیام میں مزید پاؤں کمانا چاہتے تھے، سیدھے میرے پاس آتے تھے کہ ہمیں بی بی سی پروگرام دلوادیتے اور میں ٹرینٹ چچا کے نام ایک سفارشی چٹھی لکھ دیتی تھی کہ یہ صاحب یا صاحبہ جو آپ سے ملنے آ رہے ہیں، ان سے بہتر اسکرپٹ لکھنے والا آپ کو روئے زمین پر دستیاب نہ ہوگا۔ نہ معلوم بے چارے چچا ان سب سے وہاں کس طرح پہنچتے ہوں گے۔

یہ خط پڑھنے کے بعد میں نے اچھا سے کہا تھا کہ چچا خوش نہیں ہیں۔ لیکن اس وقت ہم میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ چچا اس دن کے اندر اندر مر بھی جائیں گے۔

وہ علی گڑھ سے 1948 عیسوی میں پاکستان آ گئے تھے۔ یہاں برٹش انفارمیشن سروسز میں ملازم ہو گئے تھے اور اگلے سال بی بی سی چلے گئے۔ ان کو بی بی سی میں مستقل ملازمت مل گئی تھی۔ اور بظاہر بہت خوش تھے۔ ہندستان سے منہ موڑ کر یار لوگوں نے دوسرا وطن ڈھونڈا تھا جو گویا خوابوں کا دلیس تھا۔ بڑی بڑی امیدیں لے کر آئے تھے۔ اب یہاں سے کہاں جائیں۔ ہر ایک کے بس کی بات تو نہیں تھی کہ امریکہ یا کینیڈا یا انگلستان جائیں۔ یا سویٹزر لینڈ کے چیمکوں میں اکاؤنٹ کھول لیں۔ بہر حال، چچا کو انگلستان میں اچھی ملازمت مل گئی۔ وہاں انھوں نے مکان خرید لیا تھا۔ اپنے بی بی بیچوں کو بلا لیا تھا اور بی بی سی کے پروگرام کرتے تھے۔

چچا خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتے رہے۔ جلاوطنوں کی بے فکر زندگی۔ اور بہت جلد اس سے بور ہو کر دوسری دنیا کو روانہ ہو گئے۔

دوسری دنیا سب گپ ہے۔ دوسری دنیا محض قبرستان کا ایک کونہ ہے جس میں ایک گڑھا کھود کر انسان کو دفن کر دیا جاتا ہے اور اس پر نام کا کتبہ لگا دیا جاتا ہے۔ مٹی میں انسان دفن ہو جاتا ہے اور یہ اصل حقیقت ہے۔ مٹی اور تہائی اور اندھیرا۔ یہ اصل سہیہ ہے یہاں پہنچ کر وقت اور ابدیت اور فنا اور بھلا اور حیات بعد الموت سب بے معنی ہو جاتا ہے۔ سب الفاظ کا ظلم ہے۔ سب

صریحاً گپ ہے۔

چچا فرنگی محل کے ملا کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ حافظ قرآن تھے۔ علوم اسلامی اور فقہ پر چچا کی معلومات بے حد وسیع تھیں۔ بین الاقوامی سیاست پر ان کی رائے متوازن اور چمکی مٹی ہوئی تھی۔ دنیا کے مستقبل کے بارے میں ان کا Perspective کمال کا تھا۔ تاریخ کے متعلق وہ اکثر کہتے تھے کہ اس کی Process کو ہم سمجھ نہیں پائے اور اب تاریخ ہمیں چھوڑ کر آگے نکل گئی ہے۔ چچا صحیح معنوں میں ترقی پسند تھے (گو قلمی ان کو اٹھارویں صدی کا لبرل انگریز کہتے تھے)۔ اردو ادب کے بہت بڑے عمدہ نقاد تھے۔ کابلی کے مارے کبھی سنجیدگی سے لکھ کر نہ دیا۔ آٹھ سال تک متواتر انھوں نے جو پروگرام لکھ کر نشر کیے اس میں سے بہت سی چیزیں ایسی نکل آئیں گی موضوع کے تنوع اور طرز بیان کی بنا پر جن کی مستقل ادبی حیثیت ہے۔ یہ ان کے دوستوں کا فرض ہے کہ وہ ان چیزوں کو جمع کر کے شائع کریں۔

چچا بہت کچھ تھے اور اب کچھ نہیں۔ صرف ایک نام ہے جس کا کتبہ لندن کے بڑوک وڈو مسلم قبرستان کی ایک نئی قبر پر لگا دیا جائے گا۔

میں بے حد خوش تھی کہ میرا پانا ناول 'آگ کا دریا' جب چھپ کر آئے گا تو چچا کو بھیجوں گی۔ اس کے چند ابواب کا پس منظر لندن ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر وہ بے حد محظوظ ہوتے کیونکہ اس کے چند کردار چچا کے جانے پہچانے لوگ تھے اور سب سے زیادہ کڑی تنقید بھی آپ ہی فرماتے۔

چچا میری 'ادبی اہمیت' کے قطعی قائل نہ تھے۔ 'جلاوطن' کی اشاعت پر کسی کو بتایا وہ یہ افسانہ پڑھ کر روئے۔

کیونکہ وہ خود بھی جلاوطن تھے۔ وہ اس مخصوص معاشرتی اور ذہنی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے جس کی بری بھلی عکاسی میں اپنی تحریروں میں کرنے میں کوشاں رہتی ہوں۔ اس وقت میں سوچتی ہوں۔ ان کی بی بی غوثیہ کا کیا حال ہوگا۔ ان کے بچے، ان کے چہیتے دوست یا در عباس، اور قلمی سید یہ دونوں کیا کر رہے ہوں گے۔

ہم ہی یہاں کیا کر رہے ہیں۔ انسان مر جاتا ہے تو باقی انسان کیا کرتے ہیں، مرے سے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے رونے یا مرحوم کی خوبوں کو یاد کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ موت تو موت ہی رہتی ہے۔ جب میں چچا کے پروگراموں کے لیے عین براؤ کاسٹ سے چند دن قبل جلدی جلدی اسکرپٹ لکھتی تھی اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ بہت جلد وہ دن بھی آئے گا جب میں ان کی موت کی خبر سن کر مضمون لکھوں گی۔

چچا اب بالکل اپنا وقت برباد کر رہے تھے۔ کئی مرتبہ فیروز نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے، خدا کے لیے چچا اپنا وقت بے کاری کی مپاسنگ میں ضائع کرنے کے بجائے لندن یونیورسٹی میں ریسرچ شروع کر دیجیے۔ بیٹھے بٹھائے ڈاکٹریٹ لے لیجیے، کچھ تحقیقی کام کیجیے۔ آپ بہت زور و شور سے کہتے ہاں ہاں میرا ارادہ ہے کہ بس نظیر اکبر آبادی پر ریسرچ کر ڈالوں۔ ایک دفعہ فیروز نے کہا چلیے آپ سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ میں آپ کے لیے کتابوں کی فہرست بنا کے لاتی ہوں۔ آپ للٹلے کام جمیدگی سے شروع کر دیجیے۔ مگر چچا کا یہ ارادہ بس ارادہ ہی رہا۔ ان کو تو دن بھر کینٹین میں بیٹھ کر دنیا جہان کی باتوں پر رائے زنی ہی سے فرصت نہ تھی اور لوگ دیکھ کر کہتے کیا باغ و بہار آدمی ہے۔ واہ۔ واہ۔

چچا نے کس دل سے دنیا کو چھوڑا ہوگا۔ ان کا بھرا پراگھر عزیز بیوی، پانچ لاڈلے بیٹے، احباب کا وسیع حلقہ لندن کی رنگارنگ معاشرتی تہیں۔ مگر جس وقت وہ بس میں ہارٹ ٹیل سے مرے ان کو یہ قہور اسی معلوم ہوا ہوگا کہ ان کی موت کی گھڑی آن پہنچی۔

چچا بیٹھے بیٹھے بعض مرتبہ کہتے۔ بھائی کوئی ایسی بات کرو جا کر دل میں ٹن سے لگے... ان کا یہ جملہ بہت مقبول ہو گیا تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے بے حد جمیدگی سے میرے سامنے یہ اسکیم پیش کی۔ پاکستان کے بڑے سولہ ٹاؤں اور بیروں کی سڑکی پھونگیں چھوٹے چھوٹے غباروں میں بند کی جائیں اور ان کو بچا جائے تو بڑی اچھی بزنس ہو سکتی ہے۔ مثلاً احتشام الحق کے دم کا غبار وہس روپے میں۔ چھوٹے سولہ ٹاؤں کے غبارے پانچ روپے سے چار آنے تک قیمتیں رکھی جائیں۔ اب جس کو جہاز پھونک

کی ضرورت ہوئی یا سر بیض کو پانی دم کیا ہوا پلانا منکھور ہوا فوراً حسب ضرورت مولانا کا غبارہ لگاس  
پر چھوڑ دیا۔ پچاس اسکیم کے بارے میں بے حد عجیدہ تھے۔

محرم کے زمانے میں ایک مرتبہ بمبئی کے ایک شیعہ صاحب اسٹوڈیوز شریف لائے۔  
ہمارے یہاں مجلس ہے، چل کر پڑھ دیجیے۔ آپ فوراً تیار ہو گئے۔ فرمایا کہ یہاں خاص الخاص تین  
لکھنؤ کے شیعہ موجود ہیں یا در عباس جو میر انیس کے نواسے ہیں۔ لہذا ان سے بہتر ذاکر اور کون  
ہوگا۔ دوسری مس حیدر کہ ان کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ کس قیامت کی مرثیہ خوانی کرتی ہوں گی  
اور تیسرا میں خود...! ان سے وعدہ کر لیا کہ ہم تینوں مستند شیعیاں علی آپ کے یہاں حاضر ہو کر  
معرکے کی مجلس پڑھیں گے۔ ان سے کوئی بعید نہیں تھا کہ ایسا کر بیٹھے اور میرا اور یا در عباس کا  
جانے کیا حشر ہوتا۔ مگر بہت سمجھا بھجا کر ان کو اس ارادے سے باز رکھا۔ وہ تو تلے بیٹھے تھے کہ ایسی  
مجلس پڑھی جائے کہ لندن میں فحش پڑ جائے۔

کھانا بہت عمدہ پکاتے تھے۔ خصوصاً کھڑے معالے کا قیرہ بھوننے کے آپ ایک سپرٹ  
تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اپنے یہاں ذرا بڑی دعوت کی تو آپ بطور خاص قیرہ بھوننے کے لیے  
تشریف لائے اور کافی مجھے ڈانٹا پہنکارا کہ آپ بہت خراب کھانا پکاتی ہیں۔ جید باورچیوں کی  
طرح سب پر رعب جمایا، فلاں چیز لاؤ، اور فلاں سالہ کہاں ہے۔

ملکہ میری کا دیبانت ہوا تو میں اور چچا بھگم بھاگ ویسٹ منسٹر ایپے پہنچے۔ مجھے اپنے  
اخبار کے لیے رپورٹنگ کرنا تھی اور چچا کنٹری کرنے والے تھے۔ کنٹری سے پہلے آپ ذرا چند  
لمحوں کے لیے آنکھ بند کر کے بیٹھ جاتے اور پھر بولنا شروع کر دیتے اور لکھنؤ کی نکسالی اور گفت و  
ارد کے دریا بہا دیتے۔ مجھے اب تک یاد ہے زبردستی کی رقت طاری کر کے (کیونکہ ملکہ میری کے  
انتقال کے موقع پر رقت ذرا مشکل ہی سے طاری ہو سکتی تھی) انھوں نے جنازے کا آنکھوں دیکھا  
حال نشر کرتے ہوئے کنٹری کو اس شعر پر ختم کیا:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے نسیم

تو نے وہ صبح ہائے گراں مایہ کیا کیے!

11 ستمبر 1948 عیسوی کو چچا نے قائد اعظم کے جنازے کی نہایت موثر کنسٹری کراچی ریلوے سے نشر کی تھی۔ 11 دسمبر 1958 عیسوی کے تیسرے پہر کو انھوں نے قائد اعظم کی دسویں برسی کا خاص پروگرام بی بی سی سے نشر کیا اور اس کے بعد اسٹوڈیو سے باہر نکلے اور ڈاکٹر کے پاس گئے۔ وہاں سے ان کو اپنا الیکٹروکارڈیوگرام لیتا تھا۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ تم بالکل اچھے ہو اور ابھی بہت دن زندہ رہو گے۔ مطب سے نکل کر گھر جانے والی بس میں سوار ہوئے اور ڈبل ڈیکر کی اوپر کی منزل پر سب سے آگے والی سیٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ بس منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ ایک ایک کر کے سارے مسافر اتر چکے تھے اور بس بالکل خالی ہو گئی تھی۔ کنڈکٹر نے اوپر آ کر دیکھا کہ ایک آدمی سب سے آگلی سیٹ پر ذرا آگے جھکا ہوا چپکا بیٹھا ہے۔

وہ چچا تھے جن کا چلتی بس میں خاموشی سے انتقال ہو گیا اور کسی کو پتہ نہ چلا۔ وہ جانے کب سے اس طرح بیٹھے تھے۔

اب اس خاک سے جس میں ان کو لٹا دیا گیا ہے منجھائے گراں مایہ کے متعلق سوال کرنے کون جائے؟

چچا، ہم سب خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہے ہیں، ہم سب اٹھائی گھرے ہیں۔ ہماری پوری نسل ہماری زندگیاں اپنا محور کھو چکی ہیں۔ ہم مارے مارے پھرتے ہیں۔ تاریخ نے ہمارے ساتھ دھوکہ بازی کی ہے۔ ہم اپنے اپنے مسیہدن کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آپ نے مسیہدن کی تلاش بھی شاید ختم کر دی تھی۔ آپ دنیا میں اپنا کام نپا چکے تھے۔ آپ اپنے پیچھے اپنے رفیقوں کے آنسو اور اپنی خوشگوار یادیں چھوڑے جا رہے ہیں جو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔

(’کارواں‘، کراچی، مئی 1959 اور ’جائزہ‘، اگست 1959 میں شائع ہوا)



## پکچر گیلری کی ایک تصویر

(شاہد احمد دہلوی)

بہت سی یادیں مجھے ایک ڈیجیٹل فوٹو 'Interior' انٹیریئر کی مانند بڑے سے سنہرے فریم کے اندر موجود لگتی ہیں۔ اسی قسم کا ایک 'انٹیریئر' دہرہ دون کے ایک مکان کے ایک کونے والے سٹنگ روم کا ہے (جس کے باہر کا منظر بھی کسی پکچر پوسٹ کارڈ کے ولایتی لینڈ اسکیپ کا سا تھا)۔ یہ سٹنگ روم جازوں کی دھوپ سے دن بھر روشن رہتا اور کسی میس ڈیج 'انٹیریئر' کے مانند اس میں براؤسنر سے، مینالی ہیز اور نیلے اور زرد رنگ مدھم مدھم جگمگاتے۔ یہ اماں کا کمرہ نشست تھا اور اس میں ایک وسطی میز پر رنگین سرورق والے رسالوں کا انبار پڑا رہتا تھا۔ ان ہی رسالوں میں ایک ساقی کا خاص نمبر شامل تھا جس میں 'فاؤسٹ' شائع ہوا تھا۔ مترجم: شاہد احمد دہلوی۔ اکثر میں ادھر ادھر سے کھیلتے کودتے اس کمرے میں آتے اور ان باتصویر رسالوں کی ورق گردانی کر لیا کرتی۔ ان میں سے ساقی کا یہ فاؤسٹ والا پرچہ اچھی طرح یاد ہے۔ اسے پڑھا بھی۔ گو کچھ زیادہ لمبے نہیں پڑا۔ یہ غالباً 1937 عیسوی کی بات ہے۔

اس کے بعد 'ساقی' کا ایک اور خاص نمبر یاد آتا ہے: فیض آباد روڈ، لکھنؤ۔ دو سال بعد میں بھوپن موہیہ صاحب فرمائش تھی۔ یہ بھی سردیوں کا موسم تھا۔ 'پھول' اخبار باضابطہ پڑھتی تھی مگر دل اب بڑوں کے رسالوں میں زیادہ لگنے لگا تھا۔ اسی زمانے میں جب 'موہیہ' پور ہاتھ 'ساقی' میں دانتے کا 'جنم' ملاحظہ فرمایا۔ اس کا سرخ اور زرد سرورق اور اندر کی تصاویر اب تک یاد ہیں۔ مترجم شاہد احمد دہلوی جو تھے۔ یہ کافی مالوس نام تھا۔

بات یہ تھی دراصل کہ دتی والوں، لاہور والوں، لکھنؤ والوں کی بڑی پارونق دنیا تھیں والدین کے احباب اور بزرگوں اور عزیزوں کے دم قدم سے آباد اور ایک دوسرے سے منسلک تھیں۔ اسی طرح تیرنگ خیال، محنت، ساقی، ہمایوں وغیرہ کے پس منظر میں بڑی تہہ در تہہ وسیع تہذیبی کائنات موجود تھی۔ گویا لاتنا ہی پکچر گیلریاں۔ اس تہذیبی کائنات اور اس معاشرے کی معنویت اور اہمیت سے وہی لوگ واقف ہو سکتے ہیں جنہوں نے کچھلی جنگ عظیم سے فوراً قبل کے چند برسوں میں ہوش سنبھالا۔ اس زمانے کے بچے اور سیاسی اور ادبی تحریکیں ساتھ ساتھ پروان چڑھ رہی تھیں۔

1943 عیسوی میں الام جان کے انتقال کے بعد ہم لوگ دہلی چلے گئے اور وہاں چچا مشتاق احمد زابدی مرحوم کے ہاں قردل باغ میں ٹھہرے۔ چچا کے ہاں مجھے 'پھول' اور 'بنات' کی حدود سے نکل کر بڑوں کے رسالوں میں لکھنے کا شوق چرایا۔ چنانچہ ایک افسانہ لکھ کر چچا کو دکھایا۔ انہوں نے فوراً کہا اسے 'ادیب' میں بھیج دو۔ (یہ رسالہ فصیح الدین احمد صاحب مرحوم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا) مگر اپنے نام سے بھیجنے کی ہمت نہ پڑی۔ کچھ بڑی جھینپ سی آئی کہ لوگوں کو یقین ہی نہ آئے گا کہ ہم نے کہانی لکھی ہے۔ چنانچہ چچا کی تجویز پر لالہ رخ کے نام سے وہ کہانی 'ادیب' کو بھیجی اور وہ فوراً شائع ہو گئی۔ اب دوسری لکھنی لازمی تھی۔ وہ اپنے نام سے 'ہمایوں' میں بھیجی۔ وہ بھی چھپ گئی۔ لہذا تیسرا افسانہ لکھنا طے شدہ بات تھی۔ یہ افسانہ میں نے چچا زابدی کے کہنے پر شاہد صاحب کو بھیجا۔

جواب میں ان کا بے حد منت افزا اور تعریف کا خط آیا۔ اور یہ بھی لکھا کہ آپ 'ساقی' میں

برابر لکھتی رہی۔

بہت ممکن تھا کہ Teenage Hobby کی حیثیت سے تھوڑے بہت افسانے لکھ کر چھوڑ دی جی مگر شاہد احمد صاحب کی مسلسل فرمائش اور اصرار سے بڑی سخت محنت افزائی ہوئی۔ میرے پہلے افسانے کا تذکرہ انھوں نے اپنے ایڈیٹر میں کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت 'ساقی' کا ڈکٹنگ رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک زوروں میں جاری تھی اور بڑے بڑے ادیبوں کے دل پر سخت ہیبت طاری تھی۔ ان کے کیا قیامت خیز نام تھے۔ اللہ اکبر اور ان جفاکاریوں کے ساتھ ساتھ ہمارا نام بھی 'جرعات' میں شامل۔ تو مارے خوشی کے حالت خراب۔

1947 عیسوی کے ہنگامے میں لکھنؤ میں خبر پڑی کہ خدا خواست شاہد صاحب بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ حیات اللہ انصاری اور سلطانیہ آپا نے ذکر کیا کہ بڑی المناک اطلاع ملی ہے لیکن جلد ہی معلوم ہوا شاہد صاحب بخیریت کراچی پہنچ گئے ہیں۔ 1948 عیسوی کے کراچی میں روز خبریں ملتی تھیں کہ کون کون ہندوستان سے آگیا ہے، کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ شاہد صاحب نے ہیرالٹی بخش کالونی میں بڑی بہادری سے 'ساقی' کا دوبارہ اجرا کیا ہے اور گزر اوقات کے لیے ریڈیو سے کلاسیکل موسیقی کے پروگرام نشر کر رہے ہیں (آج کے نئے عالی شان محلات کے کراچی میں ہیرالٹی بخش کالونی بھی ہے جس میں کیسے کیسے دانشور اور اہل کمال آکر کس حالت میں رہے)۔ میں نے پھر 'ساقی' میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن اس وقت میں افسانے کم لکھ رہی تھی اور ناول لکھنے میں جٹ گئی تھی۔

پھر ایک روز بڑا عجیب واقعہ ہوا۔ میرے بھانجے عاصم زیدی نے ایک روز مجھے بتلایا کہ آپ کے متعلق ایک نہایت بے ہودہ مضمون 'ساقی' میں شائع ہونے والا ہے۔ کسی نے 'لوی فر' کے فرضی نام سے لکھا ہے۔ عاصم کے کسی دوست نے کسی طرح اس مضمون کے پروف بھی پڑھ لیے تھے۔ مضمون اس قسم کا تھا کہ قرۃ العین حیدر کلب سے آئیں پھر ڈانس کرنے لگیں پھر ایئر فورس کے ہیرو نے انھیں فون کیا وغیرہ (اس کے بعد قرۃ العین حیدر کا انتقال ہو جاتا ہے اور ان کی روح قبر سے نکل کر ایک انگریزی گانا گاتی ہے)۔ وہ مضمون میں آج پڑھتی تو بے حد ہنسی آتی، لیکن اس

وقت شدید طعنے آیا۔ بات یہ تھی اس زمانے میں، میں جس قسم کے افسانے لکھ رہی تھی وہ موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے شاید اپنے وقت سے ذرا آگے تھے۔ جس 'اوپری طبقے' کے پس منظر کے ساتھ میں نے کہانیاں لکھیں وہ طبقہ تقسیم ہند سے قبل معاشرے کے مٹتی بھراؤ تک محدود تھا۔ میں نے اسی طبقے میں آنکھیں کھولیں اور لامحالہ اسی کے بارے میں لکھا۔ قاریوں کی اکثریت کو وہ افسانے بے حد انوکھے اور عجیب معلوم ہوئے اور عام تنقید یہ تھی کہ میں کسی دوسرے کڑے کی باتیں لکھتی ہوں۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد دونوں ملکوں میں دولت و عشرت کی فراوانی اور فراخ زر کی وجہ سے وہ انوکھی زندگی اب بے حد عام ہو گئی۔ آج کے متعدد لکھنے والے اور قاری خود ایک نئے 'اوپری طبقے' میں شامل ہیں۔ اور بہر حال 'کلب'، 'کالونٹ' وغیرہ اب کوئی عجیب و روزگار بات نہیں رہی۔ جبکہ ہرچہ تھے افسانہ نگار کی کہانیوں کا پس منظر اب یورپ یا امریکہ ہے (مزید برآں آج کل متعدد افسانہ نگار خواتین و حضرات محض اسی قسم کے افسانے لکھ رہے ہیں۔ جیسے میں نے شروع شروع میں لکھے تھے۔ یا میرے ان اوّلین افسانوں کا چہ باتا راجا رہا ہے۔ تو کسی کو اچنبھا نہیں ہوتا نہ ان افسانہ نگار خواتین کے متعلق حماقت آمیز قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں میں بوجہ کم عمری و کم عقلی اپنے افسانوں میں انگریزی الفاظ استعمال کرتی تھی۔ اس پر خوب لے دے ہوئی۔ آج کل چند نامور افسانہ نگار انگریزی الفاظ بے تماشا اور اکثر غلط اور بلا ضرورت اپنی کہانیوں اور مضامین میں استعمال کر رہے ہیں اور ان پر قطعی اعتراض نہیں کیا جاتا!) بہر حال، تو افسوس مجھے اور زیادہ اس وجہ سے ہوا کہ شاہد صاحب سے امید نہ تھی کہ وہ ایسا پھر مضمون میرے متعلق 'ساقی' میں شائع کریں گے۔ میں نے انہیں ریڈیو اسٹیشن پر فون کیا۔ اس وقت تک شاہد صاحب سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ جیسے مہذب انسان سے یہ توقع نہ تھی، وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے بھی کافی سختی سے جواب دیا۔ میں نے کہا بالکل بلا وجہ آپ میرے خلاف اس قسم کا بے بنیاد مضمون کیوں چھاپ رہے ہیں؟ (مجھے یاد پڑتا ہے 'ساقی' نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور اسی میں 'لوسی فر' نے عزیز احمد اور چند ادیبوں کے متعلق بھی لکھا تھا۔) پھر میں نے کہا، ساقی یہاں مالی مشکلات کا سامنا کر رہا ہے اور شاید آپ کا خیال ہے کہ اس طرح

کے سنسنی خیز مضامین سے پرچہ بک جائے گا۔ مگر مجھ غریب کو بے قصور نشانہ کیوں بنائیے؟ کہنے لگے، اچھا کل آپ ریڈیو اسٹیشن آئیے، وہاں بات کی جائے گی۔

چنانچہ دوسرے روز شام کو میں ریڈیو اسٹیشن گئی جو اس وقت انٹیلیجنس اسکول کی ایک بارک میں تھا۔ وہاں شاہد صاحب پھر مجھ سے الجھ گئے اور کہنے لگے، اچھا اب ہماری آپ کی ملاقات عدالت میں ہوگی۔ میں حیران پریشان کہ یہ شاہد احمد دہلوی کو ہو کیا گیا ہے۔ چند منٹ بعد خود ہی بولے، اچھا میں کل پروف لے کر آپ کے ہاں آ جاؤں گا۔

دوسرے روز وہ پروف لے کر آئے۔ میں نے مضمون پڑھا۔ واقعی اب خیال آتا ہے کہ بہت دلچسپ مضمون رہا ہوگا۔ 'لوی فرز' کے زور و تخیل کی داد بھی دینی پڑی مگر پروف شاہد صاحب نے اسی وقت پھاڑ دیے۔

اس کے بعد شاہد صاحب حسب معمول بڑے اصرار سے مجھ سے افسانے منگواتے رہے اور میں ان کے لیے لکھتی رہی۔

ہمارے چچا زاد بھائیوں اور بہنوں کی ساری ٹولی کو موسیقی کا بہت شوق تھا اور تقریباً ہر ہفتہ ہم سب میں سے کسی کے ہاں میوزک پارٹی ہوتی تھی۔ انھی دنوں نواب چھتاری کے ایک صاحب زادے کے ہاں میوزک پارٹی میں شاہد صاحب بھی تشریف رکھتے تھے اور ان سے ہم لوگوں نے دیر تک شاستریہ سنگیت سنی۔ اس کے بعد شاہد صاحب سے ملاقات کا عرصے تک اتفاق نہ ہوا۔

رائیٹرز گلڈ کے آغاز کے دنوں میں ان سے متعدد بار ملنا ہوا۔ اسی زمانے میں 'آگ کا ور یا' کا حیرت ناک و حماقت انگیز ہنگامہ چلا ہوا۔ اس وقت جب اس سخت 'سنسنی خیز' اور 'خطرناک' ناول کے خلاف مضامین شائع کیے جا رہے تھے۔ شاہد صاحب نے اس کے متعلق ایک مشہور نقاد کا ایک بے حد تو صلی مضمون 'ساتی' میں چھاپا۔ لیکن اس مضمون میں ایک جملہ ایسا تھا کہ اور آفت آتی۔ (کس قدر بے وقوفی کا ہنگامہ تھا!) اس تیرے کی 'لوی فرز' والے مضمون کی طرح نہ صرف کتابت ہو چکی تھی بلکہ ساتی کی چند کاپیاں شاید چھپ بھی چکی تھیں جب مولانا جمیل الدین عالی

نے آکر مجھ سے کہا، چلیے، شاہد بھائی سے کہیں کہ اس مضمون کو نکال دیں۔ چنانچہ ہم لوگ ان کے ہاں پہنچے۔ شاہد صاحب کے کمرے میں چاروں طرف 'ساقی' کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ انھوں نے کاپیوں میں سے فوراً وہ مضمون علیحدہ کر دیا۔

کچر گیلری کی ایک اور تصویر: یہ 'ڈچ' یا 'اطالوی' یا 'برطانوی' کے بجائے بے حد 'مغل' قسم کا 'انٹیریئر' ہے کہ جیل جالبی کے ہاں رات کے وقت چاندنی پر جیلہ ہاشمی، ان کے شوہر، بیگم شاہد، شاہد صاحب گاؤں کی گلی سے لگے بیٹھے ہیں۔ بے حد پرسکون وقت ہے اور دسترخوان پر انتہائی پر تکلف دینی والے کھانے پینے جا رہے ہیں۔ بیگم جیل جالبی خاطر دوسروں میں جٹی ہیں۔

میں صبح کو بزمِ سیاحت سیلون جانے والی تھی۔ شاہد صاحب تھائی لینڈ وغیرہ سے یا ہو کر آئے تھے یا جانے والے تھے۔ دیر تک دنیا بھر کے مسائل حل کیے گئے اور جیلہ بی بی نے سب کو اپنے صحرائی محل آنے کی دعوت دی۔ بعض بزمِ آرائیاں وقت کے ہاتھوں نقش و نگار طاقِ نسیان ہی نہیں ہو سکتیں۔

شاہد صاحب سے غالباً وہ میری آخری ملاقات تھی۔

میری کچر گیلری میں ان گت مناظر اور پورٹریٹ اور انٹیریئر اور لینڈ اسکیپ ہیں۔ منے ہوئے لکھنؤ اور دلی والے اور مٹ جانے والے لکھنؤ اور دلی والے ہیں۔ بہت سے وحند لے سائے متحرک ہیں۔ بے شمار اوراق چنچھناتے ہیں۔ پتے اتر رہے ہیں اور گولے اور بادل اور ہوائیں جو سب زمانوں کو متاوتی ہیں اور قبروں پر گھاس اور پھول آگ آتے ہیں۔

پھر میرے سامنے اس ہوا میں چھپھٹاتے ہوئے... وہ پرانے ساقی آگرتے ہیں۔ فاؤنٹ اور دانے کا جنم اور وہرہ و دن کا سائیز روم دھوپ میں روشن ہے۔ اور اس میں رکھے ہوئے نیرنگ خیال اور عصمت اور مخزن کے پرانے فائل۔ مخزن اور نیرنگ خیال اور عصمت کی طرح ساقی ایک تاریخ ساز ادبی ادارہ تھا۔ شاہد احمد اور 'ساقی' ایک عظیم الشان روایت تھے جن کی قدردانیت کا احساس اگر آج کل کے لوگوں کو نہیں تو اسے موجودہ ادبی دور کی بد قسمتی ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

شاہد صاحب کے احباب اور عزیز، جو ان سے بہت اچھی طرح واقف تھے، ان کی زندگی، شخصیت اور ادبی کارناموں کے متعلق تفصیلی مضامین لکھیں گے۔ مرحوم سے میری سرسری سی ملاقات تھی لیکن میرے لیے وہ ان علاقوں میں سے تھے جن سے ادب و تہذیب کی آبرو قائم ہے۔

اور اب وہ بھی ایک وحندلی شبیہ بن چکے ہیں۔

---

(’ساقی‘، کراچی، شاہد احمد دہلوی نمبر، 1988)





## ایک ماڈرن عالم دین

(مولانا مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی)

پچھلے دنوں بہتی میں ایک شفیق اور درویش صفت مفکر مولانا محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی کا انتقال ہوا۔ مرحوم وہابی مسلک اور انقلابی خیالات والے ایک عقلیت پسند عالم اور علی گڑھ کے 'کیونٹ' مولانا سید محمد نوکی مرحوم کے مانند ایک بہت ہی پیارے، لائق صد تحکیم بزرگ تھے۔ (آپ کی روشن خیالی اور Non-confirmism کا یہ عالم تھا کہ کہتے تھے: "اگر وہ مقدس اور گیتا الہامی صحائف ہیں تو ہندوؤں کو بھی اہل کتاب سمجھنا چاہیے۔")

مولانا ایک منکسر المزاج، فرومایہ، فیور اور خوددار انسان تھے۔ وہ اپنے گھر سے کئی میل دور پیدل چل کر میرے ظلیت کے نزدیک کسی کے ہاں ٹیوشن دینے کے لیے آتے تھے۔ اور وہاں ہی پرکھی کبھی میرے ہاں تشریف لے آتے تھے۔ عمر پچاسی سال کی تھی مگر ضعیفی اور زمانے کی ناقدری کی جھلاہٹ ان کے مزاج میں مفلوحتھی۔ وہ ایک پرسکون اور کلفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ اپنی بھرانہ سالی کے ہاں جو دشہم کے اہم ادبی جلسوں اور تقریروں میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت

فرماتے تھے۔

مولانا شہاب کی عالمانہ کتاب 'دین الہی اور اس کا پس منظر' مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا۔ مولانا نے میرے اصرار پر اس کتاب کی پانچ جلدیں ایک بلند پایہ اور مقتدر ادبی ادارے کے سالانہ انعامات کے لیے داخل کیں۔ اس کتاب کو پہلا انعام ملنا چاہیے تھا مگر جج صاحبان نے اسے دوسرے یا تیسرے انعام کے قابل بھی نہ سمجھا۔ بعد میں ان حضرات نے اطمینان سے ذکر کیا کہ انھوں نے کتاب پڑھی ہی نہیں تھی۔

یہ کتنا برا افسوس ہے اور ہماری کیسی بد قسمتی ہے کہ ہم اپنے ان بے مثال جید علماء و فضلاء کا مرتبہ نہیں پہنچاتے جن کی نسل اب تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔

مولانا شہاب کو اس فیصلے کی اطلاع پر کتنا صدمہ اور مایوسی ہوئی ہوگی! شاید انھوں نے پشیمانی سے یہ بھی سوچا ہو کہ انھیں اپنی تصنیف اس مقابلے میں بھیجنا ہی نہ چاہیے تھی۔ اپنے آخری وقت میں اپنی قابلیت اور محنت کے Recognition کی توقع بے کار تھی۔

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں

نہ لگہ ہے دوستوں سے نہ شکایت زمانہ

یا

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

ایسے مواقع کے لیے علامہ اقبال فرما گئے ہیں۔ لیکن مولانا شہاب شاید حسب دستور محض مسکراتے رہے ہوں۔ اس واقعے کے بعد میری ملاقات ان سے نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ قبل ایک روز جب وہ میرے ہاں تشریف لائے تھے انھوں نے فرمایا تھا: اب سڑک پر چلتے چلتے ان کو اچانک چکر آ جاتا ہے اور وہ گر پڑتے ہیں اور کوئی راہ گیر انھیں اٹھا کر بس میں سوار کر دیتا ہے۔ پھر میں نے سنا کہ مولانا رعلت فرما گئے۔

مولانا شہاب جس خاموشی اور فروتنی کے ساتھ زندہ رہے اسی خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کے مرنے کے بعد بھی وہی سکوت طاری رہا۔ مولانا کے انتقال کے بعد

مجھے اکثر خیال آیا، ابھی ابھی کی بات ہے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ مولانا شہاب مصباح تھمے لے کر کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ ابھی ابھی غائب۔ اب کہاں ہوں گے۔ یقیناً اسی سکون اور دل جمعی سے فرشتوں کے ساتھ کہیں اڑتے پھر رہے ہوں گے۔

مولانا شہاب مالیر کوٹلی کا معاملہ ہماری ادبی اور علمی Dichotomy کی ایک روشن مثال ہے۔ مولانا کو خیالات کے لحاظ سے بے حد ماذرن تھے مگر تاریخی اعتبار سے پرانی نسل کے ایک اسکالر تھے اور سماجی لحاظ سے ایک Privileged طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے بہت سے علما کا مطلب محض عالم دین نہیں ہے (محض اسی وجہ سے 'لائٹ' میں نہیں آ سکتے کہ وہ ایک 'فلفل' سوشل سیٹ اپ میں شامل ہیں اور 'اوپن' جگہوں پر 'میچ' لوگوں سے رابطہ نہیں رکھتے۔ حال میں میں نے مولانا علی میاں کی تازہ تصنیف 'پرانے چراغ' پر بھی جس میں موصوف نے اپنے چند بزرگوں اور معاصرین کا تذکرہ کیا ہے جواب مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک زبردست اسکالر نے مصنف کے نام اپنے خطوط میں لکھا تھا وہ کس طرح برسوں سے اپنے گھر میں رات رات بھر جاگ کر رشک سے سوچا کرتے ہیں ان دنوں شام اور صبح کی دانش گاہوں میں ملاں ملاں موضوعات پر کیسا کیسا معرکے کا کام کیا جا رہا ہوگا! (وہ مرحوم ان علمی مراکز تک جانے کا مقدور نہ رکھتے تھے، اور نہ غائبانہ رسوخ کے مالک تھے جن کے ذریعے وہاں تک پہنچ سکتے۔)

ایران اور شام اور مصر اور ترکی میں یہ المناک Dichotomy موجود نہیں کیونکہ وہاں کسی مغربی زبان اور اس سے متعلق احساس برتری کا تسلا نہیں۔ ہماری اس مخصوص صورت حال کا ذمہ دار یا قصور وار چند ادبی اداروں کو نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ قصور اس کو ٹولنیل روایت کا ہے جس کی وجہ سے مغربی تعلیم یافتہ مصنفین کو معاشرے میں فوقیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو خود ہوگا کہ ہماری مختلف ہندوستانی زبانوں کے وہ گفتی کے ادیب و شاعر، جن کی تخلیقات کے تراجم انگریزی میں شائع ہو جاتے ہیں یا جو خود انگریزی میں لکھتے ہیں، ان کو لامحالہ زیادہ اہمیت ملتی ہے۔ مغرب میں جن کی کتابیں چھپی ہیں ملک راج آنند جیسے فقیر اور چند ایک اور کے علاوہ سب اپنے آپ کو فوق البشر سمجھتے ہیں۔

چھ سات برس قبل دہلی میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر ایک ادبی کانفرنس منعقد کی گئی تھی جس میں ہندوستان کی ساری زبانوں کے ادا و شعرا شامل ہوئے تھے۔ اس میں وہ ناولسٹ بھی مدعو کیے گئے تھے جو انگلینڈ اور امریکہ میں ہندوستان کے مشہور ترین 'انڈیو اسکالین' ادیب ہیں۔ اس موقع پر میں نے دیکھا کہ کانفرنس کے بحث مباحثوں کے دوران موصوف انتہائی احساس برتری کے ساتھ بالکل خاموش بیٹھے چست کو سکتے رہے گویا بھلا ان نینو جہلا کے مجمع میں کیا بولیں۔ دوسرے روز سے وہ کانفرنس میں تشریف ہی نہیں لائے۔

تو کہاں بے چارے گوشہ نشین شہاب المیر کوٹلوی، ان کو دنیا کیا جان سکتی ہے۔ کبھی ہمیں اس بات کا احساس ہوا ہے کہ کتنی بلند پایہ، فکر انگیز یا محققانہ تصانیف اور مقالے منظر عام پر نہیں آتے کیونکہ ان کے مصنفین اپنی پبلیسی اور پبلک ریلیشنز کروانے سے قاصر ہیں۔ ملک کی دوسری زبانوں یا انگریزی میں ان کے تراجم کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ شرقیہ کے عالم گویا یونانی علاج کرنے والے حکیم ہیں کہ ان کا کبھی کبھی بطور Curiosity تذکرہ کر لیا جاتا ہے۔ کیا ان کو پڑھنے کے لیے اعظم گڑھ، مدوۃ العلماء اور دیو بند اور جدید تعلیمی کلاس کی تفریق قائم رکھنا ضروری ہے؟

حضرت ابوذر غفاریؓ نے آج سے تیرہ سو برس پہلے بلاوجہ ہی روٹا شروع نہیں کیا تھا۔

(’داستان طراز مرتبہ آصف فرشتی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، 2008)

## جہاں میں رہتا تھا

(مہندر ناتھ)

جس زمانے میں ترقی پسند تحریک زوروں میں جا رہی تھی، آئے دن رسالوں میں ایک سے ایک اچھے افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے افسانے آج 'کلاسیک' کی حیثیت رکھتے ہیں (گواردو تھا دوں نے اس لفظ کی بھی کافی درگت بنا لی ہے۔) ان افسانوں کے خالق بہت سے ادب سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ کچھ نے خود استعفیٰ دے دیا، بہت سوں کو زندگی کھا گئی۔ چند ایک کو موت نے آواز دی اور وہ ادھر لپک گئے۔ مرنے والوں میں اکثر جواں مرگ تھے کہ بوجہ اردو ادیب کا عمر طبیعت پہنچنا کافی جان جو کھوں کی ہم ہے۔

جس زمانہ کی میں بات کر رہی ہوں شاید 'ساتی' میں ایک افسانہ چھپا تھا جہاں میں رہتا ہوں بہت اچھا افسانہ تھا۔ اسی وجہ سے اب تک یاد رہ گیا۔ مصنف کا نام مہندر ناتھ۔ بھٹی کی ایک عمارت اور اس کے مکینوں کے متعلق تھا۔ اردو میں بھٹی کی فٹ پاتھوں، سیٹھوں، طوائفوں، قلم ایکٹریسوں، انڈر ورلڈ کے باسیوں اور چالوں کی زندگی کے متعلق ایک عظیم الشان لٹریچر تخلیق کیا

جا چکا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس سبب تک سماجی اُلجھے کے بارے میں جس کا نام  
بھئی ہے خصوصاً اس کے چال سسل کے متعلق یہ پہلا افسانہ تھا جو میں نے پڑھا۔  
معلوم ہوا کرشن چندر کے چھوٹے بھائی ہیں۔ فلموں سے وابستہ ہیں۔ پھر سرائے کے  
باہر کی چند قصائد دیکھیں جن میں موصوف ہیر دتے۔ خواجہ احمد عباس کی پہلی فلم دھرتی کے لال  
میں بھی کام کیا تھا۔

1958 عیسوی میں چند روز کے لیے اپنی ایک دوست دلا سال سے ملنے بمبئی آئی تھی۔  
ایک روز عصمت آپا نے باضابطہ ذر پر سب ادیبوں کو بلا کر ملوایا۔ مہندر ناتھ بھی تھے۔ حسب  
معمول بے حد ہوش کی محفل تھی لیکن مہندر ناتھ بہت کم گو معلوم ہوئے۔ رات گئے عصمت آپا کے  
انٹس کورٹ اسے روڈ سے کھباتا بلڈنگ سز سال کے گھر پہنچانے کے لیے لوگ ایر دس تک پیدل  
آئے۔ چرچ گیٹ کے چوراہے پر مہندر ناتھ نے خدا حافظ کہا اور چری بیگ سنبالے سر جھکائے  
سنان سڑک پر فلور فائزین کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت مجھے اچانک خیال آیا۔ اس ساری  
ہوش اور ہنگامہ آرائی کے بعد یہاں کے بیشتر رہنے والوں کی زندگی دراصل یہ ہے۔ مسلسل  
جدوجہد اور اکیلے راستے۔

پچھلے دس بارہ سال میں افسوس کہ مہندر ناتھ سے ملنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا۔ کرشن  
چندر کی علالت کے زمانے میں چھوٹے بھائی کی پریشانی اور وحشت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان دنوں  
کرشن جی کی طبیعت کا احوال مہندر ناتھ کی صورت پر پڑھا جاسکتا تھا۔ اگر طبیعت بہتر نہیں تو  
موصوف بے حال۔ اگر کرشن جی کو اتفاق ہے تو آپ نہال نہال۔ کھلے جا رہے ہیں۔ بھائی پر بس  
جان دیے دیتے تھے اور کرشن جی ان کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔

آخری ملاقات 1971 عیسوی میں السٹریٹ ویلکی کے دفتر میں ہوئی۔ فلم رائیٹرز ایسوسی  
الیشن کے کسی کام سے آئے تھے۔ کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا اس کا ذکر کر رہے تھے، خفا تھے مگر نہایت  
وضع داری کے ساتھ۔

شہر بمبئی میں بڑے بڑے جفا داری ادبا و شعرا سے جب سال دو سال بعد اتفاق کہیں

ملاقات ہوتی ہے تو مکالمہ کچھ اس طرح ہوتا ہے!

میں: اور سنا ہے۔ کیا حال چال ہیں، آج کل آپ کون کون سی فلمیں لکھ رہے ہیں؟

وہ: تہہ چال اور حسین ڈاکو۔

میں: آپ کا چار سو میں معشوق تو ہٹ گیا۔

وہ: جی شکر یہ۔ اب ہیرا مانی کو سائن کیا ہے۔ پھر خود ڈائریکٹ کرنے کا ارادہ ہے۔

مہندر ناتھ بھی فنانسی فلم تھے مگر اردو ادب کو طلاق ٹلا دیا جس دی تھی۔ اس فکر میں بھی رہتے تھے کہ ایک ہر دور سال نکالیں گے۔

مہندر ناتھ کی شرافت اور نیک نفسی ان کی پوری شخصیت سے آشکار تھی۔ اپنے بڑے بھائی اور سارے خاندان اور اپنی پتی درتا بیوی ڈرگا سے مہندر ناتھ کو جیسی محبت تھی وہ دیکھنے سننے میں ذرا کم ہی آتی ہے۔

میں: بسنی سے باہر گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو معلوم ہوا کہ مہندر ناتھ کا انتقال ہو گیا۔ شاید لطیف کی روانگی کی طرح یہ بھی ایک بے حد اچانک اور بے وقت موت تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا مہندر ناتھ کہاں رہتے تھے، کرشن جی اور سلطی کے ساتھ ان کے ہاں گئی یعنی مہندر ناتھ کے گھر ان کے مرنے کے بعد گئی۔ ایسا بھی صرف اسی شہر میں ہو سکتا ہے۔

بلڈنگ کے دروازے پر پہنچ کر معادہ برسوں قبل پڑھا ہوا افسانہ نظروں کے سامنے آ گیا... جہاں میں رہتا ہوں....

وہی کمین، وہی ادا سی اور بے رنگی اور غربت اور محض اور سماجی ٹریجڈی۔ اس طویل عرصے میں دنیا بدل گئی۔ نئے دھن دانوں نے اسی شہر میں ایسے گل بنوائے جن کے سو رنگ پول کے بلوریں فرش کے نیچے ڈرائنگ روم ہوتے ہیں مگر اس اللہ کے بندے نے محض اصول پرستی کی خاطر اس چال کو نہ چھوڑا۔ لفظ چال ہی بہت سے لوگوں کے لیے بڑا عجالت انگیز ہو گا یعنی گو آپ ادب میں طبقاتی شعور پُر زبردست مقالے تصنیف فرمائیں لیکن عین ممکن ہے کسی کو یہ بتا پسند نہ کریں کہ آپ اپنے رشتے دار یا قریبی دوست کسی چال میں رہتے ہیں۔ بات یہ ہے صاحب کہ

وہ انقلاب جس کی خبریں گرم قہیں کہ آنے والا ہے اس افواہ کو بھی ٹھنڈا پڑے زمانہ ہو گیا۔  
 مہندر ناتھ نے اپنے ایک افسانے "پتھر کے بت" میں جو ان کے مجموعے "تہا تہا" میں  
 شامل ہے ایک شراب نوشی کی پارٹی کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دیوند کو اپنے آپ پر فہم آیا۔ اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی۔ ان لوگوں کو کیا ہوا۔ یہ  
 خاموش کیوں رہے۔ ہم نے اپنے متعلق کیا کچھ نہ سوچا تھا۔ دوسروں کے متعلق کیا کچھ نہ سوچتے  
 تھے، ہم تو انقلاب کے قریب تھے، ہم میں سے بہت سے گولی کھا کر مر گئے۔ کچھ فاقوں کی تاب نہ لا  
 کر چلے بنے، کچھ زیادہ شراب پی کر راسی ملک عدم ہوئے۔ کچھ ایک فلیٹ اور کار لے کر مر گئے...  
 لیکن انسانیت، اخوت، مساوات، انقلاب اور لفظ ساتھی... یہ ایک لفظ تھا، اس کا مفہوم کیا تھا۔ کس  
 کی زبان سے نکلا تھا کیا ہم واقعی ایک دوسرے کے ساتھی تھے... اور ہیں...؟"

مہندر ناتھ کو اس لفظ ساتھی کے معنی معلوم تھے۔ ان کے مرنے کے بعد ہی لوگوں کو یہ پتہ  
 چلا کہ ان کے پرانے دوست اندر گجرا ل نے انھیں اس چال میں دیکھ کر کہا تھا کہ تمہارے لیے  
 ایک اچھے طین کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔ مہندر ناتھ نے جواب دیا، آپ کو میرے لیے ایک نہیں  
 تین سو فلیٹوں کا بندوبست کرنا پڑے گا کیونکہ میری طرح تین سو ادیب، سمیٹی میں اسی حالت میں  
 چالوں میں رہتے ہیں۔

میں نے یہ واقعہ اندر ملہو ترہ کو سنایا۔ انھوں نے دوسرے روز "نائنٹر آف انڈیا نوٹ بک"  
 میں اس کا تذکرہ کیا لیکن آج تک کسی نے ایسی باتوں سے نصیحت حاصل کی ہے کہ لوگ مہندر ناتھ  
 کی اصول پرستی اور انسان دوستی سے کوئی سبق سیکھیں گے۔

اور سرائے کے باہر ایک آخری تصویر: جواں مرگ مہندر ناتھ کی ارحمی اس سرائے سے اٹھا  
 کہ بن گنگا گھاٹ لے جانی جا رہی ہے۔ انھوں نے بدلتی ہوئی حیرت انگیز دنیا کا تماشا کیا۔



## شام اودھ کا ایک نغمہ نگار

(جاں نثار اختر)

اب تک میں نے جاں نثار اختر کو صرف مشاعروں اور ادبی مغللوں میں سنا ہے اور میری ان سے زیادہ ملاقات نہیں جو ان کے بارے میں لکھ سکوں۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ ایک مرتبان سرنج تھہ اور نیک طبیعت آدمی ہیں۔ لہذا میں نے ان کی تینوں کتابیں پڑھیں اور اس نمبر کے سلسلے میں چند باتیں میری ناقص عقل میں آئیں وہی آپ کو بتلاتی ہوں۔

کلی بات یہ کہ کسی شاعر یا نثر نگار کے فن اور شخصیت پر اس کی زندگی میں جو کام ہوتا رہے وہ اچھا ہے لیکن اس میں مبالغہ آرائی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے ہاں تو جد سے زیادہ نثر خوانی کا دستور ہے یا ایک دم ذاتیات پر اتر کر کچڑ اچھالی جاتی ہے۔ اردو میں اصناف قصیدہ و کچھڑ صدیوں سے رائج ہیں۔ گویا ہم اپنے قد مادہ اساتذہ کی پیروی کرتے ہیں۔ شاید ہم لوگ اسے جذباتی ہیں کہ بات کرتے کرتے بہک جاتے ہیں... مغرب کے معترف ہیں مگر اب تک مغربی ضابطہ و توازن اور Sense of Proportion حاصل نہیں کیا۔ Hyperbole اور Superlatives

کا استعمال صرف اردو کی نہیں سارے ہندوستان بلکہ برصغیر کی کمزوری ہے۔ ابھی کچھ تازہ پاکستانی رسالے دیکھے جن میں چند یقیناً قابل قدر ادبی ہستیوں کو جن سے میں بھی اچھی طرح واقف ہوں، قریب قریب ولی اللہ بنا دیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ درجہ ولایت سے آگے تو بات جا نہیں سکتی۔ (میری ایک ناچیز ذاتی رائے یہ بھی ہے کہ کسی بقید حیات ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعر پر بی ایچ ڈی کرنے کی اجازت اتنی آسانی سے نہیں دینی چاہیے جو آج کل ہماری یونیورسٹیوں کے ارباب اردو کی طرف سے مل جاتی ہے۔ جب تک ایک فن کار کا سارا سرمایہ حیات سامنے نہ ہو ایک دانش جو اس کے متعلق کیا فیصلہ کر سکتا ہے۔)

چنانچہ دراصل میں یہ مضمون لکھنے کے لیے صحیح آدمی ہی نہیں ہوں مگر مجھے خوشی ہے کہ اس شمارے میں ہندوستان کے بلند پایہ نقادوں اور مصنفوں اور شاعروں نے جاں نثار اختر کی شاعری کی خوبیوں کے علاوہ ان کی کمزوریوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

آج کل ہمارے ہاں نئی اور پرانی بیڑھیوں کی درجہ بندی کے بغیر کوئی تنقیدی جائزہ مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ (اور پرانی یا نئی بیڑھی میں شمولیت ایک قسم کی سند یا Disqualification کے طور پر استعمال کی جاتی ہے) جاں نثار اختر احقرہ سے پہلے والی نسل کے آدمی ہیں۔ ان کے نام سے بچپن میں واقعیت محسوس اتنی تھی کہ 'گر گر کالج کی لاری کے توڑ پر علی گڑھ میں ہمارے ایک نوجوان نے ایک مسخرے پن کی نظم 'گر گر کالج کا ٹانگہ' تصنیف کی تھی۔ مجاز کی بہت سی حیدر آباد اور صفیہ آپا لکھنؤ میں والدہ کے پاس اکٹرا آیا کرتی تھیں اور صفیہ آپا ایک بے حد سوہیٹ خاتون تھیں۔ پھر سنا کہ صفیہ آپا کی شادی اسرار بھائی کے دوست جاں نثار اختر سے ہو گئی۔ جو اسرار بھائی کی قسم کی شاعری کرتے ہیں اتنی ہی مقدار میں اکل و شرب کے فائل ہیں اور کیونٹ ہیں۔ یعنی سارے عیب شرعی موجود... صفیہ آپا کے انتقال کے بعد زرب پڑھی۔ اب 'خاک و دل'، 'بچھلے پہر' اور 'گھر آگن' (جو چالیس سال کا شعری سرمایہ ہے) کو پڑھتے ہوئے کافی تعداد میں ایسی نظمیں یا اشعار ملے جنہوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

اقبال کے بعد اردو میں کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں ہوا۔ اقبال جیسے لوگ جن کے ہاں

فرشتوں کے پر طیس روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن اقبال کی زندگی ہی میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی اور اس نے چند برسوں میں بڑے جاندار شاعروں کا ایک پورا قافلہ تیار کر دیا (ادیب و شاعر کسی تحریک کو بناتے ہیں یا ایک مومنٹ ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت کرتا ہے کج بجھی ہے۔ انگلستان اور فرانس میں انیسویں صدی سے لے کر آج تک جتنی زوردار تحریکیں چلیں انھوں نے ایک مخصوص فضا اور میلانات کی تشکیل کی۔ یہی ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں ہوتا رہا اور آج بھی ہو رہا ہے)۔ بہر حال ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کو کم باذن نہیں کہہ کر یقیناً جگایا۔ 1935ء سے پہلے چند شاعروں کو چھوڑ کر بقیہ نحیف دلاغر و مانی شاعری پر غور کیجیے۔

ترقی پسندوں کا ذکر آج کل ابداء کر بھگڑے فساد کی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ لوگ ایک مخصوص سیاسی مسلک کا پرچار اور نعرہ بازی کرتے تھے۔ تو صاحب ایک نظم یا غزل یا اچھی ہوتی ہے یا بری، یا معمولی۔ انیسویں صدی نے ساری عمر کیا کیا۔ آئرش قوم پرستی، انگلستان کے خلاف آئرلینڈ کی سیاسی جدوجہد اور اس سے متعلق شخصیات اور واقعات پر اس نے نظمیں لکھیں اور وہ کیا خوبصورت بلند پایہ چیزیں ہیں۔ 'ایسٹر 1916ء' ایک لرزہ خیز نظم ہے۔ گل گامش سے لے کر گنزر برگ تک عالمی تاریخ کسی نہ کسی روپ میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ ایران کے کلاسیکل شعرا یورش تاتار اور زوال بغداد کے Traumatic نتائج سے بے نیاز نہیں تھے۔ خود اقبال اکثر و بیش تر اسلام زعمہ ہاؤ کرتے تھے اور آج کا عرب بالخصوص فلسطینی اور عراقی شاعر کیا لکھ رہا ہے؟

مغرب میں دو بڑی جنگوں کے دوران گھٹیا شاعری نہیں کی گئی۔ ٹی ایس ایلیٹ (عاجزہ اقبال کے ساتھ ساتھ ایلیٹ کی سخت پرستار ہے) مغربی مسیحی ذہن و روح کا پیغمبر شاعر تھا۔ یعنی اقبال کی طرح ایک مخصوص آفاقی فلسفے کا ترجمان تھا۔ میں قومی شاعری کی بات نہیں کر رہی جو عموماً دوسرے درجے کی ہوتی ہے (جاں نثار اختر کے ہاں بھی 'چشتی قلب'، 'کبیر تلسی میرا'، غالب کا امر دیوان، 'تاج محل' وغیرہ کلیشے افراط سے موجود ہیں)۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بھی اچھے اور برے دونوں طرح کے شعر کہے گئے۔ احسان

دانش کے 'لینڈروں' کا سر لیے پھرتے ہیں کتے شہر میں، کی قسم کے کلام بلاغت نظام کا اہلکار لگ گیا۔  
 انسان پر مستقل مناقب و مرثیہ تھیں ہوئے۔ بہر حال کم از کم جب باتیں کے خلاف روی  
 انتہائی بہادری سے لڑ رہے تھے ساری دنیا انسان کی معترف تھی۔ میں نے انسان کی موت کے  
 چند برس بعد تک اسکاٹ لینڈ میں چند ہامورا اسکاٹس مفتیوں کو آنجانی کے متعلق پر جوش بیلید گاتے  
 سنا ہے۔ (جاں نثار اختر کی اصول پرستی قابل ستائش ہے کہ انھوں نے بنے بھائی کے مشورے کے  
 باوجود انسان کی مٹی اپنے ریڈ اسکوائر کے مقبرے سے خارج نہیں کی۔)

جاں نثار اختر کی مارکسٹ، رومانی، آدرش وادی، ختمیہ شاعری کے متعلق اس شمارے  
 میں اردو کے چند بہترین نقادوں، شاعروں اور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔ لہذا مجھے کچھ لکھنے  
 کی ضرورت نہیں۔ لیکن خاکہ دل میں مجھے آشا کے منور پھول کھلے، ہر دے کا کنول بھی مسکایا  
 ('گانگہی جناح ملاقات')، 'مردود کے سادہ ماتھے پر گھر گنگ شفق لہرانے لگی' جیسے الموناسک اشعار  
 کے ساتھ ساتھ اچانک:

چاند سے جب بھی بادل گزرا  
 دل سے گزرا نکس تمہارا

اور ریاست، جیسی نغمہ بھی ملی۔ جاں نثار اختر ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہ بڑی روانی  
 سے اقبال کے رنگ میں پیر روی کی جگہ کارل مارکس کو سامنے بٹھا کر اس سے سوال و جواب کرتے  
 ہیں۔ ساقی نامہ کی طرح اس نامہ اور طرز جدید کی سادہ اور ذومعنی نقیص لکھتے ہیں۔ میر کے مقبول  
 رنگ میں شعر کہتے ہیں اور فٹ پاتھوں کا ذکر بھی کرتے ہیں:

میں سوچتا تھا وطن جا کے پڑ رہوں گا کبھی  
 مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں

---

ہر کسی فٹ پاتھ پہ چپ چاپ مر سکتے ہیں ہم  
 کم سے کم حاصل تو ہے ہم کو اجازت اس قدر

اردو شاعری میں 'سانیت'، 'فری ورس'، 'پینک ورس'، 'کیکو'، 'تراپیلے' کے بعد اب انگریزی الفاظ کا استعمال معنی خیز ہے۔

یہ مسئلہ ہندستان کی دوسری زبانوں اور پرفورمنگ اور پلاسٹک آرٹس کے لیے بھی دوسری صورتوں میں موجود ہے کہ ہم مغربی فارم تکنیک اور انجبری سے از حد متاثر ہیں۔ روح ہندستانی یا مشرقی دکھنا چاہتے ہیں اور اسے نیم مغربی قالب میں ڈھالتے ہیں۔ یعنی بوتل میں پری کو بند کرتے ہیں اور شیشے میں جن اتار دیتے ہیں۔ پہلے شیشہ خالص مشرقی تھا تو نہ زبان اور تکنیک کے مسائل تھے نہ اس قسم کا جھگڑا قلب و نظر کا پیدا ہوا تھا۔ میر، نظیر اکبر آبادی اور میر انیس وضع قدیم کے خیو شاعر تھے۔ مرزا غالب کو سوزن ہندستانی تھے لیکن وہ بھی فنی خوبی کی پریشانی سے دوچار نہ ہوئے۔ (فرض کیجیے میر یا غالب انگریزی پڑھ گئے ہوتے اور الیکٹرونک پوپ یا لارڈ ٹینیسن کی طرح لکھنا چاہتے تو ان پر کیا گزرتی۔)

حقیقت یہ ہے کہ مغرب والا جو ہے نہ اس نے مینا تواری مصوری کی ہے نہ وہ غزل کہتا ہے نہ ہمارے ناول، افسانے اور شاعری کی اسے رتی بھر پرواہ ہے (اور یہ کیجئے، رکے دغیرہ خاور سیانہ سے تھوڑے بہت متاثر ہوئے تھے یا نگور نے ڈبلیو بی اینس کو متوجہ کیا۔ میں اسے مشرقی 'Exotica' میں مغرب کی دلچسپی پر محمول کرتی ہوں۔) اس کے برعکس ہم 'نچرل'، 'رومانی'، 'انٹھابی'، 'جدید' سے لے کر لہیز و ذہن مغرب کی خوش چینی میں مصروف ہیں۔ چند ہزار سال تک مشرق کے ذراے، مصوری، رقص، شگتراشی اور نثر و نظم پر Stylisation کا زبردست تسلط رہا ہے۔ ('غزل' اس کی سب سے قریبی مثال ہے) نشاۃ ثانیہ کے یورپ کے فنی اجتہاد اور آزادی سے ہم انیسویں صدی میں پہنچ کر برٹش راج کی برکت سے تحارف ہوئے اور انھیں فوراً قبول کر کے ہی اپنے ادب اور آرٹ میں نئی سمتیں تلاش کر سکے۔ لیکن اس فنی اجتہاد، آزادی اور بصیرت سے بھی ہمیں صرف اس حد تک روشناس کیا گیا جس حد تک یہ وکٹورین انگریزی ادب اور رائل اکیڈمی میں رائج تھی۔ کیونکہ خود انگلستان میں فرانس اور جرمنی کی جدید تحریکیں چند سال بعد پہنچی تھیں اور وہ بھی برطانیہ کے حکمران طبقے کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ اس صدی کے شروع میں ایڈرل پاؤنڈ،

ایڈیٹڈ سٹ ویل اور ایلٹ وغیرہ نے نئی شاعری شروع کی اور مصوروں نے جدید اسلوب کی تصویریں بنائیں۔ لیکن ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اب تک کیٹس، ہارن اور ٹینیسن پڑھائے جاتے رہے اور ہمارے آرٹ اسکولوں پر رائل اکیڈمی چھائی رہی۔ ایلٹ وغیرہ سے زیادہ تر اردو والے عرصہ دراز تک ناواقف تھے اسی وجہ سے جو لوگ مغرب میں کب کے پرانے ہو چکے ان کو یہاں تازہ بہ تازہ نو بہ نو سمجھا گیا۔ بودلیئر، مارلے، کافکا وغیرہ کے لیے بھی حال میں بہت اکسٹیمٹ رہا۔

علاوہ ازیں اس وقت انگریزی الفاظ اور قروں کا بے تحاشا استعمال بھی جو نظموں، تنقیدی مضامین اور افسانوں میں کیا جا رہا ہے قابل غور ہے۔ اکثر جدید نظموں اور افسانوں کے عنوان بھی انگریزی میں ہوتے ہیں (بریکل تذکرہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ جب خاکسار نے کالج کے فرسٹ ایئر کے زمانے سے انتہائی عالم بے وقوفی میں افسانے لکھنے شروع کیے اور ان میں انگریزی الفاظ استعمال کیے تو شد و مد سے مطعون کی گئی، آج پشتر خدا اور افسانہ نگار بے حد و حساب اور اکثر بلا ضرورت انگریزی الفاظ استعمال کر رہے ہیں لیکن ناچیز کو اب بھی اس ادبی جرم کے لیے اسی شدت سے مطعون کرتے ہیں۔ میں نے الوژن اور وژن لکھنا شروع کیا۔ آج یہ الفاظ اردو میں باقاعدہ شامل ہو چکے ہیں۔

آج سے پچپن برس قبل عظمت اللہ خاں نے 'لیپ' استعمال کیا۔ چنانچہ آج کی زندگی کی عکاسی کے لیے 'نٹ پاقھوں' اور 'جلیتی' جیسے 'کاس' کا استعمال بالکل ناگزیر ہے اور بہر حال انگریزی الفاظ 'بیوکات' اور 'لائین' کے زمانے سے اردو میں کھپ چکے ہیں۔ جدید فارسی نہایت خوبصورتی سے فرانسیسی الفاظ کو اپنے میں سمو چکی ہے۔ اردو ایسا کیوں نہیں کر سکتی۔

زندگی کی Mystery کے متعلق شاعر ایک صحافی کی مانند سپاٹ بیان دے سکتا ہے۔ یا نہاں خانوں میں جاسکتا ہے یہ ظاہر ہے کس کی فنی ملاحیت اور وجدان پر منحصر ہے۔

اردو میں ہمیشہ Naunces کی شاعری کی گئی ہے۔ ایک روٹینک سبلسٹ کے مانند فارسی اور اردو کا بڑا شاعر جو موجود ہے اس سے زیادہ کہہ سکتا ہے، جیسے بیدل اور غالب جو موجود

ہے اس سے بہت زیادہ کہتے تھے۔ اسی وجہ سے لفظ، اس کے تصویری، جذباتی اور صوتی پہلو اور پرتو اردو والوں کے لیے بہت اہم ہیں۔

مغربی موسیقی خالص اور توضیحی دو طرح کی ہوتی ہے۔ اردو شاعری کی رمزیت اور اسیمبری کو توضیحی موسیقی کہا جاسکتا ہے۔ گرم کے ہر سر کی مانند ہر لفظ اپنی روشنی اور تاریکی اتار چڑھاؤ اور رُس رکھتا ہے۔ انگریزی میں لفظ کی پہچان جبر لڈ سننے ہو چکنر، ایلٹ، ڈبلیو ایچ آڈن اور ڈی لن طامس کے ہاں خصوصیت سے موجود ہے۔ موخر الذکر شعرا کے ہاں لفظ کا رشتہ ماضی اور حال دونوں سے قائم ہے اور لفظ کا ایک مصنوعی تصوراتی لینڈ اسکیپ کے بجائے عصری زندگی سے رشتہ استوار کرنا دور حاضر کے اردو شعرا کا بلاشبہ ایک قابل ذکر کارنامہ ہے۔

’بچھلے پہر‘ کے جاں نثار اختر کے ہاں لفظ کا استعمال سیدھا سادا ہے لیکن نکھر گیا ہے۔ وہ اس پائے کے شاعر ہیں کہ ظاہر ہے Self-Conscious قسم کی جدید شاعری نہیں کریں گے۔ (وہ خود کہتے ہیں کہ انھوں نے کیٹس اور ہارن کے بعد کے انگریزی شعر انوکھیں پڑھا) ان کی اس ’سادہ اور پرسوز‘ اکہری شاعری میں کہیں کہیں کلاسیکل چین اور جاپان کی جھلک نظر آتی ہے۔ جہاں چاند اردو فارسی کے محبوب کا چہرہ یا جدید شاعر کا سزا بوزہ نہیں تھا۔ لیکن بڑا خوبصورت چاند تھا۔ جاں نثار اختر بھی اب براہ راست بات کرتے ہیں:

بٹلا ہو کینکی ہو کہ چپا کہ چاندنی

ہر پھول سے قریب تھے ہم اپنے گاؤں میں

جاں نثار اختر کہتے ہیں کہ علامتوں اور مفرد ترکیبوں کے ذریعے جو شاعری کی جاتی ہے وہ بڑی شاعری نہیں۔ میں ان کے اس خیال سے قطعی متفق نہیں۔ لیکن اس دھیمی آواز اور سیدھے سادے انداز بیان کے ذریعے جاں نثار اختر تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ’بچھلے پہر‘ میں مجھے چند شعر اور پسند آئے:

اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر

ندی کوئی بل کھائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

جٹے والوں کی آہیں کہاں جل سکیں  
اک دھواں ہے ابھی تک مکانوں کے بچ

ترانے کچھ دیے لفظوں میں خود کو قید کر لیں گے  
عجب انداز سے پھیلے گا زنداں ہم نہ کہتے تھے  
'دیے لفظ' Given words کا ترجمہ ہے۔

ایک امریکن اصطلاح آج کل ہمارے ہاں مقبول ہے کہ آپ کس طرح دوسروں سے  
'Relate' کرتے ہیں۔

مختلف النوع سطحیات پر جینا صوفی اور فن کار کا ہمیشہ سے اندرونی معاملہ رہا ہے اور اس  
اندرونی معاملے کو لفظ اور معانی کے ذریعے دوسروں تک پہنچا کر ان سے رابطہ قائم کرنا اس کا فنی  
مسئلہ۔ صوفیاء اور درباری شعرا اور اصلاح پسند پتھرل شاعر اور رومانی اور انتہائی اور اشتراکی سب  
کے ایلیمین ان کے وقتوں کی آواز تھے۔ آج کا شاعر ان سب سانچوں کو توڑ پھوڑ کر گنڈا کر دیتا ہے۔  
اس شکست و ریخت یا ترکیب نو سے شاعروں اور اس کے سماج کا تصور دس بھی ظاہر ہو سکتا ہے اور  
اس کا فنی اجتماع بھی۔

انسان کا مقدراس کا کردار ہے یا اس کا ماحول۔ مغرب میں اس سوال پر بحثیں ہو کر پرانی  
ہو چکیں۔ رومینک دہشت، شر، بدی، گناہ، سادیت، کرب، اضطراب، موت، موت کی خواہش  
(مغرب میں باز نظم کی امیجری، واکٹر اور بودلیئر سے حد درجہ وابستگی وغیرہ)، بے چینی، قنوطیت،  
یہ سارے لوازمات ذاتی یا اجتماعی تصور دس کے مظاہر ہو سکتے ہیں... ایک سپریشٹلک وضع کی نظمیں  
اور کہانیاں ایک حد کے بعد بڑی آسانی سے Grotesque بن جاتی ہیں جو ادب نہیں ہے اور اب  
'بے چہرہ انسان' بھی ایک اور کلچر بن چکی ہے (ایک ہوٹن ٹوٹ بھی اپنے جنگل میں تنہا نہیں ہوتا)  
جس ٹار اختر 'پاہڑ' سے 'اندرا' آچکے ہیں۔ لیکن تنہائی کی کال کوٹھری میں جانے کے بجائے انھوں



نے 'مکھڑا گن' لکھا۔

فراق صاحب کی روپ کی رباعیاں محض اصول کی خاطر کہی گئی ہیں۔ 'گوری' اور 'ناری' پر جمیل الدین عالی بہت خوبصورت دوہے اور گیت لکھ چکے ہیں۔ وہ 'گاؤں کی گوری' محبوبہ تھی۔ جاں نثار اختر کی گوری خالص ہاؤس وانف ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو ہیر و کا درجہ تفویض کیا ہے۔ اس پتی درتا آدرش مہیلا کا حال یہ ہے کہ ہیر و کے قدموں کی دھول جس گلاب کے پھول پر پڑتی ہے، وہی گلاب اپنے بالوں میں چٹا لیتی ہے۔ چرنوں کی دہائی آج ویسزلب والے ہندستان میں! گو جاں نثار اختر صفائی یہ پیش کرتے ہیں کہ مستقبل کی عورت کے بجائے ہندستان کی روایتی عورت کی تصویر ہے۔ علاوہ ازیں ترقی پسند عنصر یہ ہے کہ ملک کے ہر آگن میں ایسی جنت بس سکے۔

ہرگز! ہوا ترقی پسند جدید یا ہو جاتا ہے۔ جاں نثار اختر ابھی نہیں بگڑے۔ لیکن چونکہ تھک ترقی پسند کے دائرے سے نکل چکے ہیں اس لیے جدید یوں کے نزدیک قابل معافی ہیں۔ انھوں نے بھی اپنی ذات سے 'کٹ منٹ' کر لیا ہے۔

یہ آج کی اردو تنقید کی ایک مرغوب اصطلاح ہے کہ آپ کیڈ ہیں یا نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو روسی ہیں یا امریکن۔ تیسری قسم اپنی ذات سے کٹ منٹ کی بتائی جاتی ہے۔ کس قسم کا کٹ منٹ؟ صالح قسم کا۔

لیکن کیا یہ بھی ایک اضافی اصطلاح نہیں ہے؟ کس قسم کا صالح؟

اس کو کیا کہیے کہ ان تمام فیشن ایبل اصطلاحات اور نظریات کے باوجود ہماری شاعری کا کافی بڑا حصہ ('ترقی پسند' اور 'جدید'، 'خارجی' اور 'ذاتی') سطحی اور Common place ہے۔ اچھی شاعری بھی سوائے ج.م. راشد کے اور چند دوسرے شعرا کے Minor key اور جیمبر میڈک کی نفسی ہے۔

جاں نثار اختر میری اس رائے سے متفق ہیں کہ ہمارے زیادہ تر ادیب اور شاعر مفکر نہیں ہیں۔ جاں نثار اختر کا خیال ہے کہ عملی زندگی سے اچھی شاعری آتی ہے۔ ہمارے ہاں انسان لگ

معاش میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ اسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں حصہ لینے کا وقت نہیں ملتا۔ اس کے باوجود ریڈی میڈ سانچوں کی فراوانی اور اردو زبان کی وسعت کی وجہ سے شاعری کا ہمیشہ سے زور رہا ہے اور آج بھی ہے۔ پہلے 'پیام یار' اور 'جلوۂ یار' وغیرہ رسالے نکلتے تھے ہی غزلوں کے لیے تھے جن میں طرحی دو غزلے سے غزلے شائع ہوا کرتے تھے۔ روایتی شاعری پچھلے ڈھائی سو برس میں ہزاروں نے کی اور صاحب دیوان ہوئے۔ رومانی اور ترقی پسند شاعری سینکڑوں نے کی۔ آج بھی سب سے زیادہ کتابیں 'جدید شاعری' کی چھپ رہی ہیں اور اردو رسالوں میں اتنی فیصدی تنقیدی مضامین اور مفصل تبصرے شعری مجموعوں پر شائع کیے جا رہے ہیں جن کا مضمون اکثر ایک سا ہوتا ہے۔ غالباً ایک مجموعہ کلام پر تنقید کرنا آسان ہے کہ کتاب ہلکی پھلکی ہوتی ہے۔ نثر کے لیے پڑھنا بہت پڑے گا۔

بیشتر ہندوستانی (اور پاکستانی اور بنگلہ دیشی) ادب کی Mediocrity کی ایک وجہ وہی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ہمارے لکھک اور شاعر کو وہ مالی فراغت اور خوشگوار ماحول میسر نہیں جس میں وہ آرام اور سکون سے بڑا ادب پیدا کر سکے۔ تو صاحب یہ فلسفینی مجاہدین جو ہیں جو دن رات موت سے کھیلتے ہیں اور انتہائی تکلیف دہ ریاضے جی کیپوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، یہ اتنا شاندار ادب کیونکر تخلیق کر رہے ہیں اور ہم کیوں عام طور پر Non-Literature پیش کرتے ہیں۔

اور پچھلی ان دنوں کسی فن یا مخصوص ادب میں ممو یا پائی ہی نہیں جاتی۔ ادب کے اس مجموعی معمولی پن کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ایک ناخواندہ سماج صرف آواز اور متحرک تصویر یعنی ریڈیو اور سینما سے لطف اندوز ہونے کے لیے مجبور ہے۔ 'آٹھ بج گیا' کی تعداد انتہائی محدود ہے۔ اس وقت اردو میں یہ صورت حال اور زیادہ ہولناک ہے۔ چنانچہ ہم سب مع ترقی پسندوں کے (جو عوامی ادب کی بات کرتے ہیں۔ تحریک کے عروج کے دور میں بھی ان کی تخلیقات شہری نڈل کلاس کے چند ہزار افراد تک پہنچ سکیں) ایک نوع کا Cultist ادب تخلیق کرنے میں مشغول ہیں۔ روس اور جاپان اور مغربی ممالک میں رسالوں اور ادبی کتابوں کے قارئین کی تعداد لاکھوں اور کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ اردو میں رسالے اور کتاب کا ایڈیشن ایک دو ہزار سے آگے نہیں جاتا۔ لامحالہ

ہمارے اور قارئین کے ذہنی افق بھی اتنے ہی محدود رہیں گے۔ ہمارے چند سو یا ہزار اعلیٰ سطح پر لکھنے والے کونسل یا یو، ایس آئی ایس میں تازہ ترین کتابیں پڑھ کر ایک دوسرے سے ان کے متعلق تبادلہ خیالات کرتے ہیں، یا جو یونیورسٹیوں اور علمی ادبی اداروں سے وابستہ ہیں وہ سمیتا منعقد کرتے ہیں یا مختلف ادبی مشاہیر و اساتذہ کے ڈے مٹا لیتے ہیں۔

اب آپ اس بات کو مانیں یا نہ مانیں یہ سارے بحث و مباحثے ترقی پسندی، جدیدیت وغیرہ کے ایک بے انتہا محدود Cull کے لیے کیے جا رہے ہیں۔ ملک کے ساتھ کروڑ عوام سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ جاں نثار اختر چونکہ ساحر اور مجروح کے مانند سینما کے لیے بھی لکھتے ہیں۔ آواز اور متحرک تصویر سے وابستہ ناخواندہ سماج تک پہنچ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں 'گھر آگن' چونکہ Simplistic ہے اردو میں بھی زیادہ مقبول ہوئی ہے اور دیوناگری حروف میں چھپ کر بھی خوب پڑھی جائے گی۔

اس وقت یہ ادبی فصلی منظر نامہ ہمارا ہے۔ ان حالات میں ایک شخص اور ترقی پسند شاعر کی بازیافت اور تفصیلی تعارف میں سمجھتی ہوں اس نئے اردو رسالے کا کارنامہ ہے۔  
اب میرا کہا سنا معاف اور آگے مضامین پڑھیے۔



## ایران میں اجنبی

(ن.م.راشد)

ن.م.راشد اردو کے ایک روایت ساز شاعر تو خیر ہیں ہی، ایک بہت فیس انسان بھی ہیں۔ وہ ایک پر خلوص دوست ہونے کے علاوہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں دانشور کہا جاسکتا ہے۔ دراصل راشد اور فیض دو ایسے نام ہیں جو اسکول کے زمانے سے سننے آئے تھے۔ جب ذرا بڑے ہو کر ان کی نظمیں پڑھیں تو سخت رعب پڑا، لیکن چند سال بعد ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ Normal Sweet قسم کے لوگ ہیں۔ فیض صاحب کے لیے فیملی فیلنگ کسی طرح استعمال کی جاسکتی ہے لیکن راشد صاحب چونکہ زیادہ تر امریکہ میں رہے ہیں ان سے ملنے کا موقع ہم Native لوگوں کو بہت زیادہ نہیں ملا۔ پہلی مرتبہ یاد نہیں، شاید سن 1958 عیسوی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر ان میں وہ آؤ اتر چھاپن نہ پایا جو اکثر نامور شخصیتوں میں اپنی مہودیت کے احساس کی وجہ سے آ جاتا ہے اور دوسرے کے لیے خاصہ Embarrassing ہوتا ہے۔ راشد صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا سنس آف ہیور اور وہ بھی برطانوی قسم کا، یعنی

موصوف انڈر رائٹمنٹ کے قائل ہیں۔ بہت عرصہ کی بات ہے راشد صاحب ان دنوں عراق میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنی تازہ نظم اٹھارہ ٹالوی کولندن بھیجی تھی اور بی بی سی کے اردو سیکشن میں ہم سب بیٹھ کر اس کے ایک مصرعہ پر غور کرتے رہے۔ 'سلیمان سر بزانو اور سہاویراں' ٹھیک سے یاد نہیں، بہر حال کچھ اسی قسم کا مصرعہ تھا۔ لیکن اس وقت سے بہت پہلے سے راشد صاحب شرقی عاشق کی اساطیری اور پرانی تہذیبات کا بڑا خوبصورت استعمال کر رہے تھے۔ علامت اور تلمیح کے ذریعہ اپنے دور کی معلومات پر تیسرہ قاری اور اردو شاعری کی قدیم روایت ہے۔ لیکن راشد نے جدید ایرانی شاعری سے گہری واقفیت کی بدولت ان تلمیحوں اور استعاروں کو ایک بڑی انوکھی اور دل آویز زینت بخشی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں راشد صاحب ایران میں تعینات تھے جب سے ان کی اس ملک سے جان بچان ہے۔

کئی برس بعد میری ملاقات اتفاق سے ایران میں ہوئی اور بالکل اچانک۔ یہ اکتوبر 1967 عیسوی کا ذکر ہے۔ شہنشاہ ایران کا جشن بہت شان و شوکت سے منایا گیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں ایران گئی ہوئی تھی۔ ایران میں ایک صنعتی نمائش گئی تھی۔ شاہ باغ فرح نے نمائش کا افتتاح کیا تو ایک بہت بڑا جہم سفارت خانے کے لوگ وغیرہ وہیں جمع تھے اور سب کے سب ایک طویل جلوس کی صورت میں اہلی حضرت اور علیہ حضرت کے پیچھے پیچھے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ میں پھرتی پھرتی ایک سنسان جگہ پر پہنچ گئی جہاں کسی دفتر کے چند خیمے لگے تھے۔ ایک خاموش روش پر ایک صاحب الگ تھلک چپ چاپ کھڑے نظر آئے، غور سے دیکھا تو ایران میں انجینیئر یعنی ن۔م۔ راشد تھے۔

اتنا، آپ یہاں کہاں وغیرہ وغیرہ کے بعد بتایا کہ یو این او کے دفتر اطلاعات کے ڈائریکٹر ہیں اور تہران میں زندگی کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ میاں شکر خوروں کو شکر خوب دیتے ہیں۔ اکتوبر سن انیس سو ہتر میں جب میں ایران گئی تو لانا انسان شائع ہو چکی تھی ان نظموں میں ایک فلسفیانہ رنگ اور گہیر چاؤ میں نے پایا اور اک مخصوص ڈکشن جس میں جدید ایرانی شاعری کی جھلک بھی تھی۔ راشد صاحب کو مومنا Reactionary سمجھا جاتا تھا لیکن اس مرتبہ بے حد غیر

Reactionary معلوم ہوئے۔ موصوف میں شرقی وضع داری کے جوہر موجود ہیں، مغرب میں قیام کی وجہ سے ایک مخصوص رکھ رکھاؤ اور پالش آچکا ہے جو سستی مغربیت زدگی سے بالکل علاحدہ شے ہے۔ ن.م. راشد کی موجودہ بیگم صاحبہ انگریزی، غالباً نصف انگلیں ہیں اور کافی عرصہ امریکہ میں رہ چکی ہیں۔ راشد صاحب کا طرز رہائش انگریزی ہے، دماغ شرقی، قلب غالباً ملی توازن اور اسکیل مغربی۔ راشد صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بے وقوفوں کو برداشت نہیں کر سکتے اور دوستوں کے لیے بے وقوفی سے پر ہیں۔ راشد تخلیقی فن کار کے بنیادی Vision اور اس فطری توسیع کو بہت اہمیت دیتے ہیں ان کے تازہ ترین مجموعہ کلام 'لامساوی انسان' کی چند نظمیں ایران میں، میں نے ان کے ساتھ بیٹھ کر آواز بلند پڑھیں اور یہ نتیجہ نکالا کہ Poetry is a Condition of Music والی بات ان کی نظموں کے سلسلے میں صحیح ہے۔ اس ضمن میں موسیقی کے پس منظر میں آپ ایران و شرقی عاشق کی رد مانگ فکری اور جدید فارسی ترکیبوں سے آراستہ اردو اشعار کا فطری پہلو ملاحظہ فرمائیے اور 'تو' کے لفظ کے ساتھ ایک ڈرامائی تکرار:

جہاں زاد، نیچے گلی میں تیرے در کے آگے  
یہ میں سوختہ سر حسن کوڑھ گر ہوں!  
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار عسف  
کی دکان پر میں نے دیکھا  
تو تیری نگاہوں میں وہ تاب ناک تھی  
میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا  
جہاں زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!  
اے عشق ازل کیر وابد تاب، میرے بھی کچھ خواب  
میرے بھی ہیں کچھ خواب!

یا تعارف سے

اجل

ان سے مل

کہ یہ سادہ دل

نائل صلوٰۃ اور نائل شراب

نائل ادب، نائل حساب

نائل کتاب....

نائل کتاب اور نائل مشین

نائل خلا اور نائل زمیں

فقہ بے یقین

اجل ان سے مت کر حساب...

اور نیچے:

'سنا لکڑہ کی رات'

ابھی سرحد سے میں لوٹا ہوں ابھی،

میں ابھی ہانپ رہا ہوں مجھے دم لینے دو

راز وہ ان کی نگاہوں میں نظر آیا ہے

جو ہم گہرا ناویدہ زمانوں کی طرح!

یاد کی آگ دہک اٹھی ہے

سب تمناؤں کے شہروں میں دہک اٹھی ہے

آج دروازے کھلے رہنے دو

شاید اس رات ہمارے شہدا آجائیں!

میں نے دریا کے کنارے انھیں بچوں دیکھا ہے

میں نے جس آن میں دیکھا ہے انھیں



شاید اس رات ہی،

اس شام ہی،

دروازوں پہ دستک دیں گے!

ن.م. راشد میں نے سنا ہے United Nations کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور  
اتلی میں مستقل طور پر رہتے ہیں۔ معلوم نہیں آئندہ ان سے ملاقات برازیل یا میکسیکو میں ہو۔ آج  
کل کچھ چیزیں کون کہاں پایا جائے گا۔

اس دور سے، اس دور کے سوکھے ہوئے دریاؤں سے،

پھیلے ہوئے صحراؤں سے اور شہروں کے ویرانوں سے

ویرانہ گروں سے میں حزیں اور اداس!

اے عشق ازل کیر و ادب تاب

میرے بھی ہیں کچھ خواب!

(بشکریہ اردو سروس آل انڈیا ریڈیو)

---

(’کنٹیکٹو‘ ایڈیٹر علی سردار جعفری، ممبئی، ستمبر 1975، ہفت روزہ ’ہماری زبان‘، دہلی 1975)



## سرودِ شبانہ (فیض احمد فیض)

ابھی چند روز قبل علی گڑھ میں، میں نے نواب منزل اللہ خاں شیروانی کے صاحبزادے کی ذاتی لائبریری میں ایک نادر و بے بہا کتاب دیکھی جس کے سرورق پر شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے چند سطور میں اپنے ہاتھ سے سقوطِ بغداد کا احوال قلمبند کیا ہے۔ کس طرح مغول نے دجلہ عبور کیا وغیرہ۔ جلدی میں پوری عبارت نہ پڑھی جو کجگور سے بنی ہوئی روشنائی میں لکھی گئی تھی۔ آخر میں دستخط مصلح الدین المستمیر بہ سعدی۔

شیخ سعدی نے بغداد کی تباہی دیکھی، تاتاریوں سے بچ کر نکلے تو فلسطین میں صلیبی جنگ جاری تھی وہاں ان کو یورپین فوجیوں نے پکڑ کر قید میں ڈال دیا۔ دس دینار دے کر حلب کے ایک تاجر نے چھڑایا۔ سعدی کی قیمت دس دینار لگی تھی۔

معاملہ سارا یہی ہے کہ ہر زمانے میں یورشِ تاتار کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتی ہے اور آج ان شہروں پر صلیبی سرداروں کی اولاد اور ان کے ساتھی گولہ باری میں مصروف ہیں۔

کن کن شاعروں نے دنیا کو کیا کیا دیا اور دنیا نے ان پر کیا ستم ڈھائے ان کی فہرست بنانی چاہیے۔ اس میں بھی آفت رسیدہ جہان سوئم کے شعرا ہی بازی لے جائیں گے۔

ہر مہدا اپنے ایک شاعر کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ فیض صاحب کا دور ہے اور یہ دور نقش فریادی کی اشاعت کے وقت سے چلا آ رہا ہے، فیض صاحب کی کیونزیم، 'روس دوستی'، 'بھارت نوازی'، 'بنجایت'، بے پناہ مقبولیت، یہ تمام چیزیں آپ کو کتنی ہی کھلتی ہوں آپ ان کے متعلق کچھ نہیں کر سکتے۔ اب یہ یوہت آچکی ہے کہ مغرب کے Pop Stars کی Groopies کی طرح خواتین شہروں شہروں فیض صاحب کے پیچھے چلتی ہیں۔

(حال ہی میں جب فیض صاحب لکھنؤ گئے تھے، ایک اردو روزنامے نے لکھا کہ فیض احمد فیض پنجابی زبان کے علمبردار اور اردو کے مخالف ہیں۔ لہذا ان کی یہاں پذیرائی نہ کی جائے۔ اور جوں ڈاکٹر ایچ مرزا پاکستان کے چند اخبار ان کو 'بھارت نواز' کہتے ہیں۔ رہی ان کی کیونزیم تو وہ الم نشرح ہے) فیض صاحب اب ایک Super Star ہیں۔ اردو افسانہ و ناول نگار کے برعکس اردو شاعر ایک پرفورمنگ آرٹسٹ بھی ہوتا ہے۔ شاعروں کے ذریعے اس کا گہرا رابطہ عوام سے قائم رہتا ہے اور وہ براہ راست لوگوں کے دلوں سے بات کرتا ہے۔ فیض صاحب ان خوش قسمت شعرا میں سے ہیں جو خواص و عوام دونوں کو خوش آتے ہیں حالانکہ موصوف بہت قابل ذکر پرفورمنگ آرٹسٹ نہیں ہیں۔ نہ ترنم سے بڑھتے ہیں نہ ان کا تحت الفاظ تہلکہ خیز ہے مگر ان کا کام اتنا سحر انگیز اور دل پذیر ہے اور وہ شخصیت کا ایسا Charismatic رکھتے ہیں جو بہت کم لوگوں کو میسر آیا ہے۔

دوسرے بہت اہم شاعر ن.م. راشد نے آزاد شاعری کا پودا لگایا لیکن ان کے کام کے Intellectual Content اور مشکل پسندی نے ان کو خواص تک محدود رکھا۔ یوں بھی ان کے اور فیض صاحب کے درمیان میں بہت فرق تھا۔

ایک بات قابل غور ہے۔ اقبال فیض اور راشد تینوں پنجابی۔ تینوں اس علاقے کے باشندے جس کو ہم تک چڑھے یوپی والے اک صوبہ پنجاب ہے معلوم نہیں کیوں، الاپ کر اپنی دانست میں گویا بڑا تیر مارا کرتے تھے اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اہل پنجاب جن کی مادری

زبان اردو نہیں، اردو محاورے اور روزمرہ سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ لب و لہجہ ان کا اتنا مختلف انھیں اردو سے ایسا قلمی لگاؤ کیوں ہوا؟ مثال کے طور پر پشتو، بلوچی اور سندھی علاقوں نے اردو کے جید شاعر اور ادیب کیوں نہ پیدا کیے یا لکھنؤ اور دہلی کے بجائے لاہور اردو ادب و صحافت کی راجدھانی کیسے بنا؟

اس کی ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہے۔ انتہائی شائستہ اور تعلیق لیکن شکست خوردہ دہلی، یوپی، بہار 1857 عیسوی کے بعد بھی باقی دنیا کو (یعنی ان لوگوں کو جو دہلی تلگ دھن میں جنم لینے کا شرف نہ رکھتے تھے) Barbarians سمجھا کیے۔ ان کے برعکس میڈیول پنجاب برطانوی فتح کے بعد اچانک دور جدید میں داخل ہو گیا (پنجابی تاریخی وجوہ کی بنا پر ہمیشہ سے سخت جان اور ہم جو رہا ہے) اور نئے برطانوی دور میں اس کے اندرونی امریکنوں والی فرنٹیر اسپرٹ Frontier Spirit پیدا ہوئی۔ ایک لحاظ سے پنجابیوں کو اس برصغیر کا امریکن کہا جاسکتا ہے۔

لیکن ہم اہل زبان لوگ پنجاب کو ڈامیلڈ ویسٹ ہی سمجھا کیے۔ ہم پنجاب کی اس توانا کلرفل Robust کلچر سے ناواقف تھے جو غزنوی عہد سے لے کر سکھوں کے زمانے تک وہاں پھیلی پھولی اور جسے میں پنجابی پرشین سکھ کلچر کا نام دے سکتی ہوں اور اس کے پس منظر میں وہ سدھوں، جوگیوں اور راجاؤں کا پنجاب تھا اور عہد مغلیہ میں اس نے وہ بڑے صوتی شعرا پیدا کیے جن کی تخلیقات عالمی ادب کے بہترین سرمائے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ پنجاب کے رومان، وہاں کی لوک سنگیت اور ناچ اور وہاں کی صوفیانہ داستانیں اور صوفیانہ موسیقی یہ ایک علاحدہ دنیا تھی جس پر خود تعلیم یافتہ پنجابیوں نے غور کرنا کافی عرصے بعد سیکھا۔ چنانچہ ہندوستانی اور پاکستانی پنجاب میں پنجابی نیشنلزم کے فروغ پر ہم کو حجب نہ ہونا چاہیے (سوال یہ ہے کہ اگر فیض احمد فیض کی مادری زبان پنجابی ہے تو وہ اس زبان میں بھی شعر کیوں نہ کہیں۔ میں نے لاہور میں فیض صاحب سمیت پنجابی دانشور وہاں کے عوامی شاعر استاد امام دین اور استاد دامن پر بے انتہا غور کرتے پایا ہے۔ یہ لسانی موٹلزم بھی ہمارے معاشرے کی ایک خصوصیت ہے۔ اقبال جب اپنے آپ کو اقبال کہتے تھے تو اہل زبان ان پر جیسے تھے۔ خود میں نے ایک مرتبہ فیض صاحب سے کہا

تھا کہ 'خیر ہو تیری لہلاؤں کی' میں پنجابیت بہت ہے!)

ہائی اسکول میں ایک سبق اس طرح شروع ہوتا تھا '1874 عیسوی میں مولانا محمد حسین آزاد نے کرل پارلیمینٹ کے ایمپرائیڈ کے ایما پر لاہور میں ایک مشاعرے کی بنا ڈالی۔ انگریز کی لسانی حکمت عملی ہر صوبے کے لیے مختلف تھی۔ وادی گلگت و جن میں انھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی۔ غدر کے بعد مسلم معاشرے کو برباد اور تہہ دہلا کر دیا تھا۔ یہاں مسلمان تہذیبی طور پر حادی رہے تھے۔ لہذا ان کو مزید کچلنے کے لیے سر اسٹینی میکڈاول نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ پنجاب میں حکومت سکھوں سے چھینی تھی وہاں ہندو مسلم سکھ تینوں فرقوں کا طرز زندگی بہت حد تک یکساں تھا۔ پنجابی مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی کرنے کے لیے ان کی دل جوئی اور ہمت افزائی بھی منظور تھی۔ وہاں اردو روزی روٹی کی زبان بنائی۔ جس طرح یوپی ممالک متحدہ آگرہ و اودھ سے انھوں نے تجربہ کار دہلی افسر پنجاب کے انتظام اور آب پاشی کی نہریں کھدوانے کے لیے بھیجے۔ اسی طرح اردو پڑھانے والے یوپی سے گئے۔ اور پنجاب نے آنا فانا ایک عدد علامہ اقبالؒ پڑھیں کر دیے اور ان کے بعد ایک سے ایک اچھے مسلمان ہندو سکھ شاعر اور ادیب۔

لیکن اہل لکھنؤ اقبالؒ کی زبان پر معترض رہے جس زمانے میں یوپی کے اردو والوں کو غم روزگار لاحق نہ تھا، وہ اور 'نیا زمانہ' لاہور ایک دوسرے سے بکثرت چٹکھی لڑا کرتے تھے۔ اب یوپی میں خود اردو کی جان کے لالے پڑے ہیں۔ وہ بادۂ شبانہ کی سرستیاں کہاں۔ پنجاب میں زبان اور فوک اور قبائلی کلچر تقریباً یکساں تھی (پنجابی ہندو اور سکھ آج تک خدا کو رب اور ربا کہتا ہے۔ یوپی کا عام ہندو رب کہتا ہوا نہیں پایا جائے گا۔ 1857 عیسوی کے بعد اردو نے ان تینوں فرقوں کو مزید ایک لڑی میں پڑ دیا۔ صورت حال کا ایک بنیادی تضاد یہ تھا کہ کٹر فرقہ دارانہ رجحانات آریہ سماج اور مسلم فرقہ پرستی نے بھی پنجاب ہی میں زور پکڑا۔ گوسا را آریہ سماجی پریس اردو میں تھا۔ آریہ سماجی اور سناٹن دھرم دونوں لٹریچر اردو میں شائع ہوتے تھے۔ آج تک ہر دو اور کی دوکانوں میں پنجابی زائرین کے لیے زیادہ تر دھارمک کتابیں اردو رسم الخط میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔)

ایک اردو داں پنجابی ہندو اور سکھ جس طرح اقبال اور فیض پر سر دھتا ہے اس میں لاشعوری طور پر قبائلی تفریق بھی کارفرما ہے جس طرح اہل پنجاب ہندو مسلمان اور سکھ فیض صاحب کے شیدائی ہیں، یوپی اور بہار اور دلی کے مسلمان اور ہندو اکٹھے ہو کر کسی واحد ادبی شخصیت کے لیے اس طرح کی والہانہ عقیدت کا اظہار نہ کریں گے کیونکہ وادی گنگ و جن کی لسانی اور تہذیبی محویت میں اس قسم کی مشترکہ پرستش کی گنجائش نہیں۔ اس کی ایک مثال پریم چند کا معاملہ ہے جن کے متعلق ہندی اور اردو والے مستقل ایک دوسرے سے رسہ کشی میں مصروف ہیں۔

لاہور میں محمد حسین آزاد اور کرنل ہالرائڈ کے بعد مخزن کا دور آیا۔ اس کے بعد کے دور کے متعلق فیض صاحب نے ’دست تہ سنگ‘ کے دیباچے میں لکھا ہے۔ ”20 مئی، 30 مئی تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجیب طرح کی بے لگاری آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا، جس میں اہم قوی سیاسی تحریکوں کے ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سامنا ہوا تھا۔ شعر میں اولاً حسرت موہانی اور اس کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی۔ افسانہ میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔

(نقش فریادی کے پہلے حصے میں 28 مئی، 29 مئی سے 34-35 مئی تک کی چیزیں شامل ہیں)

”نقش فریادی کی ابتدائی نظمیں خدادادہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو، مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو، نہ نجوم ہیں چاندنی کی تہ میں وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اسی فضا میں ابتدائے عشق کا قہر بھی شامل تھا لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ پائے تھے کہ صحبت یا آخر شد۔ پھر دہس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھٹے شروع ہوئے کالج کے بڑے بڑے پائے تیس مارغاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھاٹکتے گئے۔ اجڑے ہوئے کسان کھیت کلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے گھر کے

باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا ہوا تھا۔ یکا یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر کبھی راستے بند ہو گئے اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ "نقش فریادی کے پہلے حصے کی آخری نکتوں میں اس کیفیت کی جھلک ملتی ہے۔

1935 عیسوی میں فیض صاحب امرتسر کے ایک کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ یہاں ان کی ملاقات دہرہ دون کے صاحبزادہ محمود ظفر اور ان کی بیوی یعنی رشیدہ آپا سے ہوئی۔ رشیدہ آپا نے فیض صاحب کو کیولٹ مٹی فیسٹو پڑھنے کو دیا جس کو پڑھ کر موصوف پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گیان حاصل ہونے کے بعد فیض صاحب نے اپنی مشہور نظم نکسی، مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ۔

اسی زمانے میں 1938 عیسوی میں ترقی پسند تحریک باضابطہ شروع ہوئی۔ 1938 عیسوی میں علامہ اقبال نے رحلت فرمائی۔ محمد حسین آزاد کے بعد سے لے کر ن.م. راشد اور فیض احمد فیض کی آمد کے وقت تک اردو ادب پر اقبال کی چھتر چھایا موجود تھی۔ (اقبال، غالب کی طرح Timeless اور بہت اونچے تھے۔ ان سے منفرد تھی۔ ترقی پسندوں نے ان کو رجعت پسند کہا لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا) آل انڈیا ریڈیو کا نیٹ ورک پھیلا یا جا رہا تھا۔ پطرس بخاری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے قارئین تحصیل طلباء جو پنجاب کے دانشوروں کی Cream سمجھے جاتے تھے۔ بہت سے آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہو چکے تھے۔ جنگ چھڑی۔ لاہور کے ان ہی دانشوروں میں سے ایک کرنل مجید ملک فوج کے منکر تعلقات عامہ میں پتے گئے تھے جن کے اصرار پر فیض صاحب نے بھی کنٹریکشن لے لیا۔ اس وقت حنیف جالندھری (مصنف شاہنامہ اسلام) بھی سرکاری سوگ پبلیٹی میں شامل، یہاں دن پڑوں کہے جو کہے میں تو چھوڑے کو بھرتی کرا آئی رے، لکھ رہے تھے۔

اب آزاد ایک اور فوٹو گراف کھینچتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے آخری سال قحط بنگال کے متعلق اخبارات میں ذین العابدین کی تصویریں چھپ رہی ہیں۔ دانت جو نداری کا 'بھوکا ہے بنگال' رے ساتھی، مجاز کا 'راج سنگھاسن



ڈانوا ڈول اور فیض احمد فیض کی 'مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' نوجوانوں کے 'قوی ترانے' بن چکے ہیں۔ کنبہ لال کپور کی 'غالب ترقی پسند شعرا کی محفل میں' نے آفت جوت رکھی ہے۔ پروفیسر غنیمت احمد غنیمت کی نظم 'فون آیا دل زار' بھی سب کو یاد ہو گئی ہے۔

پارک ساہیلہ تارکھ قریل باغ دہلی میں چچا مشتاق احمد زاہدی کے مکان کے برابر والے گھر میں لیٹھینٹ کرل فیض مع اپنی ولایتی بیوی کے مقیم ہیں۔ چچا زاہدی کے ہاں ضعیف العمر نواب سائل دہلوی آ کر تخت پر چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ گویا ایک طرف عہد رفتہ کی آخری یادگار اور دوسری طرف عہد نو کے نقیب، گونم، راشد کے برعکس پروفیسر غنیمت احمد غنیمت داغ و سائل کی شعری روایت کے مخالف نہیں۔

پارک کی دوسری طرف ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور قریب چند قدم کے فاصلے پر ریلوے کے مظہیر شمس دو دنوں کی بیگمات جرمین، اتوار کے روز چچا زاہدی کے فرزند اکبر نور الدین احمد بیرسز مع اپنی انگریز بیگم نہر سعادت خاں سے آ جاتے۔ ان تینوں ولایتی بیگمات کا آپس میں مکمل جہل تھا خصوصاً مسز سلیم الزماں اور مسز نور الدین احمد۔ لیکن ایک روز پارک میں ٹپکتے ہوئے مارگریٹ شمس نے چپکے سے کہا "یہ انگریز لوگ ہمارا دشمن ہے۔ ہمارے ملک کو برا کر رہا ہے۔" اس زمانہ میں یورپ میں گھمسان کارن پڑ رہا تھا۔ ہلا کو خاں اب بنگلہ کے روپ میں ظاہر ہوا تھا اور کرل فیض احمد فیض اپنے انٹرنیشنل روپ کے باوجود برطانوی وردی پہنے فطانت کے خلاف انگریزوں کی مدد کر رہے تھے۔ یہ اس وقت کی پارٹی لائن تھی اور یہ کانگریسی قوم پرستوں کی لائن سے مختلف تھی۔ چچا زاہدی اور نور الدین احمد دونوں قوم پرست تھے اور ڈاکٹر سلیم الدین صدیقی کے بھائی چودھری ظلیق الزماں مسلم لیگ لیڈر۔

یہ منظر نامہ بالکل ٹپٹ ہونے والا تھا۔ مسز مظہیر شمس اور مارگریٹ شمس کی بڑی لڑکی آمنہ نے رائل انڈین ایئر فورس کے ایک نو عمر انگریزی ناپٹھان افسر امیر خان سے شادی کر لی۔ وہ چودھری ظلیق الزماں کی نئی مملکت پاکستان کی ایئر فورس میں ایئر مارشل تک ترقی کرنے والے تھے لیکن اس وقت کوئی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ اس قدر کم گوار صاحب آدمی ایک روز پاکستان کے

حزب مخالف کا ایک کھدر پاش لیڈر بن جائے گا۔ نہ لیفٹیننٹ کرنل فیض کو مستقبل کے بلوریوں  
یالے میں شہر جیروت اور لوٹس رسالے کی ایڈیٹری نظر آئی تھی۔

پنڈت نہرو آدی پچھانے تھے۔ 1942 عیسوی میں انھوں نے فیض صاحب سے فرمائش  
کی تھی کہ وہ انٹرنیشنل کا محکمہ ترجمہ کریں! پرو فیسر فیض احمد فیض نے اپنے دور کی ترجمانی اس طرح  
شروع کی کہ لوگ چمک اٹھے۔ فیض کا اسلوب ایک پورے عہد کا شعری مزاج اور شناخت بن گیا  
اور بہت سوں نے کہا کہ موصوف اقبال کے بعد اہم ترین شاعر ہیں۔

ہمارے ہاں ادب میں ایک مشغلہ عرصے سے چلا آتا ہے جس کے ڈاٹے ہمارے  
ساتھ مشغلے یعنی مذہبی مناظر سے جا کر ملتے ہیں۔ نئی نئی ہم عصر اہل قلم کا ایک دوسرے سے موازنہ  
اور مقابلہ۔ شاعر دوں یا محققوں (اب ناقدین) کی فوجیں دونوں طرف صف آرا ہوتی ہیں۔  
ایک ہنگامہ رہتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یوپی میں کچھ لوگ کہتے تھے کہ جگر اقبال سے بڑا شاعر ہے!  
یہ فلاں فلاں سے بڑا اچھا ہے۔ وہی قلم انٹرنی کی Star Rating والا معاملہ ہے۔ اسی طرح  
پاکستان میں ایک حلقہ احمد عظیم کا کئی کواپنا سر شد مانتا ہے لیکن مریدین فیض کی تعداد بہر حال بہت  
زیادہ ہے۔

قلم انٹرنی میں عوام کی پسند نا پسند کے علاوہ ذاتی پہلی اور پبلک ریلیشنز پر بھی لاکھوں  
روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ادب میں یہ پرسنل پہلی ترقی پسند تحریک کے زمانے  
سے شروع ہوئی۔ اس سے قبل لکھنے والے زیادہ تر شوقیہ ادیب تھے اور نقادوں کی ایک باقاعدہ  
جماعت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں نئی پریم چند کے علاوہ کوئی بھی پروفیشنل  
ادیب نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی ادبی تنقید بنجیدہ ہوئی اور طرف دار بھی۔ حلقہ ارباب  
ذوق پیدا ہوا گھمسان کے دن پڑے۔ ترقی پسندوں نے ایک دوسرے کے متعلق تو صیغی کتابچے  
لکھے۔ ادھر میراجی کا CULT تیار ہوا۔

ہم غریبوں کے مفلس ادب میں تو اس طرح کی پہلی کا خواب بھی نہیں دیکھا جاسکتا جو  
مغرب میں ناشرین ایک کتاب لانچ کرنے سے پہلے کرتے ہیں۔ ساتھ کروڑ آبادی کا

ہندستان۔ دس کروڑ پاکستان کی رکھ لیجیے۔ اس میں ایک ہزار کا ایڈیشن ایک کتاب کا چھپتا ہے اس کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے طرم جنگ ہو گئے۔ ایک ہزار کے ایڈیشن کے لیے کون ذمہ لے جائے گا۔ جو کچھ موافقت یا مخالفت یا چرچا ہوتا ہے وہ ناقدین ہی کر لیتے ہیں۔ قول عام کی سند محض چند ہزار پڑھنے والوں سے ملتی ہے۔ شاعروں کا آؤٹس البتہ وسیع تر ہے گو ہمارے ہاں یہاں بھی خصوصاً جب سے ادبی انعامات کا سلسلہ شروع ہوا ہے پلٹنی ایڈ پبلک ریلیشنز کا وہ مقام نڈل سکا جس کے وہ مستحق تھے، فیض صاحب نے کہا ہے کہ ”مصونی صاحب سے کم درجے کے شاعر اور رائٹر نے وہ شہرت حاصل کر لی۔ شہرت حاصل کرنے کی کوئی ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ بعض حضرات خود اس بات کا حساب رکھتے ہیں کہ وہ کتنے مشہور ہیں اور مزید شہرت کے لیے کیا کیا بندوبست کرتا ہے، اس کے لیے وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن کا علم داب سے تعلق نہیں یہ ایک الگ فن ہے اور مصونی صاحب اس فن سے واقف نہیں۔“

عالمی 1947 عیسوی کے لگ بھگ فیض صاحب فوج چھوڑ کر پاکستان ٹائمر کے چیف ایڈیٹر ہو گئے۔ سبط حسن اور جے بھائی بھی کیونسٹ پارٹی کی طرف سے پاکستان بھیج دیے گئے تھے۔ اب لاہور میں ایک بے حد سرخسار فرخ آبادی گروپ جمع ہو گیا۔ نظریاتی کڑپن اس گروہ کا ایک وصف تھا۔ اسی قسم کا کڑ گروہ اس وقت بمبئی میں جمع تھا۔ ان حضرات میں سے اب کافی عرصے سے کوئی بھی کڑ نہیں رہا لیکن فیض صاحب کی ذہنی چٹنگی اس چڑ سے ظاہر ہوتی ہے کہ جن دنوں یہ سارے ترقی پسند حضرات اقبال کو فسطائی پکارتے تھے۔ محض فیض صاحب اس انتہائی پسندی کے مخالف تھے اور اس زمانے میں انھوں نے اقبال ہی کے رنگ میں وہ خوبصورت چڑ لکھی تھی۔

آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر  
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں مگر رگیا  
سنسان راہیں غلط سے آباد ہو گئیں  
دیران میکدوں کا نصیب سنور گیا

تھیں چہرے لٹا ہیں جو اس تک پہنچ سکیں  
 پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا  
 اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما  
 اور پھر سے اپنے دلیں کی راہیں اداں ہیں  
 چہرہ اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص  
 وہ اک لٹا ہیں چہرے عزیزوں کے پاس ہیں  
 پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے  
 اور اس کی لے سے نیکروں لذت شناس ہیں  
 اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال  
 اس کا دُور اس کا خروش اس کا سوز و ساز  
 یہ گیت مثل شعلہ جوالہ تند و تیز  
 اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز  
 جیسے چراغِ دشتِ صحرے سے بے خطر  
 یہ شمعِ بزمِ صبح کی آمد سے بے خطر

انہی دنوں پہلی مرتبہ فیض صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ کراچی میں میرے چچا زاد بھائی  
 اور بہن سید سعید حیدر اور بیگم ہندرا حیدر کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ میں نے چھوٹے ہی ان سے  
 نہایت بے وقوفی کا سوال کیا، ”فیض صاحب سنا ہے بنے بھائی آج کل پاکستان میں انڈر گراؤنڈ  
 ہیں۔ کس جگہ انڈر گراؤنڈ ہیں؟“

آپنا ذرا ایک نہایت دانشور خاتون ہیں، گو میری طرح ان کو بھی شعریا نہیں رہتے۔  
 انھوں نے فیض صاحب سے کہا۔ ”فیض صاحب وہ کیا عمدہ شعر ہے کہ:  
 جنے کیا جنے کیا جنے کا  
 اور جنے کیا جنے کیا جنے کیا“

فیض صاحب نے نہایت سنجیدگی سے سر ہلایا۔

کراچی میں ہمارے ہاں اور لاہور میں میرے Cousins لقمان حیدر اور بیگم لقمان حیدر اور جری احمد سید اور حمیرا سید کے ہاں فیض صاحب کی بڑی دلچسپ محفلیں رہتیں۔ پھر اچانک وہ غائب ہو جاتے۔ یعنی جیل چلے جاتے۔ اسی درویشانہ انداز سے واپس آکر ان محفلوں میں شامل ہو جاتے۔ فیض صاحب کو کسی نے برا فرد خستہ یا جھلایا ہوا نہیں دیکھا۔

سلسلہ پنڈی سازش کیس فیض صاحب چار سال قید میں رہے۔ اسی زمانے میں لندن میں ایک بار میں نے 'ڈان' اخبار کی شاہ سرخی دیکھی... سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو پھانسی کی سزا (بڑی خبریت ہوئی کہ بچ گئے) تو سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ وہ شاعر جس کے لیے جج جج سزائے موت کی خبریں چھپ رہی ہوں وہ:

مقام فیض کوئی راہ میں بچا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

محض رسوا نہیں لکھے گا۔

فیض صاحب کے منفرد اسلوب نے ان کو ڈبلیو ایچ آڈن کی طرح Poets Poet بنایا اور اقبال کے مانند انھوں نے ملکی سیاست میں نمایاں رول ادا کیا۔ بحیثیت انگریزی جرنلسٹ وہ پاکستان کے اہم ترین روزنامے کے ایڈیٹر رہے (پاکستان ٹائمز، ہندوستان کے بہترین انگریزی اخباروں کا مقابلہ کر سکتا تھا) مزید برآں پاکستان کی کوئی حکومت فیض صاحب کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔ ایک لطیفہ مشہور تھا کہ ہر نئی گورنمنٹ فیض احمد فیض کو Inherit کرتی ہے۔ میں نے کراچی اور لاہور میں اعلیٰ حکمرانوں کو فیض صاحب کی دربارداری کرتے دیکھا ہے جبکہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ اکثر شعرا اور ادیب اعلیٰ حکام کی دربارداری کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی فیض صاحب کو سراہا جو ان کی باتیں بازو کی سیاست کے مخالف یا خائف تھے۔ ذہن پرست دانش مند دروہوں کے اساتذہ سرکاری حکام سوسائٹی کی فیشن ایبل بیگمات، ان سب کی فیض صاحب سے ملاقات ایک Status Symbol قرار پائی۔

مجھے یاد ہے کہ 1958 عیسوی میں جب دہلی میں ایشین رائٹرز کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں لاہور سے فیض صاحب اور اعجاز حسین جٹالوی شرکت کے لیے گئے تھے۔ واپس آ کر اعجاز نے کہا ”فیض صاحب تو کانفرنس میں اشوک کمار بنے ہوئے تھے۔“ فیض صاحب کو جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہے اس سے سب واقف ہیں۔ سوویت یونین میں ان کی جو آؤ بھگت کی جاتی ہے، وہ میں چشم خود ملاحظہ کر چکی ہوں۔ ادھر مغرب میں کینیڈا، انگلستان، امریکہ جہاں جہاں اردو داں اور بالخصوص ہاٹل پنجاب آباد ہیں، وہ فیض صاحب کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔

تو کیا فیض احمد فیض کی اس ہر دلعزیزی میں ان کا کچھ Put-On بھی شامل ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ میں ایک بہت طویل عرصے سے فیض صاحب سے واقف ہوں اور اس دوران میں وہ ہم سے اہم تر اور مقبول سے مقبول تر ہوتے گئے۔ مگر ان کے بدھا ہڈ والے انداز میں ذرا فرق نہیں آیا۔

موصوف رنڈر رنڈ ایک Cult Figure میں تبدیل ہوتے گئے اور اب ایک نوع کے sage بن چکے ہیں۔ 1977 عیسوی میں ایک کتاب لاہور سے چھپی ’ہم کہ ٹھہرے اجنبی‘ جس کا عنوان دراصل ’مخوفات حضرت فیض شاہ جہاں دوست‘ ہونا چاہیے۔ اس میں موصوف کے ایک عقیدت مند نے جو ان کے ذاتی معالج بھی ہیں (نام ان کا ڈاکٹر ایوب مرزا ہے) ان سے مختلف ملاقاتوں میں سوالات کیے ہیں اور ان کا تشلی بخش جواب پایا ہے۔ ان مکالموں سے فیض صاحب کی دھبی پرسکون شخصیت، منکسر المزاجی، حق گوئی، غلو سے نیت، شائستگی، شدید حب الوطنی، غم خواری اور دردمندی، شرافت پس، جس مزاج بخوبی آشکار ہوتی ہیں۔ دنیا کے اہم ترین مسائل کو فیض صاحب (جن کو Bombast سے ہمیشہ سے للھی ہے) نہایت سلاست اور نرمی سے حل کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک روز کافی دیر خاموش رہنے کے بعد حضرت کہنے لگے ”بھئی میں نے تو چین پر تین نظمیں لکھی ہیں۔ روس پر تو ایک بھی نہیں لکھی۔ مجھے یہ چین اور روس کا جھگڑا پسند نہیں... روس سمجھتا تھا میں بڑا چودھری ہوں... اب چین بھی محنت اور خود بخاری اور Self-Reliance کے تحت بڑا چودھری ہو گیا ہے... مسئلہ تو چودھراہٹ کا ہے۔“

مرید: فیض صاحب اتنے بڑے مسئلے کو آپ اتنا سادہ سمجھتے ہیں۔  
مرشد: تو بھی اس میں رکھائی کیا ہے۔

مرید: Revisionism

مرشد: لاقول ولا قوۃ مارکسزم کوئی Dogma نہیں ہے۔ یہ تو سائنس ہے۔ اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس میں سے جو اصول اور مفروضے تجربے سے لاپلا ثابت ہوں انہیں Revise کرتے رہنا چاہیے۔“

مرید: مزید لکھتا ہے: ”ایک دن ہم بچہ بیٹھے،

فیض صاحب یہ کیا فراڈ ہے۔ کہنے لگے کون سا فراڈ؟ میں نے کہا یہ M.B.E. کا ایوارڈ اور پھر آپ لیسن انعام یافتہ بھی ہیں۔ فرمایا بھی اس میں الجھن کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے فوج اس لیے Join کی تھی کہ فاشزم کے خلاف اپنی جدوجہد کی کامیابی تصور کیا۔ یعنی علامہ اقبال کو بھی تو سر کا خطاب ملا تھا۔ وہ اس لیے تو نہیں ملا تھا کہ خاتم بدین وہ انگریز دارا کے پھوٹے۔

میں نے کہا فیض صاحب مسلم لیگ تو ایک قسم کی نوابوں اور جاگیرداروں کی کچھڑ تھی جسے قائد اعظم عوام کی طاقت کے تلے بوتے پر پٹا کھینچتے رہے۔

فیض کہنے لگے ”بھئی مسلم لیگ جو تھی وہ تھی اور پھر آزادی کے بعد نائل قیادت کے ہاتھوں جس انجام کو پہنچی اسے وہاں لامحالہ پہنچنا ہی تھا۔ مگر یہ کچھڑ والی بات نہیں.... یہ باقاعدہ ایک سیاسی تحریک تھی ہندوستان میں بہت بڑی اقلیت کے مفادات کے تحفظ کی تحریک....“

مرید: فیض صاحب جب آپ کو پکا یقین ہو گیا کہ انگریز بہادر ہندوستان کو روس کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے تو ہمیں نوزی لینڈ آسٹریلیا کی قسم کا ڈومینین اٹلیس دینا چاہتا ہے تو پھر آپ کے ذہن پر کیا گزری؟

کیا گزرتی۔ ہم نے کہا لعنت بھیجی فوج کی نوکری پر جو ہمارے لیے اب بے مقصد ہو چکی تھی....“

چنانچہ فیض صاحب نے دہلی سے لاہور آکر چڑجی ڈائرکٹر انجکشن سے کہا کہ جنگ ختم

ہو گئی ہے ہماری استادی لوٹا دو۔ چڑتی بہت حیران ہوئے کہ بھی فیض فوج سے باہر آ کر کیا کرے۔ G-1 کے چسکے تم نے لیے، جس تم نے کیے بنگلہ اردلی ہمارے پاس۔ تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ میں نے کہا ڈھائی ہزار روپے، چڑتی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے بھی میری صلاح یہی ہے کہ فوج سے واپس تعلیم میں مت آؤ۔ ہم نے چڑتی کو سمجھایا کہ ہمیں بنگلہ وغیرہ نہیں اور ڈھائی ہزار تنخواہ بھی نہیں چاہیے۔ ہمیں بس صرف پانچ سو روپے ماہانہ مل جائیں تو نقد پر سنور جائے۔۔۔۔۔“

لیکن پھر رکی سب سے اونچی تنخواہ ساڑھے تین سو روپے تھی اس میں گزر کر نامشکل تھا۔ فیض صاحب دلی واہیں گئے۔ اسی زمانے میں میاں افتخار الدین نے ان کو اپنے نئے اخبار پاکستان ٹائمز کے لیے چیف ایڈیٹر کی پیش کش کی اور فیض صاحب واپس لاہور پہنچے۔ ایک مرتبہ اسلام آباد میں فیض صاحب محکم تھے۔ ایک شام مرید نے ان سے پوچھا، فیض صاحب یہ ہماری ترقی پسند مصنفین کی فن کدھر گئی۔ کہنے لگے بھی حرم ہوا ہم تو اس سے الگ ہو گئے تھے۔

مرید نے سوال کیا، فیض صاحب ترقی پسند مصنفین کے متر حسین نے یہ الزام لگایا تھا کہ یا انجمن دراصل کمیونسٹ پارٹی کا بغل بچہ ہے۔

مرشد: بھی یہ ہرگز نہیں تھا۔ فنی پریم چند کا کمیونسٹ پارٹی سے کیا واسطہ۔ پھر مولانا سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا حسرت موہانی کہاں کے کمیونسٹ تھے؟ ہم خود کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے۔ اس غلط پروپیگنڈے کی دو جہتیں ہیں تقسیم ہند سے قبل انگریز حکومت نے اس انجمن کے بارے میں سب سے پہلے یہ لیبل لگایا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد نوآبادیاتی نظام نے نیا روپ دھار لیا۔ امریکہ کے ایٹم بم کے خلاف عالمی امن کمیٹی نے ایک اسٹاک ہوم امن اپیل جاری کی۔ یہ اپیل روسی قیادت کے زیر اثر تھی۔ ہمارے ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے بھی اس امن اپیل پر دستخط کرنے کی ہدایت جاری کی۔ دوسرے انجمن میں باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی، کسان کمیٹی ٹریڈ یونین کے لوگ بھی شریک ہو گئے تھے یا انجمن کے ممبروں نے یہ پارٹیاں جوائن کر لیں۔ بھی مطلبی فریڈ آبادی بھی تو تھے، ان لوگوں نے انجمن میں ادب کا Realism سے Committed Socialist Realism کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ یہ ہمارے ملک کے



مخصوص سماجی اور سیاسی حالات میں ممکن نہ تھا۔ اگر غربت، افلاس اور ناداری کی عکاسی کرتے وقت اس کے منبع کی نشاندہی کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ سرکار برداشت کرے مگر جب آپ اس کا علاج تجویز کرنے لگیں تو پھر رجعت پسند طاقتوں اور حاکم وقت کا حملہ یقینی ہوتا ہے۔ اب اصولاً بات درست ہے۔ اگر آپ بیماری کی تشخیص کر پاتے ہیں تو پھر اس کا علاج تجویز نہ کرنا بددیانتی ہے اور پھر مجوزہ علاج سے اس بیماری کا قلع قمع نہ کرنا مزید بددیانتی ہے۔ Realism کی معراج Committed Socialism ہے لیکن ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا یہ ابتدائی مسلک نہ تھا جیسا کہ اس کے جینی فیسٹو سے عیاں ہے لہذا Confusion! تعلیم اور علاج کی تحریکوں نے زور پکڑ لیا۔

مرید: فیض صاحب یہ تحریک آپ کے خیال میں کامیاب رہی؟

مرشد: بھئی ایک طرح سے تو یہ کامیاب رہی کیونکہ گلشن ادب میں اس تحریک نے ایک نئی طرز فہاں دی۔ دوسرے لحاظ سے اس تحریک کو دھکا لگا دہ ہمارے چند دوستوں کی وجہ سے۔ بھئی 1949 عیسوی میں احمد ندیم قاسمی انجمن کے سکریٹری تھے حکم ہوا کہ علامہ اقبال کو Demolish کریں اور عصمت چغتائی منسٹر اور ن م برداشتہ کو Exterminate کریں کہ یہ ترقی پسندوں کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ ہمیں یہ بک بک لگی۔ علامہ مرحوم کے ہاں بے پناہ ذخیرہ سامراج، جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف ملتا ہے، یہی قصہ منسٹر وغیرہ کے ساتھ تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ہماری ان سے جنگ ہو گئی۔ ہمارا موقف تھا کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کو اس کی Totality اور عصری تقاضوں کے Perspective میں پرکھا جاتا ہے اور اس کے ادب پارے کے کسی ایک ٹکڑے سے اس کی Contribution کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا جائزہ حقائق کے خلاف ہوگا اور باطنی طور پر ضعیف بھی... پھر ایک روز مظہر علی خاں کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی۔ صدر میر سے صدر تھے۔ قاسمی صاحب نے علامہ اقبال کے خلاف ایک بھرپور مقالہ پڑھا۔ ہمیں بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا، یہ کیا تماشا ہے۔ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو سکہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے۔ ہم بہت دل برداشتہ ہوئے۔ اس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے اور صرف پاکستان ٹرانس جلاتے رہے۔“ فیض صاحب بقرائی Jargon

کو Demolish کرنے میں ہمیشہ سے استاد رہے ہیں چنانچہ ایک روز مرید ایک نقاد کا حوالہ دے کر پوچھتا ہے، ”شعر کیا ہوتا ہے اور اچھے شعر کی تعریف کیا ہو سکتی ہے؟“ کہنے لگے ”بھئی شعر ہوتا ہے اور شعر لکھنے کے عمل کو شاعری کہتے ہیں۔ شعر کے کہتے ہیں یہ یار لوگوں نے خواہ خواہ کا سوال کھڑا کر دیا ہے اگر قافی صاحب کا شعر کی تعریف سے مدعا بحر، وزن، ردیف، قافیہ اور تقطیع قسم کی کوئی چیز ہے، تو بھی مجھے خود تقطیع ٹھیک سے نہیں آتی اور جب ہم شعر کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں تقطیع وغیرہ کا ہرگز خیال نہیں ہوتا۔

فیض صاحب عربی کے ایم اے ہیں، جیل میں درس قرآن وحدیث بھی دے چکے ہیں اور صوفیائے کرام کی تصانیف پڑھا چکے ہیں اور ایک مرتبہ کسی عرس میں جا پہنچے جہاں آپ کی دستار بندی بھی کی گئی۔ موصوف دراصل صوفیائے کرام کو اصل کامریہ لوگ سمجھتے ہیں جنہوں نے ”بہید پا لیا تھا۔“

فیض صاحب نے ایک مرتبہ کالج کے مشاعرے میں اپنی نظم پڑھی۔ علامہ اقبال نے بلا کر بہت شاباشی دی۔ اس واقعے کے متعلق مرید نے پوچھا، آپ کے خیال میں علامہ اقبال کا شاعری میں کیا مرتبہ ہے؟ فرمایا، جہاں تک شاعری میں Sensibility، زبان پر عبور اور فنائیت کا تعلق ہے، ہم تو ان کے خاک پا بھی نہیں۔ علامہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ پھر کہنے لگے، اگر علامہ سوشلزم کے معاملے میں ذرا عجید ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ ہوتا۔

مرید نے پوچھا آپ نے غالب سے رنگ تغزل، اقبال سے فنائیت لی ہے اور دونوں میں اپنا سوشلزم کس کر دیا ہے۔ مسکرائے اور کہا، ”بھئی اس سے کسے انکار ہے۔“

فیض صاحب لندن میں تھے اور پاکستان میں جنرل ایوب خاں نے مارشل لا لگا دیا۔ آرام سے لندن میں رہ سکتے تھے۔ مارے حب الوطنی کے پاکستان پہنچے اور پھر پکڑے گئے۔ فرمایا ”بھئی اس مرتبہ جیل میں عجیب تجربہ ہوا۔ وہ شروع ہی سے اکٹھا ہٹ کا تھا۔ ہم تک آچکے تھے۔ اب دیکھو وہ بلاوجہ ملک میں کچھ ہو ہم جیل خانے میں۔ آخر یہ کیا ترکیب ہے۔ ہم کوئی چور ہیں، ڈاکو ہیں، کوئی قتل کیا، ملک کے خلاف کچھ کہا ہے۔۔۔؟“

پھر جنرل بچی خاں کے مارشل لا کا زمانہ آیا۔ مرید و مرشد دونوں پھر لندن میں موجود تھے۔ ”معلوم ہوا ہم لوگ پھر اندر ہونے والے ہیں۔ فہرست تیار ہو چکی ہے۔ ہم نے اپنے دل کو تسلی دی کہ چلیے لندن سے لاہور قلعے تک ہو آئیں۔“ فیض صاحب مسکرا رہے تھے کہ بھی کم از کم ہمارے معاملے میں بس کر دینی چاہیے۔ آزمائش ایک مرتبہ ہوتی ہے، دودھ بھی چلیے ٹھیک ہے، مگر یہاں جب بھی تخت الٹے ہیں ہماری آزمائش کی گھڑی خواہ خواہ آجاتی ہے۔ ہم نے کچھ کیا ہو، پھر بھی بات سمجھ میں آئے۔ بیٹھے بٹھائے دھر لیے جاتے ہیں۔ بھی ہم تو تخت نہیں گراتے، ہم تو تاج نہیں اچھالتے۔ ہم تو صرف کہتے ہیں کہ یوں ہو جائے یا ہم یوں کر دیں گے۔۔۔۔“

چنانچہ فیض صاحب لندن سے کراچی پہنچے اور پھر جیل میں:

وہی گوش قفس ہے وہی فصل گل کا ماتم

پھر مرید کہتا ہے کہ فیض صاحب کو عمر کے اس حصہ میں زیادہ دکھاؤ اور تعلق محض ای بات سے ہے کہ ”اب دیوانے غائب ہو چکے ہیں، غائب نہیں بلکہ ہوشیار ہو گئے ہیں۔ دارنگی جنوں میں مگر پھونک کر دشت نور دی کو اب دیوانے نہیں ٹھٹھتے۔ اب تو درد بام سجا کر ڈرائنگ روم میں حسن و سستی کی باتیں کرتے ہیں۔“

یہ بات کس قدر صحیح ہے!

ملفوظات حضرت فیض شاہ جہاں دوست پڑھتے ہوئے راقم المعروف کو وہ سب زمانے یاد آئے جب حضرت کی اچانک گرفتاری کی خبر سن کر ہم سب اداس ہو جاتے تھے اور بے حد تعجب ہوتا تھا۔ آخر فیض اس قدر مرعباں مرغ شریعے قسم کے انسان جو اونچی آواز میں بات تک نہیں کرتے، اتنے خطرناک انقلابی کس طرح ہیں کہ ان کو آئے دن پکڑ کر بند کر دیا جاتا ہے۔ ایک نو عمر بوجھ بھگدو کزن نے سر ہلا کر کہا، آبا اب سمجھ میں آیا۔ فیض صاحب جو ہیں یہ پولس والوں سے ملے ہوئے ہیں۔ ان سے کہہ رکھا ہے کہ مجھے وقتاً فوقتاً جیل بھیج دیا کرو تا کہ وہاں کی مصوئیں اٹھا کر بڑھیا شاعری کروں۔ آپ ہی سوچیے:

سرفروشی کے اہواز بدلے مجھے دعوتِ قتل پر متعل شہر میں  
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا لاڈ کر کوئی کاغذ سے پہ دار آگیا

جو چل سکو تو چلو کہ رنہ وفا بہت مختصر ہوئی ہے  
مقام ہے اب کوئی نہ منزل فراز دار و رن سے پہلے

جس دج سے کوئی متعل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے  
یہ جان تو آتی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

رفیق راہ بھی منزل ہر اک تلاش کے بعد  
چھٹا یہ ساتھ تو راہ کی تلاش بھی نہ رہی

ملول تھا دل آئینہ ہر خراش کے بعد  
جو پاش پاش ہوا اک خراش بھی نہ رہی  
جیسی خوبصورت شاعری فیض صاحب کے علاوہ اور کون کر سکتا تھا؟  
تو کیا ہر سہی کے لیے پورش تاتا ضروری ہے؟

فیض صاحب کا اثر ان کے متحد معاصر شعرا پر بہت گہرا اور واضح ہے۔ علاوہ انہوں  
میشوں کا سچا دور درکار شہنشاہ ہم تار یک راہوں میں مارے گئے، میرے ہوم مرے دوست، یہ داغ  
داغ اجالا، ٹار میں تری گلیوں پہ، سارے لوح و قلم، چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاردار چلے، بول کہ لب  
آزاد ہیں تیرے، موسم گل ہے تمہارے باہم پر آنے کا نام، خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو...  
درد پیچیں کے گیت گائیں گے، ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے، نہ گنواؤ ناؤک نیم  
کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا، جیسے دیرانے میں چپکے سے بہا آ جائے، چند روز اور مری جان فقط چند

ای روز... رگل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام... وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر تھا، دشت تہائی میں اسے جان لرزاں ہیں، درد آئے گا بے پاؤں لیے سرخ چراغ، پرورش لوح و قلم، مجھ سے پہلی سی محبت... آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ... آؤ کہ مرگ سوز محبت متائیں ہم... وغیرہ وغیرہ اب تک ادبی کلیجے بن چکے ہیں۔ خود میں نے سب سے پہلے یہ داغ داغ اجالا کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا۔ امروز میں چھپا پھر جب کبھی فیض صاحب لاہور سے تشریف لاتے ہیں کہتی، آپ نے اپنا ہوم ورک کیا؟ کوئی ایسا شعر کہا ہے جسے میں ناول کے عنوان بنالوں؟ پھر میں نے سفینہ غم دل اڑایا۔ چند سال بعد آخر شب کے ہم سفر! اپنی گھریلو میزک پارٹیوں میں داخل ہوئی رات بکھرنے لگا اندھیروں کا غبار کیدارا میں الاپ کر ہم محفل ختم کرتے۔ یہ باقاعدہ ایک Ritual تھا۔ اس پر یاد آیا کہ فیض صاحب اس لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت ہیں۔ ان کے کلام کو مردوں میں ڈھالنے کے لیے مہدی حسن، نور جہاں، فریدہ خانم، ملکہ بکھراج اور نیرہ نور جیسی آوازیں ملیں۔ فیض صاحب کے ہاں عشق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارہ شام، یہاں سے شہر کو دیکھو اور زرد پتوں کا بن جو میرا دلیس ہے۔ بزرہ بزرہ سوکھ رہی ہے پھکی زرد دھبہ کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی کئی نہیں:

راستے مجھ گئے رخصت ہوئے وہ گیر تمام  
اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر نام پہ چاند

---

زینہ زینہ اتر رہی ہے رات

---

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں  
جیسے پھڑے ہوئے کبے میں صنم آتے ہیں  
رقص سے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو!  
سوئے میکانہ سفیران حرم آتے ہیں

ایک ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن  
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

---

اب کوئی طبل بچے گا نہ کوئی شاہسوار  
صبح دم موت کی دادی کو روانہ ہوگا  
فیض صاحب زبان کے معاملے میں اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں۔ وہ اطمینان سے 'خوشبوئے  
خوش کناراں اور بادبان کشتی صہبا' کے ساتھ ساتھ 'پوسٹ مینوں کے نام' بھی لکھتے چلے جاتے ہیں  
اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔  
فیض صاحب نے ایک فلم 'جاگو ہوا سویرا' بھی بنائی تھی جس نے ایوارڈ حاصل کیے اور  
بکس آفس پر فیل ہوئی۔  
پاکستان کے مشہور صحافی ایوب احمد کرمانی کی ٹریجک موت پر فیض صاحب نے ایک  
انتہائی خوبصورت مرثیہ لکھا:

تجے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بھگے گئے ہیں  
سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سرشام بھگے گئے ہیں  
محض یہ ایک غزل فیض صاحب کے مسائل اور دشمن کی مکمل عکاسی کرتی ہے لیکن فیض کی  
شاعری کی مخصوص فضا اور ڈیکور کو انگریزی میں منتقل کرنا بہت مشکل ہے۔ وکٹر کیزن کلام فیض کا  
انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اس سے قبل راقم المعروف نے کیمرج کی ایک Poetry  
Reading کی محفل میں پڑھنے کے لیے دست مبارک کی متعدد نغموں کا ترجمہ کیا تھا جو افسوس کہ لندن  
واپس آتے ہوئے ٹرین میں مارا گیا لیکن میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اردو شاعری کا انگریزی میں  
کامیاب ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔

فیض صاحب آرام چیئر سوشلسٹ کبھی نہیں رہے۔ وہ اپنے بے حد متحول والد کی خریدی  
ہوئی زمینیں اپنے غریب رشتہ داروں کو بانٹ چکے ہیں اور سلسلہ ویش بنگلی انھوں نے جو کچھ جھیلا

ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ لیلائے وطن کی چاہت میں اب بھر دشت نوردی کر رہے ہیں:

فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے

اپنا کیا کتھاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

فیض صاحب آج بھی ایسی چیزیں لکھ رہے ہیں جیسے نئے بھائی کا مرثیہ:

خلا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے

یہی تو مسند بزمِ مغاں ہے

اور فلسطینی بچے کی لوری۔

مت روئے بچے

تیرے آگن میں

مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں

چندر مادقا کے گئے ہیں

فیض صاحب کی شاعری کبھی کہلا نہیں سکتی۔ یہ ایسی شاعری ہے جسے آج کے فلسطین اور

ایران و الجزائر کا شاعر پہچان سکتا ہے۔ میر، غالب اور اقبال بھی اس کو پسند کرتے اور پنجاب کے

پلیسے شاہ اور وارث شاہ اور بابا فرید بھی۔

(’فن اور شخصیت‘، فیض نمبر، 1981)

حواشی:

1. یہ ناول فیض صاحب کے اس مقولے کی تفسیر ہے کہ دیوانے ہو شیار ہو چکے ہیں۔
2. کرمانی مرحوم راقم الحروف کی بھابی بیگم مصطفیٰ حیدر صاحب کی لڑبچک موت پر فیض صاحب کے برادر معظم تھے۔





## چاند نگر کا جوگی

(ابن انشاء)

ابن انشاء جنھوں نے اپنے لیے ایک پراسرار فوس خیر شعری کائنات تخلیق کی تھی، سب سے پہلے میں نے ان کا ذکر اس طور پر سنا کہ یہ لو جو ان شاعر لاہور میں لکڑی کا لکڑاں مکان بنا کر اس میں رہتا ہے اور چینی نظمیں ترجمہ کرتا ہے۔ جب انشا کراچی آئے تو پتہ چلا کہ یہ ایک لاہالی، بے فوش برہمن نہیں بلکہ ایک نہایت معقول، سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ والے انسان ہیں۔ تو یہ چاند نگر (جو 1955ء میں شائع ہوئی) ان کی اندرونی چاندنی کی دنیا تھی۔ اور ہندوستانی کائنات ان کا داخلی لینڈ اسکیپ، میر، نظیر اور کبیر ان کے اصلی ساتھی۔

اسی زمانے میں ناصر کاظمی، مصطفیٰ زیدی، جمیل الدین عالی، ضیا جالندھری، عزیز حامد مدنی وغیرہ کی دھوم مچنا شروع ہوئی۔ ساتھ ہی رنگ میر کی ہماہمی۔ میر نیازی ذرا بعد میں ظاہر ہوئے۔ عالی اور انشا دونوں ہندی گیت لکھ رہے تھے۔ ساجن، گوری، پیت، جوگی، آشا، نراشا، آجیار، رُوپ، سنے وغیرہ کی تکرار سے یہ گیت کافی Banal ہو سکتے ہیں لیکن ان دونوں کے ہاں

اس قسم کی Banality ذرا کم ملے گی۔ اس قسم کے گیت 1920 عیسوی سے اردو میں لکھے جا رہے تھے۔ عالی اور انشا نے ان کو ایک نئی انفرادیت بخشی۔ انشا موجودہ عہد کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جن کے اشعار اور نظمیں لوگوں کو زبانی یاد ہو گئیں:

کل چوھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چہرہ ترا  
کچھ نے کہا یہ چاہے ہے، کچھ نے کہا چہرہ ترا  
ہم بھی وہیں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے  
ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردہ ترا

اس قسم کی ایک رواں دواں غزل ایک زمانے میں ہمارے ہاں گلی کوچوں میں گائی جاتی تھی:

اس نے کہا: تو کون ہے؟ میں نے کہا: شیدا ترا  
اس نے کہا: کرتا ہے کیا؟ میں نے کہا: سودا ترا  
یہ سیدھی دل میں اتر جانے والی شاعری تھی اور یہ روانی اور سادگی سب سے پہلے عالی نے شعارف کی تھی۔

1950 عیسوی میں انشا پہلے شاید مولوی عبدالحق کے ساتھ اردو کالج میں کام کرتے تھے۔ اس کے بعد سرکاری ملازم ہوئے۔ سونے شیشوں کی عینک لگاتے، دراز قد، نہایت بھلے اور نیک دل آدمی، بے حد سنس آف ہیوہر کے مالک اور انتہائی شائستہ، چاند نگر کے 'بنجارے' جوگی اور اصلی ابن انشا دو مختلف ہستیاں تھیں۔ انسان کی ظاہری شخصیت اور اس کے دنیاوی کاروبار اور اس کی ذاتی کائنات میں کتنا تضاد پایا جاتا ہے۔ اس شہریت کی ایک مثال ابن انشا تھے جن کا اصل نام شیر محمد خان تھا (جو بہت کم لوگوں کو معلوم تھا)۔

یہاں ایک نکتہ واضح کرنا ضروری ہے۔ ملک کے سماجی اور معاشی حالات اور عمرانیات کا اثر ادب اور ادیبوں پر کس طرح پڑتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد کافی ادیب اور شاعر آسودہ حال اور اچھی ملازمتوں پر فائز تھے۔ اردو قوی زبان تھی۔ اہل قلم کو ذاتی ترقی کے نئے مواقع میسر



بے حد تعجب ہوتا ہے جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ یہاں کے بہت سے ادیب اور شاعر پاکستانی رسالوں خصوصاً 'نقوش' میں اپنی تخلیقات چھپانا اپنی بلندی کا شواہد اور اپنا ادبی Status Symbol سمجھتے ہیں۔ کیا آزادی کے انیس سال بعد کے ہندوستانی اردو ادیب کا المیہ ہے۔

1950 عیسوی میں کافی اعلیٰ قلم کے لیے غم جاناں اور غم دوراں نظر پاتی تھی۔

ترقی پسندی اور اسلامی ادب اور داخلیت پرستی پر بڑے آرام و آسائش سے مناظرے ہوتے تھے۔ چڑی سازش کیس کے بعد سے فیض صاحب ایک لہجہ بننے جا رہے تھے اور ہم سب کے سر دھرندے تھے۔ اس ادبی دور کا باقائیداد تذکرہ میں نے 'کار جہاں دراز ہے' جلد دوم میں کیا ہے۔ اس وقت کراچی کے ایک سرکاری دفتر میں انشا اور انکم ٹیکس آفیسر کی میز پر بیٹھے عالی کاگوری اور پگھٹ اور جوگی اور من مندر کی ہندوستانی امیجری کے گیت اور دوہے لکھنا خالص شاعری تھی لیکن ان شاعروں نے تخلیقی تجربے کی ایک مخصوص زبان اور لہجہ کو دوبارہ دریافت کیا تھا۔ علامتوں کے ساتھ ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ بہت جلد پامال ہو جاتی ہیں اور یہ اس وقت ہمارے ادب میں برآمد ہو رہا ہے۔ لیکن انشا کا چاند نگر منفرد رہا۔

اردو میں ہندی کی گھلاوٹ اور انداز بیان کی ایک مخصوص کیفیت اس سے پہلے مجھے صرف آرزو لکھنوی میں نظر آتی ہے۔ 1950 عیسوی میں شدید کمزور پاکستانی نیشنلسٹ جمیل الدین عالی اور 'ہیومنس سوشلسٹ' ابن انشا کے ہاں ہندی امیجری کے استعمال میں ہندوستان کے لیے تو سلیجیا بھی مضر تھا۔ ابن انشا نے چینی نظمیں ترجمہ کی تھیں۔ وہ چینی اور جاپانی شاعری سے بھی متاثر تھے۔ چاند بھی کوئی انوکھا موضوع نہیں ہے۔ جبری مہد کے قاروں میں رہنے والے ہمارے اجداد پونم کے چاند کو دیکھ کر پتھر لڑھکاتے اور غموں غاں کرتے ہوں گے۔ جب سے لے کر آج تک شاعروں نے چاند کو چھٹی نہیں دی لیکن ایک چاند صرف ابن انشا کا تھا۔ کوئی دوسرا اسے اس طرح نہیں دیکھ سکا۔ اور ہر شعر میں چاند کی اتنی تکرار کے باوجود وہ بور نہیں کرتا۔

ابن انشا سے میری آخری ملاقات 1980 عیسوی میں ہوئی تھی۔ ان کا دفتر میرے دفتر سے زیادہ دور تھا اور ہم لوگ اکثر فون پر کہیں ٹھونکا کرتے تھے یا انشا دوسرے دوستوں کے ساتھ

ہمارے دفتر آ جاتے تھے۔ برسوں بعد 1957 عیسوی میں انشا کی بیٹی ہوئی 'اردو کی آخری کتاب' مجھے ملی تو معلوم ہوا کہ آپ اب نیشنل بک سینٹر کے ڈائریکٹر ہو چکے ہیں۔ ساری دنیا میں گھوما کرتے ہیں اور شاعر سے زیادہ مقبول طنز و مزاح نگار اور کالم نویس بن چکے ہیں۔ 'اردو کی آخری کتاب' میں ایک حد تک '1088 and all than' کے پائے کا طنز و مزاح تھا۔ یہ تصنیف اتنی پسند آئی کہ میں نے فوراً اس کے چند ابواب شخصیت درجہ کر کے لسٹریٹڈ ویلکی میں شائع کیے۔ چونکہ میں خط لکھنے کے معاملے میں بے حد کاٹل ہوں، پدماسید یو کو اس مضمون کے تراشے دیے کہ ابن انشا کو کراچی پوسٹ کر دیں۔ ان کا خط آیا:

کراچی

9 مئی 1975

یعنی بیگم! آداب۔ چند دن ہوئے پدماسید کا خط آیا جس میں آپ کے ترجمے کا تراشہ ملفوف تھا۔ پدماسید ہماری خط و کتابت ہے۔ مصدوم ہی خط و کتابت جیسی اڈر گر بجوٹ لڑکے لڑکیوں میں ہوتی ہے اور جیسی کہ ہماری عمر کا تقاضا ہے۔ ہوش کی منزل کو پہنچیں گے تو ان جھیلوں اور مومہ مایا سے گریز کریں گے۔ لو ایک قصہ سنو۔ پچھلے سینے ماری پور جانا ہوا۔ اپنے مہنی ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں ان کے مرشد رہتے ہیں۔ بابا ذہین شاہ تاجی، نقصوف اور قوالیوں کے مہر تاجید اکٹار کے شاگرد۔ میرا قلب ابھی جاری نہیں ہوا اس لیے جیسا گیا تھا ویسا لوٹ آیا۔ راستے سے گزرتے ہوئے، جس کی شکل اب بالکل بدل گئی ہے، پہلی بار آپ کے ہاں ماری پور جانا یاد آیا۔ 25 برس پہلے ایوب احمد کرمانی کے ساتھ۔ پھر ادھر جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ اب ہماری عمر میں 25 برس باقی نہیں ہیں کہ تیسری بار جائیں اور جائیں تو کیوں جائیں؟

آپ نے بڑا کرم کیا کہ میرا مضمون ترجمہ کیا اور زبور طبع سے آراستہ بھی کیا۔ زندہ ہاشمی بعض جگہ ہندوستان کے چند ناموں کا ذکر آیا تو آپ ڈگری ضرور مار گئی ہیں۔ سو یہ محبت کا اثر ہے۔ اب اس کتاب کو ہند پاکٹ بکس والے چھاپ رہے ہیں۔ اس کے جیکٹ کے لیے آپ کچھ لکھ دیں بشرطیکہ Undiluted تعریف میں ہو۔ تو آداب بجالاؤں۔ یہ جملہ شرطیں ناحق لکھ دیا۔ میں

جانتا ہوں جتنے فتاد صائب نظر رکھتے ہیں وہ میری تعریف پر مجبور ہیں۔ بعض کج فہم اور کج نظرایے بھی ہوتے ہیں جن کو میری تحریر میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

ایک پورا سیٹ اپنی کتابوں کا ایک بی بی کے ہاتھ آپ کے لیے بھیجا تھا کہ بریلی جا کر سپر ڈاک کر دیں۔ وہ بی بی وہاں جا کر صاحب فراش ہو گئیں۔ گھنٹے پر ضرب آئی۔ جانے کس کی آنکھیں پھوڑنے کو مارا ہوگا۔ اس کتاب کے علاوہ میرے سفر نامے ہیں: 'آوارہ گرد کی ڈائری'، 'دنیا گول ہے'، 'ابن بطوطہ کے تعاقب میں'، 'چلتے ہو تو چین کو چلیے'۔ اتنے سفر نامے ہو گئے ہیں کہ اب کہیں باہر جاتا ہوں تو Immigration والے حلف نامہ لیتے ہیں کہ آکر سفر نامہ نہیں لکھوں گا۔ سال گزشتہ تین بار جاپان گیا۔ ہر بار مسافر کے طور پر دئی کے ٹرانزٹ میں تھوڑی دیر کو اترتا ہوں اور حیرت و حسرت کا مارا پھر جہاز میں آ جاتا ہوں۔ دیکھیے کب راستے کھلتے ہیں، کب سبیل بنتی ہے۔

'کیا تھارے پر وہ خن کا، وہی ٹھہرا ہے اب فن ہمارا۔ سنڈے کے سنڈے ایک کالم جنگ اخبار میں لکھتا ہوں۔ اتنا اچھا ہوتا ہے اپنے ہاتھ جو م لینے کو جی چاہتا ہے۔ بار بار پڑھتا ہوں لیکن طبیعت میر نہیں ہوتی۔ ساتھ کے کالم میں مرزا جمیل الدین عالی کا عالم اند اور فاضلانہ کالم ہوتا ہے۔ سنجیدہ اور منقطع لوگ ان کا کالم پڑھتے ہیں۔ قوم کے درد میں ڈوبا ہوا اور اسلام کے نشے میں مرشار ہوتا ہے۔ ویسے یہ ہمارے یاد عزیز آج کل جنرل بیگم آف پاکستان کے انگریز بیکہو داس پرینٹس ہیں۔ بڑے صالح سوچنے والے جاتے ہیں۔

کیا اردو کیا آخری کتاب میں سے ایک آدھ قسط دیکھی میں اور ہو سکتی ہے؟ آپ جانتی ہیں مجھے شہرت کی تمنا نہیں۔ لیکن کارکن کے پرزور اصرار کا کیا کیا جائے۔ ان چند برسوں میں بہت کچھ ادب عالیہ اس فقیر کے قلم سے سرزد ہوا۔ وہ بڑا بان انگریزی آپ کے پرچے کی شوبھا بڑھانے اور سرکولیشن گھٹانے کے لیے دفا فوفا بھیجا جاسکتا ہے۔ جی کڑا کر کے جواب دیجیے۔ یوں تو سفر ناموں میں بھی آپ کو بہت سے لولوئے لالہ ملیں گے۔ وہ نظم آپ کو ملی؟ یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟ میں چاہتا ہوں آپ اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کریں اور بھی بہت کلام بلاغت

نظام ہے۔ سننے والے میں تحمل کا مادہ ہو۔ کارلائقہ و نالائقہ سے یاد کیجیے۔

نیاز کیش: امین انشاء

کراچی

11 جون 1975

’اردو کی آخری کتاب‘ کے لیے طویل یا مختصر، یا طویل مختصر یا مختصر طویل تعارف، پیش لفظ، مقدمہ، بھومی کا، پرچے، نو را، ترنت لکھ بھیجیں۔ میرے خط پر کا جواب بھی ضرور دیں۔

تخلص

امین انشاء

میں نے مصروفیت اور کاٹلی کی وجہ سے انشائی کے نہ کسی خط کا جواب دیا نہ کتاب کا پیش لفظ لکھا اور سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟ جس کے بارے میں انھوں نے مجھے بار بار لکھا، میں اس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا بھی نالقی رہی۔ خیال یہ تھا کہ امین انشاء کہیں بھاگے تو وڑا ہی جا رہے ہیں۔ کبھی ان کو خط بھی لکھ دیں گے اور ترجمہ بھی۔ ان کی کتاب کے متعلق بھی کچھ لکھ دیں گے۔

پچھلے سال لندن سے ایک صاحب امین انشاء کی تازہ کتاب اور خط لے کر آئے۔

لندن

31 مارچ 1977

یعنی بیگم، تازہ خبر یہ ہے کہ ہم بھی یہاں آ گئے ہیں۔ مکان ابھی نہیں ملا ہے۔ آئے تو ہیں تین سال کے لیے لیکن اتنی استقامت ہم میں نہیں ہے۔ دیکھیے کب بھاگتے ہیں۔ کام ہمارا اڑایا آفس لائبریری سے متعلق ہے۔ کسی دفتر دفتر کی پابندی نہیں ہے۔ آپ سے ملاقات کے امکان ذرا روشن کیجیے۔

باقی انقلابات زمانہ کا کیا کیجیے۔ ’عسکری‘ کا معلوم ہو گیا ہوگا۔ بئرس میں پریس کونسلر

ہیں۔ عالی اسمبلی کے لیے بھنوکے کلکٹ پر کھڑے ہوئے تھے، جماعت اسلامی اور متحدہ محاذ نے ہرا دیا۔ شہاب صاحب اسلام آباد میں ہیں۔ اب آپ چنڈو خانے کی سناپیے۔ صاحب قزلباش روز ملتی ہیں۔ اچھا اب ہمارا مجموعہ اس ہستی کے اک کوپے میں قبول کرو اور اسے پسند کرو۔

ابن انشاء

میں نے سوچا انشا اپنے مکان کا چہرہ بھیجیں تو ان کو خط لکھوں۔ سنا تھا سفارتخانے میں گئے ہیں۔ لیکن پاکستانی ایجنسی بھی شاید لندن میں کسی اور جگہ منتقل ہو چکی ہے اور مجھے اس کا پتہ نہ معلوم تھا۔ پھر سنا ابن انشاء اصل طیل ہیں اور حکومت پاکستان نے ان کو اس لیے لندن ٹرانسفر کر دیا ہے کہ وہاں ان کا علاج بھی ہوتا رہے۔ علالت کی نوعیت کا مجھے علم نہ تھا۔ نومبر یا دسمبر 1977 عیسوی میں معلوم ہوا کہ ابن انشاء Terminal مرض میں مبتلا ہیں۔ میں نے صاحب قزلباش کو خط لکھا۔ اطلاع ملی کہ صاحب لندن سے کراچی واپس جا چکی ہیں۔

11 جنوری 1978 عیسوی کلنڈن کے ایک اسپتال میں کئی دن بے ہوش رہنے کے بعد یہ نیک اور بہت ہی بھلا انسان اس دنیا سے رخصت ہو گیا جس کے لیے وہ بہت کڑھتا رہا تھا:

بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں، پیاریں پاؤں  
نیند سی نیند؟ ہمیں اب نہ اٹھانا لوگو  
اب کوئی آئے تو کہنا کہ مسافر تو گیا  
یہ بھی کہنا کہ بھلا اب بھی نہ جانا لوگو!

ابن انشاء

ابن انشاء نے جہانگیر روڈ کراچی کے ایک سرکاری کوارٹر سے بتدریج اوکسفرڈ اسٹریٹ لندن کے ایک گلڈری فلیٹ تک کا سفر کیا۔ بحیثیت شاعر اور طنز نگار اپنے ملک میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی لیکن وہ کبھی یہ خود غلط فہمیں ہوئے۔ نہ کامیابی اور شہرت نے ان کا دماغ خراب کیا۔ (دونوں ملکوں میں مذاک کی وجہ سے یہاں کا اردو وال طبقہ ابن انشاء سے زیادہ واقف نہیں)۔



انشا کا مزاج لطیف اور مہذب تھا۔ اردو زبان کی ہمہ گیری کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ طرز و مزاج بڑی آسانی سے ابتذال، بیہودگی اور بدچیزوں میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ شائستہ طرز اور پختہ پن میں بال برابر کا فرق ہے جس کو متدین لوگ پہچانتے ہیں۔ مگر ہمارے بعض مزاجیہ شاعروں اور نثر کے طرز نگاروں کے ہاں یہ سوتیانہ پن آ ہی جاتا ہے۔ واقعات، مسائل اور شخصیات پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے قلم کو سنبھالے رکھنا تہذیب کی پہچان ہے۔ انشا اس معیار پر پورے اترتے تھے۔

1989 عیسوی میں کراچی کی ایک خاتون صحافی نے ان سے وہی چٹا ہوا سوال کیا: آپ ادب کیوں تخلیق کرتے ہیں...؟ کسی ادیب سے یہ سوال کیوں کیا جاتا ہے، یہ میری سمجھ میں آج تک نہ آیا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی مفتی سے پوچھیے آپ کیوں گاتے ہیں یا پھر یہ کہ آپ کھانا کیوں کھاتے ہیں، پانی کیوں پیتے ہیں۔ بہر حال، تو اس کا جواب انشا نے یوں دیا: ”آپ کی طرح ادب کی اور بھی خواہوں نے ہم پر یہ اعتراض کیا ہے۔ بھئی کیا کریں۔ عادت سے مجبور ہیں۔ پھر صحبت اچھی نہیں ملی۔ ہوش کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ادیبوں اور شاعروں میں گھر پایا۔ اس سے بہتر اور کوئی کام ہمیں آتا بھی تو نہیں۔“

”آپ کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں کہ ہمارا معاشرہ ادیبوں کے بارے میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ اہل خرد کی رائے ہے ادیب اچھا ادب بدحالی کے ماحول ہی میں پیدا کر سکتا ہے۔ فراغت کے عالم میں نہیں۔ لہذا معاشرہ ادیب کے لیے ایسے ماحول کا احترام کرتا رہتا ہے کہ وہ بیشا کر محتاط رہے اور اپنے دل کو گداز کرتا رہتا کہ راقی دنیا تک ذمہ نہ سنبھالا ادیب پیدا کرتا رہے۔“

اسی موضوع پر زیادہ سنجیدگی سے ابن انشا نے 1954 عیسوی میں ’سوریا‘ (لاہور) کے ایک شمارے میں ’میں کیوں لکھتا ہوں؟‘ کے جواب میں کہا تھا... عسکری نے اپنے کسی مضمون میں مشورہ دیا تھا کہ ادیب کو جو کچھ لکھتا ہے اپنے اعصابی نظام سے پوچھ کر لکھنا چاہیے۔ میں بھی کرتا ہوں۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ میرا عسکری صاحب کا اعصابی نظام میر، فیض، بودلیئر یا ملار سے متاثر تو نہیں۔ اور آیا دل اور دماغ کا شمار اعصاب میں ہے یا نہیں۔ بہر حال ظاہری حقیقت

بھی ہے کہ میں اپنے اندرونی جذبے سے متاثر ہو کر لکھتا ہوں۔ شعوری طور پر نہ کسی نقاد کے لیے لکھتا ہوں نہ عوام کے لیے۔ میری وہ نظمیں، جن میں صحت مند سماجی شعور ملتا ہے، شعوری طور پر مقصدی نہیں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان میں جیلی کزوریاں اور فرار جگہ پا جاتی ہیں۔ میرے نزدیک دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ انھیں اسی طرح دیا جائے۔

”میں طبعاً رومانی بلکہ الف لیلوی ہوں۔ لکھنے میں اس رجحان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ لیکن میں ایک ایسی سوسائٹی میں رہتا ہوں اور اس کے دکھوں اور سکھوں سے بہرہ مند ہوتا ہوں جو الف لیلوی نہیں ہے۔ میں نے کسی سماجی سائنس کا (مارکسزم کا بھی ڈھنگ سے مطالعہ نہیں کیا) لیکن انسان کو انفرادی اور اجتماعی، مادی اور روحانی طور پر خوش باش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اصطلاح پر اصرار ہو تو پرانی طرز کا ہیومنسٹ موٹو سمجھ لیجیے۔ میرے نزدیک یہ معلوم کرنے کے لیے کسی حکیم کے پاس جانے کی ضرورت نہیں کہ جنگ اچھی چیز ہے یا امن، غریبی یا خوش باشی، قید یا آزادی، مساوات یا انقلاب۔

”ان معاملوں میں تنگ، بے اعتنائی اور غیر جانبداری میرے نزدیک بددیانتی ہے یا کم از کم جہنی جہود۔ مجھے مطالعوں سے نفرت ہے اور بے حسوں سے بھی۔ میں نے آڈن اور اس کے ہم عصروں کا عروج و زوال دیکھا ہے اور اس سے خاصی عبرت حاصل کی ہے۔ میرے نزدیک کسی کے خداوند کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے کا معیار یہ نہیں کہ اس سے کسی ذحل مل یقین اور جذباتی اعلیٰ کی جہنی تشکیل ہو۔ یہ دیکھتا ہوں کہ اس کی بدولت پچاس کروڑ سادہ اور غیر اعلیٰ کی انسانوں کی زندگی میں روشنی اور شادابی کا گزر ہوا ہے یا نہیں۔

”بھی جذبے ہیں جو قدرتی طور پر میرے اعصابی نظام میں سے ہوتے ہوئے میری نغموں میں بھی غیر شعوری طور پر آ جاتے ہیں۔

”مشقیہ نغموں میں جذبے کی سچائی میرا اصول ہے اور ان معاملوں میں میرا جذبہ ہمیشہ شدید ہوتا ہے۔ چونکہ میں اسے Philosophise نہیں کر سکتا۔ یہ جنون کا روپ دھار لیتا ہے۔ ایسی نظموں کے ڈکشن اور لفظیات میں بھی آپ کو ایک وارنٹی ملے گی۔

بقول خود انشا کے 'قلب' جاری نہیں ہوا تھا لیکن انھوں نے نظیر کے قلندروں اور وارث شاہ کے  
کن پھٹے جو میوں کی دنیا بسائی تھی جو دراصل انسان دوستوں اور جہان دوستوں کی دنیا تھی۔ یہ جوگی اور  
بخارے کا ایک فاسق، استحصالی، زور پرست معاشرے سے آؤٹ آؤٹ کرنے والوں کے سہل تھے۔

سیدھے سن کو آدبوچیں: میٹھی باتیں، سندربول

میر، نظیر، کبیر اور انشاء سارا ایک گھرانہ ہو

مترنم جھرنوں کی روانی کے ساتھ انشا کیا کہتے تھے؟ خالص، اداس رومان۔ آئیڈلزم،

امن پرستی، انسان دوستی۔

سکھیاں نہ سادوں بھادوں نہ برکھا

بگیا نہ بگیا میں پھولوں کے تھالے

تو جو نہیں ہے تو ہم بھی کہاں ہیں

آتا ہے کیوں یاد، یاد آنے والے

انشاء میں چلو خسرو کے پیچھے

سانجھ بھٹی مری جاں، میرے لالے

لالے پنجابی ترکیب ہے مگر خوبصورتی سے اس روانی میں شامل ہوگئی ہے۔

وہ ایک کلی چنبیلی کی

جو تم نے کہا تھا بھیجی

اے کاش تم آ کر دیکھ سکو

وہ ہم کو کتنی پیاری ہے

اس نظم کو پڑھ کر بن جانسن کی نظم Celia کا یہ مصرع یاد آتا ہے:

I sent thee late a rosy wreath

ابن انشا بھی مزاجاً ایک ایلیزیمس Phoney شاعر تھے۔ اس سے اگلی صدی کے جیٹا

فریڈل شاعر نہیں۔ گویا اٹھارویں صدی پنجاب کے صوفی تھے یا برج کے ایک کوئی اور اس کے

ساتھ ہی عصر حاضر کے ایک انتہائی باشعور انسان۔

’عصری حیات‘ اور ’عصری آگہی‘ کا ان دنوں ہماری بقرائی تنقید میں بہت چرچا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ان دنوں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں عصری آگہی اور عصری حیات موجود ہے۔ گویا اس سے پہلے، اب تک لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا وہ اس ’آگہی‘ اور ’حیات‘ سے عاری تھے۔ (اس قسم کی Phoney اور معطلہ خیز باتیں ہمارے ہاں ہی ممکن ہیں)۔

ابن انشا کی طویل سیاسی تلمیں (ان کو سیاسی کہنا مناسب نہیں، یہ تاریخ کی دستاویزی ہیں)، دیوار گریہ (عرب اسرائیل جنگ جون 1967ء)، دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے اور یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟ اردو کی اچھی نغموں میں شمار کی جائیں گی اور بغداد کی ایک رات۔ اب انشائی کے کچھ اور اشعار سنئے چلیے:

دل درد کی شدت سے خوں گشتہ دی پارہ  
اس شہر میں پھرتا ہے اک وحشی د آوارہ  
شاعر ہے کہ عاشق ہے، جوگی ہے کہ بنجارہ

دروازہ کھلا رکھنا

فلکوں کو اٹھا رکھنا، آنکھوں کو بچھا رکھنا  
اک شمع درجے کی چوکت پہ جلا رکھنا  
مابیس نہ پھر جائے، ہاں پاپ دقا رکھنا

دروازہ کھلا رکھنا

دروازہ کھلا رکھنا

انشاء کہو مزاج مبارک کو ان دنوں  
دنیا خوش آ رہی ہے کہ جانی اداس ہو  
کل بزم دوستاں میں تمہارا ہی ذکر تھا  
ہم نے سنی تمہاری کہانی، اداس ہو

اے قیس جنوں پیش، انشاء کو کبھی دیکھا؟  
 وحشی ہو تو ایسا ہو، زسوا ہو تو ایسا ہو  
 دریا بہ حباب اندر، طوقاں بہ حباب اندر  
 محشر بہ حجاب اندر ہوتا ہو تو ایسا ہو

ابھی کل ہی کی بات ہے جان جہاں، یہاں خیل کے خیل تھے شور کناں  
 ان نعرۂ عشق نہ ضربِ نفاں، گئے کون مگر وہ وفا کے دھنی  
 تم سختی راہ کا غم نہ کرو، ہر دور کی راہ میں ہم سفر  
 جہاں دشت خزاں وہیں دادی گل، جہاں دھوپ کڑی وہاں چھاؤں گھنی

اس عشق کے درد کی کون دوا، مگر ایک دلیفہ ہے ایک دعا  
 پڑھو تیرے کبیر کے بیتِ بکت، سنو شعرِ فقیر فقیر و غنی

چاند کب سے ہے سر شاخِ صنوبر اٹکا  
 گھاسِ شبنم میں شرابور ہے آدمی شب سے  
 دوستو، جی کا عجب حال ہے۔ لیما، بڑھتا  
 چاندنی رات ہے، کاتک کا سینا ہوگا  
 دھند اڑنے لگی، بننے لگی کیا کیا چہرے  
 اچھی لگتی ہیں دوانوں کی سی باتیں لوگو  
 بھینکتی رات میں دہکا ہوا جھینگڑ بولا  
 کس ساقی کسی جھاڑی میں سے خوشبو لپی  
 کوئی کاکل، کوئی دامن، کوئی آٹھل ہوگا  
 ایک دنیا تھی مگر ہم سے سینی نہ گئی  
 اس لہم میں آپ کو کیا ایک چینی یا جاپانی دائرہ کی کیفیت نظر نہیں آتی؟

انشا کو معلوم تھا کہ وہ عنقریب جانے والے ہیں۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن ان کی ہمت اور کٹنگلی برقرار تھی۔ انتقال سے کچھ روز قبل سنا ہے پاکستان ٹی وی والے ان کا انٹرویو لینے لندن گئے۔ انشانے کہا: ”یہ سمجھتے ہیں ہم مرنے والے ہیں لیکن ہم نہیں مریں گے۔“ پدماسجدیو ان کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل لندن میں ان سے ملی تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے کاغذات اور مسودے سینے اور ان کو ترتیب سے رکھنے میں اور زندگی کی باقی گھڑیاں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارنے میں مصروف تھے۔ انشا بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھی تھیں، اور ان کے اپنے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے تھے۔

قزاق اجل کا لوٹے بدن رات بجا کر نثارہ۔ لیکن اس نثارے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ نظیر کے اس قلندر کو اس نثارے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ نظیر کے اس قلندر کو اس نثارے کی آواز صاف صاف سنائی دے رہی تھی اور لکھنؤ لکھنؤ قزاق اپنا بھالا دبے پاؤں لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس وقت انشا کے جی پر کیا گزرتی ہوگی۔ کون جانے اور قزاق بھالا مار کر واپس چلا گیا۔ اور پونم کا چاند ابن انشا کے مزار پر بھی طلوع ہوتا ہوگا۔

(گنگو، ممبئی، ستمبر 1978)

حواشی:

1. پروفیسر مرزا محمد سعید مرحوم کے صاحبزادے کماٹر حسن عسکری جو ابن سعید کے نام سے افسانے لکھتے رہے ہیں اور ہمارے ’چنڈو خانے‘ کے ایک رکن تھے۔ مزید تذکرہ ’کار جہاں دراز ہے‘ (جلد دوم) میں ملاحظہ کیجیے۔
2. The God that failed کی طرف اشارہ ہے۔ اس کتاب میں آرتھم کوٹے کر اور مغرب کے دوسرے سابق کیونسٹوں کے مضامین شامل تھے۔ قدرت اللہ شہاب نے اسے سب سے پہلے پڑھا اور اتفاق سے ہم سب نے۔ ق.ج.
3. انشا ہندوستان، پاکستان کے عوام اور ان کے مسائل کو ایک سمجھتے تھے۔

## آندھی میں چراغ

(شانستہ اکرام اللہ)

ڈاکٹر شانستہ سہروردی اکرام اللہ کی ایک نواسی عہد اللہ گزرا کالج میں زیر تعلیم ہے۔ دو سال ہوئے شانستہ آپاس بچی سے ملنے علی گڑھ تشریف لائیں جس میں ان دنوں وہیں تھی۔ ان کا فون آیا۔ وہ گزرا کالج کی سابق پرنسپل رضیہ اکبر خاں کے ہاں مقیم تھیں۔ شعبہ اردو نے انہیں تقریر کے لیے مدعو کیا۔ دعوت نامہ لے کر شعبہ کی چند طالبات میرے پاس بھی آئیں۔

میں نے پوچھا آپ لوگ جانتی ہیں یہ کون قانون ہیں؟

”پاکستانی وی آئی پی۔“

”مگر بے حد سیدھی سادی اور سوئٹ۔ اکثر وی آئی پی لوگ تو بڑی اکثر فوں دکھلاتے

ہیں۔“ دوسری نے کہا:

”او...ج“

”ہمارے نائب صدر جمہوریہ جسٹس ہدایت اللہ ان کے دیویر ہیں۔“

”او...؟“

”ان کی ساجزادی کی شادی جب کراؤن پرنس آف جورڈن سے ہوئی تھی تو کراچی کے عوام نے چراغاں کیا تھا۔ ہماری خالہ نے امی کو خط میں لکھا تھا۔“  
 ”خود ڈاکٹر بیگم کرام اللہ کے بارے میں تو کچھ بتائیے۔“  
 ”بہت قائل ہیں، لندن سے پی ایچ ڈی۔“  
 ”یہ کوئی منفرد کارنامہ نہیں رہا۔“ میں نے جرح کی۔  
 اب ایک لڑکی نے جو بہار سے آئی تھی جواب دیا:

”جی ہاں انھوں نے بہت پہلے کیا تھا پی ایچ ڈی لندن سے، ہماری دادی بتلاتی ہیں۔  
 ہمارے ہاں ’مصمت‘ آتا تھا۔ جب وہ دہلی سے لکھا تھا اور اس میں لکھنے والیوں کا دادی اس اپنائیت اور محبت سے تذکرہ کرتی تھیں جیسے وہ سب ان کی رشتے دار یا سہیلیاں ہوں میرا مطلب ہے۔ ‘مصمت‘ اور ’تہذیب‘ سے دادی اماں کا بڑا جذباتی سالگاؤ تھا۔ ہم لوگ تو کسی رسالے کو اس طرح چاہتے۔“

”پہلے بیویوں کے پاس فرصت بھی تو بہت تھی۔ دس دس نوکر لگے ہوئے ہیں، وہ آرام سے بیٹھی مصمت میں چھپنے کے لیے کھانوں کی ترکیبیں لکھ رہی ہیں۔“ تیسری لڑکی نے کہا:

”اب آپ کے پاس کوئی زمانہ سال آتا ہے؟“

میں نے ’مصمت‘ کی خریدار دادی کی ہوتی سے دریافت کیا۔

”جی ہاں، انگریزی کے ٹیمنا اور ’ایوز‘ دیکھی اور ایک وینزلب کا رسالہ۔ شبانہ اعظمی اس کے ایڈیٹر ہیں اور دہلی سے ہانو۔“

”ڈاکٹر بیگم کرام اللہ نے کس مضمون میں پی ایچ ڈی کیا تھا؟“

”معلوم نہیں لیکن دادی اماں کہتی تھیں کہ جب یہ خبر ’مصمت‘ میں چھپی تو انھوں نے دو رکعت شکرانے کی ادا کی کہ ایک مسلمان لڑکی نے ایسی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ بھی ولایت میں۔“  
 ”اچھا کسی اور خاتون کا نام بتائیے۔“



”اعلیٰ بی۔“

”وہ تو بہت پہلے تھیں۔“

”سلطان جہاں بیگم اے ایم یو کی پہلی چانسلر۔“

”ان کے بعد کی نسل میں؟“

”دراصل ہمیں یہ سب جاننے کا وقت کہاں ملتا ہے؟“

”اچھا ڈاکٹر بیگم اکرام اللہ کے لیکچر سے قتل جو کچھ لائبریری میں مل سکے ان کے متعلق وہ

پڑھ ڈالے۔“ میں نے کہا۔

دوسرے روز وہ طالبات مجھے عظیم الشان مولانا آزاد لائبریری کے وسیع و عریض اردو

سیکشن میں سرگرداں نظر آئیں۔

”کیا پروہم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پاکستان سے اب کوئی رسالے نہیں آتے۔ سوائے دو شیزہ ڈائجسٹ کے۔ اس میں

ڈاکٹر بیگم اکرام اللہ کا کوئی مضمون نہیں ملا۔“

اردو کی ایک ریسرچ اسکالرنے جواب دیا۔

”ڈاکٹر شائستہ سہروردی کی جو کتاب اردو ناول پر لندن سے چھپی تھی میں نے اپنی خالہ کو

کراچی دکھاتا تھا کہ بھجوادیں۔ ان کا خط آیا کہ وہ کتاب پاکستان میں بھی آؤٹ آف پرنٹ ہے۔

فیکلٹی آف آرٹ کے راستے میں میں نے شائستہ آپا سے پوچھا کس موضوع پر بولیں

”جی۔“

”ڈاکٹر نذیر احمد کے نسوانی کردار۔“

”یہ تو خاصا بوریت کا مضمون ہے۔“

”تم دیکھنا میں اسے دلچسپ انداز میں اور نئے زاویے سے پیش کروں گی۔“

تھائی لینڈ سے آئی ہوئی شرعی پوشاک میں ملبوس چند اسلامی بنیاد پرست طالبات پاس

سے گزریں۔ فیکلٹی کا ہال کچھ بھر چکا تھا۔

شائستہ آپا نے واقعی بہ حد کثرت اور خیال انگیز تقریر کی۔ سامعین ہر تن گوش تھے۔ لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ حاضرین جلسہ کے کافی بڑی تعداد کے لیے معزز مہمان اجنبی تھیں۔ اسی طرح جیسے کسی پاکستانی یونیورسٹی کے طلباء کے لیے کوئی نامور ہندوستانی شخصیت اجنبی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر جب صادقین ملی گڑھ تشریف لائے تو ان کے ہمراہ آنے والے ان کے ایک دوست نے ہندوستان کے سب سے بڑے مصور محبوب نند حسین کا نام نہیں سنا تھا۔ یہ ہمارے دور کا المیہ ہے۔

شعبہ اردو کی صدر پروفیسر ثریا حسین نے معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا۔ اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ اسی ملی گڑھ میں آج سے ساٹھ سال قبل خواتین کو اسٹریپٹی ہال کی شیفٹینوں میں پس پردہ بیٹھ کر بھی کانویشن کی تقریب کا نظارہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور میری والدہ نے اس پابندی کے خلاف احتجاجی مضامین لکھے تھے۔

آج اسی مسلم یونیورسٹی کے ساتھ اہم شعبوں کی صدر یعنی پروفیسر بیڑ، مسلم خواتین تھیں (ان شعبہ جات میں دو ڈپارٹمنٹ میڈیکل کالج کے شامل تھے۔ ڈین آف فیکلٹی آف آرٹ بھی ایک مسلمان خاتون تھیں اور تاریخی انڈینک کلب کی کپتان بھی ایک فرنگی بھلی لڑکی تھی) (یہ دوسری بات ہے کہ کمپس کے قدامت پرست عناصر کے اعتراض پر اس عہدے سے دستبردار ہونا پڑا۔) اور مسلم سماج کا یہی مسئلہ آج تک چلا آ رہا ہے کہ ترقی اور حریت نسواں کس حد تک؟ یہ حدود کون مقرر کرے؟ اسلام، یا مغرب؟ اور اسلام کون سا۔ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن والا اسلام یا کٹھ ملا کا اسلام۔

اساتذہ اور طلباء کے اس مجمع کو جو خاتون مخاطب کر رہی تھیں وہ خود اقوام متحدہ میں اپنے ملک کی نمائندگی کر چکی تھیں اور عہدہ سفارت پر بھی فائز رہی تھیں۔

شائستہ آپا کی کتاب Form Purdah to Parliament میں نے نہیں پڑھی۔ دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں پر ہی پابندی عائد ہے۔ لیکن بیگم اکرام اللہ کی اس تصنیف کی کہانی بھی وہی رہی ہوگی جو شرق وسط کے ملکوں کی عورتوں کی بھی تھی۔ یعنی انیسویں صدی کی آخری دو

دہائیوں میں کولونیل تسلط کے خلاف جدوجہد۔ تعلیم نسواں کی تحریک کا آغاز انگلستان کے Suffragette Movement نے ہماری ان پیش رو بیبیوں کو متاثر کیا اور وہ عموماً ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں جن کے مرد خود مصلحین یا سیاسی لیڈر تھے۔ برٹش انڈیا کے ترقی یافتہ پریزیڈنسی ٹاؤن بمبئی، کلکتہ کے طیب جی، فیضی، سروردی وغیرہ خاندانوں کی بیبیاں اسی نئی جاگرتی کی نمائندہ تھیں۔ یہ خواتین مصر کی ہدئی شعراوی، حمیدہ السعدی اور ڈوریا شینٹی اور ترکی کی خالیدہ ادیب خانم کی ہم عصر تھیں۔ ایران کی ڈاکٹر فاطمہ سیاح، محسن الملوک جواہر کلام، صدیقہ دولت آبادی وغیرہ وغیرہ کی جدوجہد بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ ہندوستان میں اس نسل کی باقیات الصالحات میں سے بیگم کلثوم سیانی، فاطمہ اسماعیل، زرینہ کریم بھائی وغیرہ باوجود کہن سالی اب تک بمبئی کی سماجی و تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رہیں۔ فاطمہ اسماعیل جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بمبئی کے اس نامور Cotton King عمر سیانی کی بیٹی ہیں۔ جنہوں نے قومی تحریک میں لاکھوں روپیہ چھوڑ دیا تھا بطور سزا برطانوی حکومت نے راتوں رات کاشن کی بجائے کابھادگر اکرم سیانی کا کوڑا لگا کر دیا۔

1928 عیسوی میں عمر سیانی کی وفات پر سروجنی ٹائیڈو نے ایک دلدادہ نظم لکھی تھی۔

”تم نہ میرے رشتے دار تھے نہ ہم مذہب، لیکن اے بادشاہوں جیسا دل رکھنے والے تم مجھے اپنے گئے بھائیوں سے زیادہ عزیز تھے۔ افسوس کہ میں جس نے ہمیشہ تمہاری خوددار ٹھگنیں تمہاری کا مذاق اڑانے والے خونخوار کرب کو کم کرنے کی کوشش کی۔ میں ہی تمہاری آخری مصیبت کے وقت تم سے دور تھی۔ میں تمہارے حرار کے پاس کھڑی تھیں پکارتی ہوں اور تم جواب نہیں دیتے۔“

اسی طرح بیگم انیس قدوائی (صحت کی پرانی مضمون نگار انیس فاطمہ بنت بیوق) ممبر پارلیمنٹ جن کا چند سال قبل دہلی میں انتقال ہوا۔ بیگم محسنہ قدوائی (موجودہ مرکزی وزیر صحت) لکھنؤ کے قدوائی اور حبیب اللہ خاندانوں کی بیبیاں ایسے گھرانوں میں پیدا ہوئیں جہاں کسی نہ کسی آدرش کا بول بالا تھا اور خود ان کی تربیت اس قسم کی نیک بیبیوں نے کی تھی جن کی ایک جھلک شائستہ اکرام اللہ نے اپنی اسی عنوان کی ایک مختصر تصنیف میں دکھائی ہے۔

اپنے تمام اختلافات کے باوجود ہندوستان اور پاکستان میں ایک خصوصیت البتہ مشترک ہے۔ حصول زر کی خواہش اور ایک Consumer Society کا ارتقا۔ ہندوستان کے پچھلے متوسط طبقے میں جھیز کا مزید مطالبہ پورا نہ کر سکے کے 'جرم' میں 'عروس سوزی' کی وارداتیں آئے دن اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ اس قسم کے بھیانک جرائم کی اکا دکا خبریں مسلمانوں کے ہاں سے بھی ملنے لگی ہیں۔ صوبہ بہار اور آندھرا پردیش و سابق ریاست حیدر آباد کن کے مسلمانوں کے ہاں لڑکے والوں کی طرف سے جھیز اور جوڑے گھوڑے کے مطالبات میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

عورتوں کی فعال تنظیمیں عروس سوزی کی لعنت کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں۔ اسٹریٹ جھیز کے ذریعے پبلک کو متاثر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن زر پرستی ایک مہلک وبا ہے۔ آسانی سے قابو میں آنے والی نہیں۔

سلم پرسنل لاک آؤ میں مسلمان عورتوں کی حق تلفی بھی شدت پکڑ چکی ہے۔ ان دنوں مدھیہ پردیش کی شاہ بانو بیگم کے کیس نے انگلش اور اردو پردیس میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اس کے متعلق 28 مئی 1985 عیسوی کے روزنامہ قوی آواز دہلی میں بیگم صالحہ عابد حسین کے ایک مضمون کے چند اقتباسات پیش کرنے سے قبل یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ علامہ راشد الغزیری دوسرے مصلحین اور شاکستہ اکرام اللہ جیسی دردمند پر غلوں خواتین نے اتنے طویل عرصہ تک ایسی بے انصافیوں کے خلاف جو آواز اٹھائی اس کے باوجود صورت حال جوں کی توں کس وجہ سے ہے؟

بیگم صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں: "1932 عیسوی میں شاہ بانو کی شادی محمد احمد خاں سے ہوئی تھی۔ 5 اولادیں، 3 لڑکے اور 2 لڑکیاں ہوئیں۔ 1975 عیسوی میں شادی کے 43 برس بعد ان کے شوہر نے ان کو طلاق دے دی۔ ایڈووکیٹ شوہر کی آمدنی پانچ ہزار روپے ماہوار ہے۔ طلاق کے بعد یہ بوڑھی عورت ٹھوکرین کھایا کی۔ اس کیس کے متعلق چند دینی عالموں نے فرمایا ہے کہ طلاق کے بعد عورت کے ماں باپ یا دوسرے خاندان والے کفالت کے ذمے دار ہیں، شوہر نہیں۔ تین سال تک لڑکوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ لڑکیاں جانے کن خالوں کے قبضے میں

ہیں۔ یہ ضعیف خاتون عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتی رہی۔ ایک عدالت نے کسی دفعہ کی رو سے 179 روپے 20 پیسے ماہوار لینے کا حقدار ٹھہرایا۔ شاہ ہالو نے سپریم کورٹ میں اپیل کی۔ اس عدالت عالیہ نے شاہ ہالو کو پانچ سو روپے ماہانہ کا مستحق ٹھہرایا تو مسلم پرسنل لا کے محافظوں کی غیر وحشیانہ جوش میں آگئی اور یہ مسئلہ پورے زور و شور سے اٹھ کھڑا ہوا کہ بے چارے شوہر کو بیوی کی عدت ختم ہونے کے بعد اتنی خطرناک رقم ادا کرنے پر مجبور کرنا اسلام اور مسلم پرسنل لا کے خلاف ہے۔“

اس مضمون میں بیگم صالحہ عابد حسین نے جگہ جگہ قرآن شریف کی آیات کے حوالے دیے ہیں جن کی رو سے عورت پر اس قسم کی بے انصافی کا جواز نہیں ملتا۔ لہذا اب ’قومی آواز‘ میں مولویوں کے نہایت غصیلے خطوط اور مضامین موصوفہ کے خلاف چھپ رہے ہیں۔ شدید سلامتی اور مذہبی پابندیوں کا رد عمل انتہا پسندی اور بغاوت کا روپ دھار لیتا ہے۔ چنانچہ آج کی نوجوان لڑکیاں جو یہاں دیمینز کلب کی قیادت کر رہی ہیں وہ اپنا انسپریشن امریکہ اور یورپ کی آزادی پسند خواتین سے حاصل کر رہی ہیں اور بعض اوقات تو ازن برقرار نہیں رکھ پاتیں۔

علی گڑھ کے شیخ محمد عبداللہ، لاہور کے مولوی ممتاز علی دہلی کے علامہ راشد الخیری اور کلکتہ کے جسٹس کرامت حسین جادہ اعتدال کے قائل تھے۔ انھوں نے لکھنے والیوں کی جو جماعت تیار کی وہ بھی اسی اعتدال کی حامی تھی اور اس کی ایک روشن مثال شائستہ اکرام اللہ بھی ہیں۔ مغرب کی چکاچوند سے کبھی مرعوب نہ ہوئیں اور اپنی صالح تہذیبی روایات کو ہمیشہ مقدم سمجھا۔

لیکن ’صالح روایات‘ کی بھی متضاد تاویلیں کی جاسکتی ہیں۔ ہر ملک کے سماجی نظریات مختلف ہوتے ہیں۔ شرق و وسط کی مسلم خواتین مغربی لباس پہنتی ہیں اور سگریٹ جیتی ہیں، ہمارے ہاں دونوں باتیں معیوب۔ ہماری اکثریت اب تک پردے کی حامی ہے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں پردے کا رواج نہیں۔ برطانوی پنجاب میں مسلمانوں کے ہاں لڑکیوں کے لیے ہندو قانون وراثت رائج تھا اور کشمیر کی مساجد میں مرد و عورت اکٹھے ہو کر مناجاتیں اور درود شریف پڑھتے ہیں۔ عورت کی قربانی ایسا روغیرہ بھی شرعی تصورات ہیں۔ ایک دفعہ اداکارہ وحیدہ رٹن نے مجھے بتایا کہ برلن کے فلم فیسٹیول میں ان کی فلم ’صاحب بی بی غلام‘ پیش کی گئی تو اس میں بیٹا کماری

کی شوہر پرستی اور مصائب کی داستان ملاحظہ کرتے ہوئے یورپین ناظرین کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ خاتون اس قدر تکالیف کیوں بھگتی رہی ہے۔ شوہر اتنا بے ہودہ ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟ شائستہ آپا دراصل میری والدہ کی مداح اور ملاقاتی تھیں۔ ان کی پھوپھی بختہ اختر سہروردی سے بھی والدہ کی دوستی تھی۔ میں شائستہ آپا سے کراچی میں محض ایک مرتبہ ملی تھی گو بچپن سے ان کے مضامین 'عصمت' میں پڑھتی آئی تھی۔ اس زمانے میں 'عصمت' میں چھپنے والے بعض نام نہاد بڑے پراسرار سے لکھتے تھے۔ جمیل بیگم کلکتہ والی صاحبہ، ب. ن. آنسہ ابراہیم مدراس، سرداری محمدی بیگم آف والی (اب جا کر معلوم ہوا کہ یہ مہاراشٹر کی ایک مسلم ریاست تھی) صفرا ہالیوں مرزا، جہاں بانو نقوی (حیدر آباد) سز برلاس از نوکیو، فاطمہ خیری از برلن، شائستہ اختر سہروردی (لندن)۔

واقعی، کس قدر زبردست Network تھا۔

تو کراچی کی ملاقات کے برسہا برس بعد اب علی گڑھ میں شائستہ آپا سے ملنا ہوا۔ ان کے نہایت شفقت آمیز خط بھی کبھی آ جاتے تھے۔ پچھلے بیس پچیس سال کے عرصے میں بہت سے لوگوں کی مصیبتوں میں انقلاب آچکا ہے جو خواتین و حضرات پہلے ملے تھے وہ خاصے نادرل تھے، اب نخواست، بکیر، خود پرستی، خود نمائی کے نمونے۔ یا الٹی لوگ اتنا بدل سکتے ہیں؟

شائستہ آپا ان گنی جتنی ہستیوں میں سے ہیں جن کے مزاج اور کردار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ان کی وضع داری منکر المزاج اور طبیعت کی سادگی واقعی حیرت انگیز ہے۔

ایک تو جہان سوئم عالمی ریشہ دوانیوں کا شکار ہے ہی، اوپر سے نیا طاقتور میڈیا انہوں کی اس طرح تشکیل کر رہا ہے کہ سب ایک دوسرے کے لیے صغیریت بن کر رہ گئے ہیں۔ پہلے ہمارے روپے بزرگان دین اور صوفیائے کرام اور ان کے بعد ہمارے مصلحین بناتے تھے اور انسان دوستی پر مبنی تھے۔ وہ مثنیٰ روپے نہیں تھے۔ آج ہم دوسرے ملکوں مختلف النوع معاشروں، مذہبوں اور سیاسی نظریات کے متعلق حتیٰ روپے اس وجہ سے اختیار کر چکے ہیں کیونکہ میڈیا صبح سے شام تک ہمیں feed کرتا رہتا ہے۔ یہ بڑی خوفناک صورت حال ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو فریق

جانی، مثال کے طور پر ہندوستان اور پاکستان سوویت یونین اور امریکہ کے متعلق متنی خیالات کے مالک نہ ہوں جو میڈیا کے ذریعہ برسوں سے ان کے ذہنوں میں اور لاشعور میں جاگزیں ہو چکے ہیں۔ نئی نسل اس نئی آفت کی سب سے زیادہ شکار ہے۔ جارج اورویل نے اپنی کتاب '1984' میں اس لرزہ خیز صورت حال کی پیشین گوئی کی تھی۔ لہذا ایسے حالات میں ہیومنزم کا چراغ جلانے رکھنا بہت بڑی بات ہے اور گہری بصیرت اور ایک متوازن شخصیت کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ ایک نہایت قوم پرست، محبت الوطن پاکستانی خاتون ہیں جنہوں نے عالمی ایوانوں میں اپنے وطن عزیز کی نہایت خوبی سے نمائندگی کی ہے۔ ساتھ ہی وہ ایک وسیع ذہنی کلچر کی مالک ہیں کیونکہ ان کو وہ روایات ورثے میں ملی ہیں جن کا مدار کشادہ نظری اور دردمندی پر ہے۔ مجھے یاد ہے کئی سال ہوئے انہوں نے مجھے اپنی کتاب 'نیک بیباں' کراچی سے بھجوائی تھی اس پر انہوں نے لکھا تھا 'عزیزہ قرۃ العین حیدر کو جو آج کے زمانے کی ہو کر بھی گزرے ہوئے اقدار سے آگاہ ہے۔' اس کے دیباچے میں انہوں نے تحریر کیا ہے: "اس غرض سے یہ مختصر خاکہ لکھ رہی ہوں کہ میری خالہ، پھوپھی، وادی، جانی اور دوسری رشتے دار بستیاں نہیں تھیں اور نہ انہوں نے کوئی خاص کمال حاصل کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے کی پیداوار، اپنی تہذیب کے معمولی نمونے تھیں۔ لیکن آج کل کے معیار کے لحاظ سے وہ انسان نہیں فرشتہ معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے حالات زندگی پڑھیے اور داد دیجیے، اس تہذیب و تمدن کو جس کی وہ آئینہ دار تھیں۔"

جب میں نے 'کار جہاں دراز ہے' میں اپنے دو یہاں دبیمہال کے بزرگوں کا تذکرہ کیا جو اس پرانے تمدن اور تہذیبی اقدار کے نمائندے تھے تو اعتراضات کی بوجھار شروع ہو گئی۔ "ان کے ہاں تو ہر شخص فرشتہ ہے۔ انہوں نے تو اپنے رشتے داروں کو بالکل آئینہ یارز کر کے پیش کیا ہے۔ یلدرم کا کردار تو لگتا ہے آدمی نہیں دیوتا تھے۔" یہ جملے اور ریمارک جانی گرامی نقادوں نے کتاب کے تبصروں میں لکھے۔ مجھے یہ سب پڑھ کر اس وجہ سے افسوس نہیں ہوا کہ نقاد تنقید کے بجائے تنقیص کے عادی ہیں کیونکہ میں اپنی تصانیف کے سلسلے میں کربہ ترین اور انتہائی غیر ادبی تبصروں کی عادی ہو چکی ہوں، لیکن اس سوانحی کتابوں کے چند کرداروں کے متعلق یہ پڑھ کر کہ

بالکل غیر حقیقی معلوم ہوتے اس المناک حقیقت کا انکشاف ہوا کردار کا کراس اس قدر عام ہو چکا ہے کہ بہت بڑے مکھ لوگوں کو بھی (ناقدین کو تو اہل بصیرت سمجھا جاتا ہے) بچھلی نسل والے اب فرضی یا خیالی معلوم ہوتے ہیں۔

جو خاندان اپنی دھندلاری اور اتھاد کے لیے مشہور ہیں وہیں اب جوتیوں میں دال بٹ

رہی ہے۔

ایسا یوں ہوا؟ مغرب نیوکلیر فزکس کی اسٹیج پر پہنچ چکا ہے اور وہاں گھریلو زندگیوں کے انتشار اور خود فرضی اور نفسانسی کا جو عالم ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

لیکن اب مشرق میں بھی معاشرے کا زوریں بریک ڈاؤن ہو چلا ہے۔ کوئی کسی سے بہتر نہیں ہے۔ چند سال قبل ایک افریقی فلم دیکھی تھی کولونیل حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے والے لیڈر نے آزادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ قومی اسمبلی ہال سے یورپین گورنر جنرل کا سر مریم بمسودہ ہٹا کر اپنا بمسودہ ہاں خود لے جا کر رکھا اس کے بعد پہلی بیوی کی موجودگی میں ایک کسٹن لڑکی سے نکاح فرمایا اس کے بعد اپنے لیے ایک عالی شان محل تعمیر کروانے میں مصروف ہو گئے۔

شائستہ سمجھو دردی اکرام اللہ کا آبائی وطن بنگال تھا جو ہمیشہ طوفانوں کی زد میں رہا۔ مگر اسی بنگال کے دریاؤں پر سبکدوش کائیں بڑی بہادری سے رواں رہتی ہیں اور اندھیرے آبی راستوں پر ان کے چراغ جھلکایا کرتے ہیں۔

شائستہ آپا کی منور شخصیت سے موجودہ نسل جس قدر ضیا حاصل کر سکے وہ اس کی خوش قسمتی ہوگی۔



## لیڈی چنگیز خاں

(عصمت چغتائی)

24 اکتوبر کی شام پدماسچند نے زمرہ میں ہوئی آواز میں ٹیلی فون پر اطلاع دی 'عصمت آپا گزر گئیں'۔

گزر جانا یا Passed away بہت ہی گنیمت فخر ہے۔ کثرت استعمال سے اس کی معنویت کھو گئی ہے۔ یعنی انسان دنیا سے محض گزر جاتا ہے۔

عصمت چغتائی بھی ایک وقت دنیا میں آئیں۔ سماجی اور ادبی انقلاب کے ایک پر شور دور میں اپنا ہنگامہ خیر رول ادا کیا، اور گزر گئیں۔

ایک کلیشے ایسے تعزیتی مضامین میں لامحالہ استعمال کیا جاتا ہے کہ 'گزرنا ہم سب کو ہے'۔ سوال یہ ہے کہ کون کس طرح گزرتا ہے۔

پدماسچند کی رقت اس حقیقت کی گواہی تھی کہ جو لوگ مرحومہ سے ذاتی طور پر واقف تھے وہ ان کو کتنا چاہتے تھے مگر اسی شام آدھ گھنٹے کے بعد جب دور درشن کی ہندی اور انگلش خبروں میں ان

کی وفات کی خبر کے ساتھ لفظ تصویر دکھائی گئی جو عصمت چغتائی کے بجائے ان کی والدہ کی تصویر تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ اگر وہ کوئی اہم اور ہنگامہ آرا سیاسی لیڈر، بڑی انڈسٹریلسٹ یا گلیسرز قلمی شخصیت ہوتیں تو کیا دور درشن ایسی بے پرواہی برت سکتا تھا؟

دوسری صبح اخبارات میں جو خبر چھپی اس میں ان کے افسانے 'لحاف' ہی کا تذکرہ تھا اور یہ بالکل نہیں کہا گیا تھا کہ وہ ترقی پسند تحریک اور نئے افسانے کی ایک معمار تھیں۔ ان کی گہری انسان دوستی کی مثالیں ان کے لاجواب افسانے 'نحس کی تانی'، 'چوتھی کا جوڑا'، 'بچھو بھو بھی' اور 'بھینڑیں' ہیں۔ بقول ڈاکٹر صفائی مہدی عصمت آپا کو آخر آخر میں اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ لوگ ان کو محض 'لحاف' کی وجہ سے یاد رکھتے ہیں اور یوڑھی بے کس عورتوں اور سماج کے مظلوم افراد کے متعلق ان کی کہانیوں کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ گویا جنسی موضوعات اور عصمت چغتائی لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز میں جب یہ نئے ادیب ایک جامد اور بے حسن معاشرے کو سمجھونے کی کوشش میں جپے ہوئے تھے، منہ اور عصمت آپا نے ایسے افسانے لکھے جن پر فلٹائی کے تھوڑے چلائے گئے لیکن یہ دونوں ادیب جو باغیانہ ذہن رکھتے تھے، بہت حد تک اپنے مشن میں کامیاب رہے۔ یعنی انھوں نے دو ہرے معیار رکھنے والے معاشرے میں پچھل چادی۔

1869 عیسوی میں پنپنے کی رشیدۃ النساء بیگم نے 'اصلاح نسواں' کے عنوان سے ایک ناول لکھا تھا۔ اس کے بعد اردو کی خواتین ناول نگاروں کی ایک پوری نسل نے اصلاحی لیکن نہایت 'شریطانہ' ناول تصنیف کیے۔ جن کے ذریعے انھوں نے سماج کے ہر طبقے میں عورتوں پر ہونے والے مظالم کی حقیقت پسندانہ انداز میں عکاسی کی، لیکن وہ خواتین اپنے سماجی اصلاح پسند درمیانی دور کی نمائندہ تھیں۔ انقلابی رویے اور انداز تحریر کا آغاز 1932 عیسوی میں 'انگارے' کی اشاعت سے ہوا۔ جس کے مصنفین میں ڈاکٹر رشید جہاں بھی شامل تھیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ عام طور پر علی گڑھ کو مسلم قدامت پرست ٹڈل کلاس یا

مسلم اسٹیبلشمنٹ (Establishment) کا نمائندہ اور نقیب سمجھا جاتا ہے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کیا گیا ہے کہ کئی انقلابی تحریکوں کا سرچشمہ بھی یہی ادارہ تھا۔ مثلاً سید احمد خاں کو غوروں کی انگریزی تعلیم کا مخالف تصور کیا جاتا ہے۔ دراصل ایسا نہیں تھا۔ وہ تعلیم نسواں کو محض قتل از وقت سمجھتے تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف انڈر گراؤ تحریک علی گڑھ میں 1903 عیسوی کے لگ بھگ شروع ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالرحیم بجنوری اور یلدرم جس میں شامل تھے۔ تحریک کا کہیں تذکرہ ہی نہیں کیا جاتا۔ ادب کے مختلف نئے رجحانات علی گڑھ کی پیداوار ہیں۔ انقلابی شاعروں کی فہرست بھی قیام تعارف نہیں۔

عصمت چغتائی علی گڑھ گزٹ کالج میں شاید 1938 عیسوی میں میری پچازاد بہنوں کی ہم جماعت تھیں۔ انھیں دونوں مسلم یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم اس طرز پر شروع ہوئی تھی کہ کلاس میں ایک اسکرین لگادی جاتی تھی۔ اس کے پیچھے بیٹے کرلوکیاں پکچر سننے لگتیں۔ اس زمانے کے متعلق عصمت آپا کا ایک افسانہ پردے کے پیچھے شائع ہوا۔ یہ بہت ہی مصوم قسم کا خاکہ تھا جس میں انھوں نے لڑکیوں کے پس پردہ ہنسی مذاق اور فقرے بازی کا نقشہ کھینچا تھا۔ لیکن بہت جلد پردے کے پیچھے عصمت کے ادب کا استعارہ بن گیا۔ کیونکہ انھوں نے ہندوستانی سماج کی ریا کاریوں کا پردہ فاش کرنے کی ہمت کی۔ وہ ایک باقی عورت کہلائیں اور اپنی اس حیثیت سے بے حد سرور اور لطف اندوز ہوئیں۔ انھیں لوگوں کو چونکانے اور مرد خدا کی مخالفت کرنے کا فن آتا تھا۔

علی گڑھ ہی کی ڈاکٹر رشید جہاں نے کیونسٹ پارٹی میں شرکت کی اور ان کی چھوٹی بہن خورشید جہاں بمبئی ٹاکنز میں 1937 عیسوی میں شامل ہوئیں اور بطور رینو کا دیوی شہرت حاصل کی۔ ان کی بھانج شاہدہ عبداللہ نے فلمی نام نیا اختیار کیا۔ آج یہ باتیں غیر اہم معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن آج سے پچاس پچپن سال قبل یہ بہت بڑی سماجی جسارت تھی۔ عصمت چغتائی بھی اسی بیڑی سے تعلق رکھتی تھیں اور اس وقت جب اردو میں خواتین اصلاحی افسانے لکھ رہی تھیں یا زیب النساء وغیرہ زمانہ رسالوں میں ان کی روایتی کہانیاں چھپتی تھیں (جن میں سے بعض بہت اچھی ہوتی تھیں۔ حجاب امتیاز علی اردو گلشن کا ایک علاحدہ باب ہیں جس کے تذکرے کی اس وقت گنجائش

نہیں) اس وقت عصمت چغتائی ہم کے گولے کی طرح میدان ادب پر آن گئیں بقول شخصے: The

rest is history

ان کا پہلا مجموعہ شاید 'چوٹیں' تھا یا 'کلیاں' مجھے یاد نہیں۔ غالباً 1941 عیسوی میں چھپا تھا۔  
عصمت آپا نے زندگی کے بہت قریب و فراز دیکھے ہیں۔ میں ان سے پہلی بار 1956 عیسوی میں بمبئی میں ملی۔ جب وہ اور شاہد لطیف اپنے فلمی کیریئر کے عروج پر تھے، وہ اسکرپٹ لکھتی تھیں اور شاہد لطیف ڈائریکٹ کرتے تھے اور وہ ساری پکچرز ہٹ ثابت ہوتی تھیں۔ دو کے نام مجھے یاد ہیں، 'خدی'، 'بزدل'۔ اور ایک فلم جس میں انھوں نے شاید زنگس کی زندگی کو موضوع بنایا تھا۔

اس دور میں بھی انھوں نے چند اچھے افسانے لکھے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اسی زمانے سے اسکرپٹ نوکری کے ذریعہ غیر شعوری طور پر ان کے ہاں افسانے کی فنی گرفت ذرا کمزور پڑ گئی اور کچھ گھاس کاٹنے والا انداز آ گیا۔ 'عجیب آدمی' اور 'معصومہ' میں کہیں کہیں فلم گوئپ کا سا انداز جھلکنے لگا۔

لیکن عصمت آپا نے اردو گلشن کو جو پیش بہا کہانیاں دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اچھی کہانی کا ایک معیار میں یہ سمجھتی ہوں کہ آپ اسے بار بار پڑھیے اور پھر پڑھنے کو جی چاہے۔ منہ اور عصمت کی چند کہانیاں اسی معیار کی ہیں۔

کبھی کبھی میں ان کو لیزڈی چنگیز خاں پکارتی تھی کیونکہ وہ جولا نکا و اردو کی ایک ایسی چغتائی شہسوار اور تیرانداز تھیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔

ان کے افسانوں میں جو بے ساختہ پن اور زبان کا ہلکا رہ ملا ہے، وہ ان کی اور ان کے خاندان کی دوسری خواتین کی اپنی زبان تھی۔ عصمت آپا ایک شفیق، منہ پھٹ، صاف گو اور ڈھیٹ، ظریف الطبع خاتون تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک خاتون کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس زمانے میں مغل اعظم پکچر ہٹ جا رہی تھی۔ وہ خاتون ایک دعوت میں مغلہ سا جوڑا پہن کر شامل ہوئیں اور کھانے کے بعد

ایک صوفے پر مدھوبالا کے پوز میں دو پندہ تان کر نیم دراز ہو گئیں جو مہمان ہاتھ دھونے کے لیے صوفے کے پاس سے گزر رہے تھے وہ لامحالہ ٹھٹھک کر ان کو دیکھتے۔ اسنے میں عصمت آپا نمودار ہوئیں اور با آواز بلند ڈرامائی انداز میں پکاریں۔ "انارکلی! میں آگیا۔"

جاں نثار اختر کے انتقال کے وقت ایک کھرام مچا ہوا تھا۔ ایک خاتون جوان کی منہ بولی بہن تھیں، پچھاڑیں کھاری تھیں۔ ایک عورت چلائے جا رہی تھی۔ ارے بیوہ کو بلاؤ، بیوہ کی چوڑیاں توڑو۔ عصمت آپا کچھ دیر خاموشی سے یہ منظر دیکھتی رہیں پھر آگ بگولہ ہو کر اٹھیں۔ پہلے تو ان منہ بولی بہن کو اچھی طرح جھاڑا۔ اس کے بعد جو عورت بے چاری بے حال خدیجہ کی چوڑیاں توڑنے پر کمر بستہ تھی، عصمت آپا نے اس کی طبیعت صاف کی۔ پہلے توڑ کیں۔ عورت ہی کو کیوں کہا جاتا ہے کہ فلاں کی بیوہ ہے۔ مرد کے لیے کیوں نہیں کہتے کہ فلاں کا رٹو دا ہے اور فوراً جب وہ رٹو دا ہو تو کھینچ کر اس کی نینک اور گھڑی توڑ ڈالو۔

انھوں نے اپنی شدید مالی مشکلات کے زمانے میں بھی کسی سے اپنے مسائل کا رونا نہیں رو دیا۔ نہ دوستوں کی بے انتہائی کا گلہ کسی سے کیا۔ انتہائی خودداری کے ساتھ اپنے قریبی احباب کی محفل میں بیٹھی تاش کھیل کیں۔

عصمت آپا بنیادی طور پر اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جسے ایک زمانے میں Free thinker کہا جاتا تھا۔ ان کی بڑی بیٹی نے بنگلور میں سول بیرج کر لی اور اطلاع دی کہ اس کے ساس سرخندہی رسوم کی ادا نگلی بھی چاہتے ہیں۔ آپ بھی آجائیے۔ بنگلور سے واپس آ کے عصمت آپا نے اپنے خاص انداز میں نہایت محفوظ ہوتے ہوئے سٹاپا کہ صبح میں اٹھ گئی۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ ان کا پنڈت آ گیا۔ اب وہ بچا رہ ایک کمرے میں پریشان بیٹھا تھا۔ کہنے لگا مہورت لگلی جا رہی ہے اور یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ میں پوجا کیسے شروع کروں۔ میں نے کہا اے پنڈت جی، آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ میں پوجا شروع کر دئے دیجی ہوں۔ بس میں بیٹھ گئی اور میں نے پوجا کر وادی۔"

میں نے حیران ہو کے پوچھا، "بھلا آپ نے پوجا کس طرح کر وائی؟" کہنے لگیں،

”اے اس میں کیا تھا۔“ پڑت نے کہا، ”میں منتر پڑھتا ہوں آگ میں تھوڑے تھوڑے چاول بھیجی جائے۔ میں چاول بھیجی گئی۔ اسے میں گھر کے اور لوگ بھی آگئے۔ بس!“

ایک امریکن اسکالر شاید کارلو کپولا بمبئی آیا ہوا تھا۔ ایک دن اس نے بتایا کہ آج کل عصمت آپا امام حسین کے متعلق بے حد فکرمند ہیں۔ اب میں نے دیکھا کہ محرم کی ایک مجلس میں عصمت آپا سیاہ بلاؤز، سیاہ ساڑھی پہنے ایک زمانہ امام باڑہ میں بیٹھی نہایت غور سے مصائب کا بیان سن رہی ہیں۔ کہنے لگیں ”بھئی کمال ہے۔ امام حسین کس قدر کمال کے انسان تھے۔ دیکھو تو انھوں نے کیا کیا۔“ نہ جانے انھیں امام حسین میں دلچسپی کس طرح پیدا ہوئی، لیکن اب مجلسوں میں سیاہ پوش عصمت چٹائی اکثر نظر آنے لگیں اور بمبئی کے اہل تشیع میں بے حد مقبول ہو گئیں۔ سب ان کے حب الی یث سے بہت متاثر نظر آئے۔ فرمایا ”میں اصل میں مرثیہ میراثیس کوئٹر میں ڈھال رہی ہوں۔ اس کے بعد ان کی کتاب ایک قطرہ خون چھپی۔

مرد دراز تک مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن پچھلے چند سال سے خصوصاً ان کی زندگی کے آخری زمانے کے متعلق جس انداز میں لوگوں نے غلو کے ساتھ ان کی دینی کیفیت کا نقشہ کھینچا ماس سے انسانی نفسیات کا ایک عجیب و غریب پہلو سامنے آیا۔ بچوں کے لیے دراز کی عمر کی دعا مانگی جاتی ہے۔ جیتے رہو۔ جیتی رہو سب سے بڑی دعا بھی جاتی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے لمبی عمر ملے۔ لیکن جب کوئی دوسرا فرد اس منزل پر پہنچ جائے، جب اکثر اوقات اس کی یادداشت کمزور پڑ جاتی ہے تو وہ فوراً Senile مشہور کر دیا جاتا ہے۔ عصمت آپا کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا، لیکن ان کے لیے لوگ اس طرح حیرے لے کر بات کرتے تھے۔ ارے صاحب وہ تو اب چار برس کی بچی بن گئی ہیں۔ گڑیاں کھیلنے لگی ہیں وغیرہ۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔

جب ہم دوسروں کے بڑھاپے اور اس سے متعلق عوارض کا مذاق اڑاتے ہیں اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر بزرگوں کی دعائیں قبول ہو گئیں تو ہم خود بھی اس اسٹیج پر پہنچ سکتے ہیں جب ہم مضحکہ خیز سمجھے جائیں یا کم از کم ہمارے تذکرے سے لوگ لطف اندوز ہوں۔ یہ تو اکثر سننے میں آتا ہے۔ فلاں فلاں... اچھا وہ اب تک زندہ ہیں؟ کمال ہے۔ ہیں ہیں ہیں۔ وہ تو اب اگلی پر

لٹکانے کے لائق ہوں گے/ ہوں گی۔ عصمت آپا اکثر کہتی تھیں، ”بھئی مجھے تو قبر سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مٹی میں تو پدے دیتے ہیں۔ دم گھٹ جائے گا۔ ایک بار میں نے کہا کہ دم ہوتا ہی کہاں سے جو گھٹے گا۔ کہنے لگیں ”نہیں بھئی کیا پتہ کس وقت واپس آ جائے۔ بھئی میں تو اپنے آپ کو جلواؤں گی۔“  
عصمت آپا کا کمال یہ تھا کہ جو کہتی تھیں کر بھی دکھاتی تھیں۔ لہذا سنا ہے کہ جب مجروح سلطان پوری و فیروزہ ان کے انتقال کی خبر سن کر سیدھے چند واڑی قبرستان پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کو ان کی وصیت کے مطابق سپرد برق کیا جا چکا تھا۔ انھوں نے کہہ رکھا تھا کہ جب میں مردوں تو کسی کو اطلاع نہ دینا اور مجھے فوراً کریم پوریم میں پہنچا دینا۔ کیا عجیب و غریب خاتون تھیں۔ باغ و بہار اور درو مند۔

عصمت چغتائی بورڈوں کو جھیلنے کی بے پناہ صلاحیت بھی رکھتی تھیں۔ ان کی پوری شخصیت کی تصویر کشی اس ایک مختصر مضمون میں نہیں کی جاسکتی۔ ان کی جیسی منفرد انسان اور منفرد ادیب اب کہاں سے آئے گی۔ آل چغتائی کی اردوئے معلیٰ کب کی ختم ہوئی۔ اردو زبان کی کاٹ اور ترک تازی عصمت خانم کے ساتھ چلی گئی۔

---

(ماہنامہ ”آج کل“، جنوری 1992)





## مہذب اور وضع دار انسان

(بجروح سلطان پوری)

مجھے بجروح صاحب کا وہ زمانہ دھندلا سا یاد ہے جب وہ میرے چچا سید ثار حیدر زیدی کے یہاں مقیم تھے۔ چچا جان ہونہار شاعروں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور بجروح صاحب بھی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ غالباً آزادی سے قبل ہی ممبئی چلے گئے تھے جہاں وہ ترقی پسند شعرا کی صف اول میں شامل ہوئے۔ اسی زمانے سے انھوں نے فلموں کے لیے نغمہ نگاری شروع کی۔ اسی وقت سے ساحر اور بجروح نے فلمی گانوں کا معیار اتنا بلند کر دیا کہ ان کے بہت سے گیتوں کو ادبی اہمیت حاصل ہوئی۔ ہمارے ہندوستانی سنیما کو ہندی فلم کہا جاتا ہے لیکن ان کی بے پناہ مقبولیت کی ایک وجہ ان کے اردو مکالمے اور اردو نغمے ہی ہیں جو ٹکیل بدایونی، نقشب لاکل پوری، کنفی اعظمی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی اور بجروح سلطان پوری نے لکھے۔ آپ دنیا کے کسی گوشے میں چلے جائیے جہاں ہندوستانی آباد ہیں، وہاں آپ کو دور دراز کی پہاڑیوں اور گاؤں اور شہروں میں لڑکی کی آواز سنیں گے ہوئے

مجدوح کے فتنے سنائی دیں گے۔ آج کی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور سے قبل کسی شاعر یا نغمہ نگار کو ایسی عالمگیر شہرت حاصل ہونی ممکن نہیں تھی۔ ممبئی میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود مجدوح صاحب نے اودھ کے کلچر کو اپنے گھر میں زندہ رکھا تھا۔ وہ ایک نہایت مہذب اور وضع دار انسان تھے۔ مجدوح صاحب سے ممبئی کی محفلوں میں اکثر ملاقات ہوتی تھی اور وہ بہت سی شفقت سے ملتے تھے۔ ان کی بیگم فردوس بھی ایک بڑی خلیق اور فلسفہ خاتون ہیں۔ میں شاعروں اور ادیبوں کی نادوش کی محفلوں میں جانے سے احتراز کرتی ہوں لیکن مجدوح صاحب کے یہاں میں کئی بار گئی کہ ان کے یہاں کارکھ رکھاؤ قابل تعریف تھا۔ ان سے آخری ملاقات دہلی میں ہوئی جب میں نے انھیں اور چند اور دوستوں کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ اس میں اردو داں امریکن خواتین بھی شامل تھیں۔ انھوں نے حکمت پڑھی تھی اور عربی قاری تو گویا ان کی گھنٹی میں پڑی تھی لیکن ممبئی میں انھوں نے خود انگریزی پڑھنی شروع کی اور انگریزی بولنے میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ ان کے وفات کی خبر سن کر مجھے یہ شعر یاد آ رہا ہے:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھے جاتے ہیں  
کہیں سے آج بٹائے دوام لا ساتی

## محل میں رہ کے جھونپڑوں کے خواب دیکھنے والے

(سجاد ظہیر)

ہئے بھائی کے والدین میرے ماں باپ کے بہت گہرے دوست تھے۔ جب ہئے بھائی 1936 عیسوی میں بار ایٹ لا کر کے لندن سے ہندوستان لوٹے تو انھوں نے اپنے والد سر وزیر حسن کے ساتھ الہ آباد میں وکالت شروع کی۔ لیکن ان کے جیسے بچے اور ایماء ارا دی کے لیے وکالت کے داؤ بیچ کہاں ہوتے۔ بہت جلد ہی انھوں نے وہ سب چھوڑ کر ترقی پسند معنیتیں کا کام شروع کر دیا۔ جب 1936 عیسوی میں اس تحریک کی پہلی اور کامیاب کانفرنس ہو گئی تو ان کے والدین کو فکر شروع ہوئی اور ان لوگوں نے سوچا کہ اگر ان کی شادی کر دی جائے تو انھیں پھر سے راستے پر یعنی وکالت کرنے پر راضی کرایا جاسکتا ہے۔

ہئے بھائی نے یہ شرط رکھی کہ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی سے ہی شادی کریں گے۔ اس زمانے میں مسلمان پڑھی لکھی لڑکیاں تعداد میں بہت زیادہ نہیں تھیں اور جو تھیں ان کے ماں باپ ہئے بھائی کو پسند تو بہت کرتے تھے لیکن ان کا کہنا یہ تھا کہ آئے دن تو یہ لڑکا ٹیل جانے پر غماز رہتا

ہے اس سے اپنی لڑکی کی شادی کرنا زرا سہوش ہے۔ بٹے بھائی دو بار چھوٹے چھوٹے وقتوں کے لیے جیل جاتے تھے۔

زیادہ تر لوگ جمونپڑوں میں رہ کر ملکوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ بٹے بھائی مکمل میں رہ کر جمونپڑوں کے خواب دیکھتے تھے۔ ان کے والد سر دزیر حسن ایک کامیاب بیرسٹر اور اودھ چیف کورٹ کے چیف جج رہ چکے تھے۔ نائٹ کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔ ان کے سارے لڑکے انگلینڈ میں پڑھے تھے۔ ان سب کے باوجود بٹے بھائی ملک کی آزادی کی راہ پر چل پڑے تھے اور ہندوستان میں انتخاب لاکر امیر اور غریب کے بھید کو مٹانا چاہتے تھے۔ ان کی ماں لیڈی دزیر حسن ایک روشن دماغ بیوی تھیں، جنہوں نے پردہ چھوڑ دیا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب ترکی دنیا بھر میں اور خاص کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ 1930 عیسوی میں کمال اتاترک نے ترکی میں عورتوں کو پردے سے آزادی دلادی۔ اس کا سیدھا اثر یہاں کے مسلمانوں پر ہوا۔ سیری ماں نے بھی اسی دور ان پردہ چھوڑا۔ شریف گھروں کی عورتوں نے باہر نکلتا شروع کیا اور خاص کر کے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ سیری ماں اور لیڈی دزیر حسن ساتھ مل کر کرامت حسین مسلم گزٹ کا لکھ جاتیں۔ وہاں کی لڑکیوں کے لیے پکے والے کھانوں کی جانچ کرتیں، باورچی خانے میں صفائی وغیرہ دیکھتیں اور ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں سے بات چیت کرتیں۔ ان کا مقصد ہوتا کہ کوئی لڑکی اس لیے پڑھائی نہ چھوڑ دے کیونکہ اسے گھر کی یاد آ رہی ہے یا اس کی دیکھ بھال بھیک سے نہیں ہو رہی ہے۔

لیڈی دزیر حسن ایک نہایت ہی خوبصورت اور خوش مزاج بیوی تھیں۔ وہ پمپسلی کاؤنسل بورڈ کی ممبر بھی تھیں اور سماجی معاملات میں حصہ بھی لیتی تھیں۔ ہمارے سامنے اس وقت عمرانی تبدیلیاں نہایت خاموشی مگر تیز رفتار سے ہو رہی تھیں۔ 1857 عیسوی سے چند سال بعد ہی لکھنؤی سماج میں انگریزی کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ لکھنؤ برطانوی حکومت کی ایک توسیع بن چکا تھا۔ کئی انگریزی کے اسکول بھی کھل گئے تھے۔ لیکن لیڈی دزیر حسن نے انگریزی تو دور کبھی اردو یا ہندی بھی بول کر نہیں دی۔ ہمیشہ پوربی میں ہی بات کرتی تھیں۔

میری اپنی والدہ اپنے زمانے کی مشہور اور مقبول رائٹر تھیں جو بیسویں صدی کے اوائل میں مس نذر الباقر کے نام سے ناول اور کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ خان بہادر نقی محمد خاں ان کو اردو ادب کی اماں خوا کہا کرتے تھے۔ وہ گہرا سماجی شعور رکھتی تھیں اور سماج کی اصلاح چاہتی تھیں۔

بٹے بھائی کی اس شرط پر کہ لڑکی پڑھی لکھی ہونی چاہیے، ایسی ہی ایک شریف زادی کی کھوج شروع ہوئی۔ یوں تو سر وزیر حسن کے اپنے خاندان میں بھی کئی تعلیم یافتہ لڑکیاں تھیں۔ ایک تو ان کے اپنے چھوٹے بھائی اصغر حسن صاحب کی بی لڑکی تھیں۔ لیکن جھٹانی دیورانی میں یعنی اصغر حسن صاحب کی بیگم اور لیڈی وزیر حسن میں بالکل نہیں جتنی تھی۔ دوسرے لیڈی وزیر حسن کو رشتہ داری میں لڑکوں کی شادی کرنا پسند نہیں تھا۔ لہذا تلاش جاری رہی۔

ہماری والدہ کے ایک منہ بولے بھائی تھے، خان بہادر رضا حسین۔ یہ تھے تو بتارس کے لیکن مدتوں سے اجیر میں رہے تھے اور اجیر اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ اس زمانے میں لوگ رشتے صرف بتا نہیں لیتے تھے انھیں بھاتے بھی تھے۔ مجھے یاد ہے رضا ماسوں میرے لیے، میری آٹھویں سالگرہ پر ایک انگریزی کشیدے کا سیٹ لائے تھے۔ ان کی بڑی لڑکی رضیہ دلشاد تھیں جو اس وقت بی اے کر رہی تھیں۔ میری والدہ سے ان کے بارے میں کھوج خبر لی لیڈی وزیر حسن خود لڑکی کو دیکھنے اجیر گئی۔ وہ خوب غریب نوا لڑکی درگاہ کی زیارت بھی کرنا چاہتی تھیں اور رضیہ آپا کا مزاج بھی بھانپ لینا چاہتی تھی۔ میری والدہ نے رضا ماسوں کو خط لکھا اور لیڈی وزیر حسن کا انھیں کے یہاں ٹھہرنے کا انتظام کیا۔ بہر حال رضیہ آپا کی شادی بٹے بھائی سے طے ہو گئی۔

شادی طے ہو جانے کے بعد رضیہ آپا کی ایک تصویر بھیجی گئی۔ لہریا ساڑی پہنے، سر پر ٹیکہ پہنے اور بچپن سے لے کر اس وقت تک جتنے بھی میڈل انھوں نے جیتے تھے سب لگائے ہوئے۔ یہ تصویر وزیر منزل پہنچانے کا ذمہ بھی میری والدہ کو دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد اجیر سے مصری، میوے وغیرہ بھی آئے اور میرے والدین خان بہادر رضا حسین کی طرف سے منگنی کی رسم ادا کرنے وزیر منزل پہنچے۔

بٹے بھائی کو میں نے پہلی بار اسی منگنی کی رسم پر دیکھا۔ جب میں کوئی گیارہ برس کی تھی اور

میرا پہلا تاثر تھا کہ وہ دیکھنے میں بڑا بے بھولے، بہت ہی معصوم تھے۔ بعد کی ان گنت ملاقاتوں میں ان کی اعلیٰ شخصیت اور نرم مزاجی بھی اس میں جڑ گئی۔ ان سے بات کرتے ہوئے یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ آکسفورڈ کے گریجویٹ، لندن کے بار ایٹ لا ہیں۔ ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ نامی ادیب، تواریخ نویس اور ہندوستان کی سب سے بڑی ادبی تحریک کے بانیوں میں سے ایک پیشوا آپ سے ہم کلام ہے۔ اپنی منگنی کی رسم میں بھی وہ ایسے ایک کونے میں بیٹھے تھے جیسے کہ منگنی ان کی نہیں کسی اور کی ہے۔ اتنا شرمیلا دولہا میں نے دوبارہ نہیں دیکھا۔

امید تو سب نے کی تھی کہ رضیہ آپا شادی کے بعد بٹے بھائی کو سدھار لیں گی اور وہ سیاست چھوڑ کر وکالت کرنے لگیں گے۔ لیکن رضیہ آپا نے اپنی بچپن کی تربیت کو چھوڑ دیا اور پوری طرح سے بٹے بھائی کے رنگ میں رنگ گئیں اور ساری زندگی انھوں نے تحریک میں لگا دی۔

میری سب سے پیاری یاد بٹے بھائی کے بارے میں لاہور کلب کی ہے۔ میں کچھ دوستوں کے ساتھ بیٹھی کلب میں کافی پی رہی تھی کہ ایک اونچا لمبا سا پٹھان اندر آیا۔ شلوار قمیض پہنے، بڑی سی واڑھی اور سر پر پٹھانی صاف۔ میں نے اپنے ساتھ کے لوگوں سے کہا: ”اس پٹھان کی واڑھی سو فٹھ سو فٹھ واڑھ اور صاف اتار دو تو اس کی شکل کتنی بٹے بھائی جیسی ہو جائے گی۔“ میرے دوست نے فس کر جواب دیا ”وہ تو ہوی جائے گی کیونکہ بٹے بھائی، بیچا نا مجھے؟“

وہ فوراً دوسری طرف گھوم گئے اور اپنے ساتھ کے لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ میرے دوستوں نے مجھے آکر پیچھے سے پکڑا اور باہر لے جاتے ہوئے ڈانٹ کر بولے ”کیا کہہ رہی ہو؟ انھیں ایک سپوز کر کے پکڑاؤ گی کیا؟ اس وقت وہ انڈر رگر اوٹھ رہے ہیں۔“

کوئی پندرہ سال بعد جب بٹے بھائی سے ملاقات ہوئی تو سب سے پہلے انھوں نے اس دن کے اپنے برتاؤ اور بے رخی کے لیے معافی مانگی۔ اتنا ڈرتے تھے وہ کسی کا بھی دل دکھانے، چوٹ پہنچانے سے۔

جہاں تک ترقی پسند تحریک کا تعلق ہے میں کبھی بھی اس کی باقاعدہ ممبر نہیں رہی۔ ان کی سب باتوں سے مجھے اتفاق بھی نہیں تھا اور مجھے ایک یہ بات بھی عجیب لگتی تھی کہ عورتوں کی آزادی

پراحتازور دینے والی تحریک میں عورت اتنی کم تھی۔ کسی کانفرنس یا سیمینار میں اگر دو سو کا مجمع ہے تو عورتیں زیادہ سے زیادہ چھ سات ہوں گی۔

لیکن آج کے دور میں محسوس ہوتا ہے کہ وہی ایچ پی، آر ایس ایس، مسلم لیگ اور جماعت اسلامی جیسے تنظیمیں اداروں سے لڑنے کے لیے ترقی پسند مصنفین جیسی تحریک کی بڑی سخت ضرورت ہے جو بلند گٹھ میں ان تعصب پھیلانے والی تنظیموں کی مخالفت کر سکے، جو بھائی چارے اور امن کی بات کریں۔ مجھے خود وہی ایچ پی، مسلم لیگ میں سوائے بچے کے کوئی فرق نہیں لگتا۔ دونوں کو ہی روکنا ضروری ہے ورنہ تو دوبارہ ہم سب قاسم کی کلار پر جا کھڑے ہوں گے۔ کوئی تو ہونا چاہیے جو یہ کہہ سکے کہ ہندو یا اسلام ایک ذاتی و چار ہے اسے دوسروں کے لیے خطرہ نہیں بننا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ذاتی واد آزادی اس بورڈ واڈیو کر سکی کی عیادین ہے۔ لیکن اس میں برابر بہتری کی ضرورت ہے۔ یہ کام کوئی سماجی پارٹی نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے جمہوری طاقت کی ضرورت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ایسی ہی طاقت ترقی پسند مصنفین ہے جو عوام میں شانتی اور ملک میں ایکٹائیڈ کر سکتی ہے۔

---

(نور ظہیر کی کتاب 'میرے حصے کی روشنائی' (دہلی، 2005) کے 'حرف آخر' میں شامل ہے)





## انگریز قوم کی دل و جان سے پرستار

(گل بانو کپاڈیا)

پچھلے پچیس برس سے گل بانو کپاڈیا اس مکان میں رہ رہی ہے۔ پچھلے پچیس برس میں یہ علاقہ ایک خاموش ساحلی ٹپے سے ایک پر رونق آبادی میں تبدیل ہو گیا۔ پچھلے دس برس میں آبادی اونچی اونچی جھللاتی عمارتوں کے مہیب: نئس میں بدل چکی ہے جس طرح خالی اسٹیج پل کے پل میں دوسرے منظر کے لیے جج جاتا ہے اور ڈرامے کا نیا ایکٹ شروع ہو جاتا ہے اپنا گم نام اور غیر اہم رول ادا کرنے کے بعد پچھلے پچیس برس سے گل بانو کپاڈیا ایک پرانے آسیب کی مانند اسٹیج کے ایک دنگ میں پردے کے پیچھے چھپی بیٹھی ہے۔ گل بانو اس محلے کی قدیم ترین عمارت کی مالک ہے بہت جلد اس کی موت کے بعد یہ عمارت ڈھادی جائے گی اور یہاں ٹکڑی ٹلیٹ بن جائیں گے۔ برہا برس سے وہ سر پر سفید ٹلٹل کا رد مال باندھے، شوخ رنگ کی ساری پرہیز کا بروج لگائے انتہائی بیش قیمت سچے موتی کی مالا سے مزین، نیس ترین لیس کے بلاؤز اور ٹخسل کی سبک سلیر پہنے اپنے اینڈورڈین وضع کے مرصع کمرے میں چپ چاپ بیٹھی باہر کی دکانے سے

پڑتی ہوئی دنیا کا نظارہ کر رہی تھی۔ اس کا فلیٹ بیش قیمت گھوان پر لگاتی 'فرنیچر، چینی کے مغرلی مجسموں اور انگلستان کے شاعری خاندان... کی تصویروں سے سجا ہوا ہے اور خود س گل بانو کپاڑا آج سے ساٹھ برس قبل کے انگلستان کی ایک لینڈ لینڈی معلوم ہوتی ہے۔ آج کی دنیا میں وہ بہت معتمد خیر، جھلی اور بے نکی لگتی ہے۔ لیکن وہ کسی کو نہیں بتا سکتی کہ جب وہ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی تھی اس وقت معتمد خیر اور جھلی اور بے نکی نہیں لگتی تھی۔ گل بانو کے اکلوتے مرحوم بھائی کے اکلوتے لڑکے نے جسے اس نے اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا اسی کمرے میں آکر کہا تھا کہ وہ بمبار پائلٹ کی حیثیت سے مغرلی محاذ پر جا رہا ہے۔ گل بانو کو اس کی گمشدگی کی سرکاری اطلاع ملے بیس سال ہو چکے تھے، لیکن اسے اطمینان ہے کہ یہ اطلاع گمشدگی کی تھی، موت کی نہیں۔ چنانچہ وہ اس عکسی کی آواز پر کان لگائے بیٹھی رہتی ہے۔ جو ہر مرنی کو بندرگاہ سے گھولائے گی۔ گل بانو نے دل ہی دل میں ہر مرنے کے لیے بہت سی لڑکیاں بھی سوچ رکھی ہیں جن میں سے ایک سے وہ ہر مرنے کا بھیاہ کرے گی۔ لیکن بہت ممکن ہے ہر مرنے اپنے ساتھ کوئی امریکن، انگریز یا یورپین بیوی لے آئے گا جو اور بھی زیادہ خوشی کی بات ہوگی کیونکہ گل بانو کی پرورش یورپ میں ہوئی تھی اور وہ انگریز قوم کی دل و جان سے پرستار ہے۔

## طلسمی آئینے کا ایک اور زاویہ

(کرشن چندر)

اب مجھے کسی ہم قلم بزرگ، ساتھی یا دوست کی یاد میں لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ منٹو، مجاز، محمود نظامی، صدیق احمد صدیقی، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر محمد اشرف، مہندر ناتھ، ن.م. راشد اور اب کرشن چندر کیونکہ Obit writing ایک ناخوشگوار فریضہ ہے۔ گویا زندہ رہنے کے عمل اور زندگی کے معمولات کا ایک جزو ہے اور سوچئے کہ جس طرح آپ دوسروں کے متعلق لکھ رہے ہیں ایک روز اور لوگ آپ کے بارے میں بھی تقریباً یہی الفاظ، جملے، ترکیبیں، محاورے استعمال کریں گے اور یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ جینے اور مرنے کا یہ معمول پن حیرت ناک ہے۔ آپ چاہے پچیس سال زندہ رہے ہوں یا پچاس سال، ایک حکایت اور افسانے اور عظیم الشان یادگار اور بلند و بالا مجسمے، تہذیبی فیصلوں، مرمریں ایمانوں، عمارتوں، اداروں، تحقیقی کتابوں میں تبدیل ہو جائیں۔ 'کلاسیک' بن جائیں یا 'کلیشے' یا بھلا دیے جائیں۔ ایک بار اس دروازے سے دوسری طرف نکل جانے کے بعد غالباً سب بے معنی ہے۔

کرشن چندر نے اپنی زندگی ہی میں ایک Legend کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور یہ ایک مختصر زندگی تھی۔ 63 سال بہت طویل عمر نہیں۔ پل کی پل میں آدمی 63 سال کا ہو جاتا ہے۔ ایسی شہرت اور مقبولیت بہت کم ادیبوں کو ملی۔ ایک زمانے میں فوہر افسانہ نگار یہ ترنا کرتے تھے کہ کرشن چندر کی طرح نکلیں۔ اردو دنیا نے بڑے فخر اور پیار سے کرشن چندر کو اپنے عہد کا نقیب اور ترجمان مانا۔ ان کی بے انتہا تعریف ہوئی اور بعد میں اتنی ہی کڑی تنقید۔ جس وقت کرشن چندر کی دھوم مچی، میں اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ ہم لوگ بچوں کے رسائل کے علاوہ ادبی جراند کی ورق گردانی کرنے لگے تھے۔ اردو گھرانوں کے بچے فلمی ستاروں اور امریکن مغنیوں سے عقیدت نہیں رکھتے تھے اور فلمی گیتوں کے بجائے انھیں حالی اور اقبال اذہر تھے۔ ساتی، مائیکیر، ادبی دنیا، ہمالیوں، علامہ تاجور نجیب آبادی کے رسائل میں جس کا نام غالباً شاہکار تھا، پہلے جو زیادہ تر دقیقہ لوسی، سپاٹ بے جان افسانے چھپا کرتے تھے، اب ان سے بالکل مختلف قسم کی کہانیاں شائع ہو رہی تھیں۔ گویا اب تک بیشتر افسانہ نگاروں نے چاند کا روشن رخ ہی دکھلایا تھا۔ یہ نئے لوگ چاند کے تاریک حصے کی طرف نکل گئے تھے اور وہاں سے اپنی رپورٹیں بھیج رہے تھے۔ ان لوگوں میں منو، کرشن چندر کی 'دو فر لائیک لمی سڑک'، 'زندگی کے موڑ پر'، 'آن داتا'، 'پاکنی' وغیرہ ہمیں کس قدر دلآویز اور انوکھی معلوم ہوئی تھیں۔ ایک ہلکی پھلکی شعریت، حسن کاری، زندگی کا حساس اور پر غلوں مطالعہ۔ گویا لکھنے والے نے ایک فلسفی آئینہ ایسے زادے سے اٹھالیا کہ اس میں ہماری آپ کی مانوس دنیا ایک مختلف رنگ میں نظر آنے لگی جو بیک وقت اس کا حقیقی اور آئینہ میل روپ تھا۔ یہ نیا رویہ انسان دوستی اور اشتراکیت کہلا رہا تھا۔ یہ دونوں اصطلاحات اب تک گھس پٹ کر خاصی بدنام ہو چکی ہیں مگر ان کی اہمیت اور صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ترقی پسندی کے فضائل یا نقائص اور غیر ترقی پسندی (یا جو کچھ وہ ہے) کی بحثیں اور جھگڑے بعد میں شروع ہوئے۔ جس دور کا میں ذکر کر رہی ہوں اس وقت اردو ادب پر ایسی بہار آئی ہوئی تھی جس کا موازنہ اسی زمانے سے ذرا قبل کے انگلستان کی Pink Decade کی رونق اور مہما بھی سے ہی کیا جاسکتا ہے۔

کوئی مہدا اپنے آپ کو ہر انہیں سکنا چنانچہ وہ وقت بھی دوبارہ لوٹ کر نہیں آیا، ابھی نہیں سکنا تھا۔ سیاسی حالات مختلف تھے۔ اردو دو ملکوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ لکھنے والوں اور ان کے قارئین کے ذہنی رویے بدل چکے تھے لیکن کرشن چندر جو نئے انسان کے ہیر کارواں تھے، ان بدلے ہوئے حالات میں برابر لکھتے رہے۔ اس بات پر عموماً حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مغربی مصنفین جو ساری عمر لکھتے ہیں، ان کے متعلق کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ جس انسان کا Vocation لکھنا ہو وہ اس کے علاوہ اور کیا کرے گا؟ پچھلے چالیس سال اردو افسانے میں تجربات کا زمانہ رہا ہے۔ کرشن چندر نے اپنے اولین دور میں جس روانی اور بے ساختگی سے تعلق اسالیب میں اور متنوع موضوعات پر لکھا، ان کہانیوں سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ جان بوجھ کر کوئی تجربہ کر رہے ہیں مگر بہت جلد اسی طرز بیان کی تقلید کی جانے لگی۔

’ہم وحشی ہیں‘ کے افسانے اس بہاد کا High water mark ہیں جس وقت یہ کتاب چھپی تھی میں نے اس کے بعد دوبارہ نہیں پڑھا مگر مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ ان افسانوں کا انداز ایک پرجوش اور مضطرب کرنے والی ڈاکو مٹری فلم کا ساتھی جو فسادات کے اذیت ناک موضوع کے لیے اس وقت عین مناسب تھا۔ پچھلے تیس برسوں کی بیسار لوہی کے باوجود کرشن چندر نے چند بہت عمدہ کہانیاں لکھیں۔ ان کا کیسوس وسیع تھا اور وسیع تر ہوتا گیا۔ وہ زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں اسی روانی اور برجستگی اور دردمندی اور گفتگو کے ساتھ لکھ سکتے تھے جو ایک معمولی مصنف نہیں۔ اگر آپ نے کئی سو کہانیاں لکھی ہوں تو ہر کہانی شہ پارہ نہیں ہو سکتی۔ آخر آخر میں کرشن چندر طرز یہ اور مزاجیہ مضامین لکھ رہے تھے۔ اپنے بہترین افسانوں میں مرحوم نے وہ Lyrical Realism استعمال کی جو بعد میں ستیہ جیت رائے کی فلموں کی خصوصیت بنی۔ کرشن چندر پر بہت لکھا گیا ہے اور بہت لکھا جائے گا لیکن ان کے فن کے ایک متوازن اور غیر جانبدار مطالعے اور جائزے کی اب اشد ضرورت ہے۔ میں نے خود کرشن چندر کو اپنے افسانوں کا تذکرہ کرتے بہت کم پایا۔ یہ ایک مشہور اور طے شدہ بات ہے جسے سبھی دہراتے ہیں کہ نامور لوگوں سے مل کر عموماً مایوسی ہوتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے بھی متعدد نامور ہستیوں کو بددماغ یا اپنے Personality

Problem میں مبتلا پایا۔ اس صورت میں ان خواتین و حضرات سے صرف ہمدردی ہی کی جاسکتی ہے اور خداوند کریم سے دعا کہ ان کو اس بددماغی اور اس پر سنائی پر اہلیم سے نجات دے تاکہ وہ آرام کا سانس لے سکیں۔ کرشن چندر سے میں پہلی بار 1956 عیسوی میں بمبئی میں ملی تھی۔ اس وقت وہ مجھے غیر معمولی طور پر منکسر المزاج اور سیدھے سادے انسان معلوم ہوئے تھے اور بقول فنیسے میں نے بھی کہا کہ ”تو یہ ہیں کرشن چندر... کرشن چندر ایسے ہوتے ہیں۔“

انکسار کی دو اقسام ہیں۔ ایک فطری اور دوسرا وہ جو بطور ایک انداز اپنے اوپر طاری کیا جاتا ہے۔ گویا یہ کہ ہم ہیں بہت بڑے آدمی لیکن جبکہ کرب سے ملتے ہیں۔ کرشن چندر کی سادگی اور خوش خلقی فطری تھی اور انھوں نے ہنس کے اور بہادری کے ساتھ اپنے جان لیوا مرض کا مقابلہ کیا۔ گچھلی تبصر کے شدید ہارٹ ایک سے سنہلنے کے بعد کرشن جی اپنے گھر واپس آچکے تھے اور رفتہ رفتہ اپنے معمولات میں مشغول ہوتے جا رہے تھے اور سب کو یقین تھا کہ پس سیکر کی وجہ سے کرشن جی کو زندگی کی نئی Base مل گئی ہے لیکن اس مرتبہ شروع فردری میں جب میں ان کے ہاں گئی تھی تو باتوں باتوں میں کہنے لگے۔

”پتہ نہیں میں چھ مہینے اور زندہ رہتا ہوں یا سال دو سال۔ میں نے بہت سی کہانیاں لکھ کر رکھ دی ہیں جو میرے مرنے کے بعد ہی چھپیں گی۔“

دھوپ سے روشن کمرے میں صبح گیارہ بجے اپنے سانسے صوفے پر بیٹھا ایک جیتا جاگتا گفتگو مزاج شخص جب اپنے مرنے کا ذکر کرے تو وہ خاصی غیر شخصی، کتابی اور رسمی بات معلوم ہو سکتی ہے لیکن اس روز کرشن چندر کے یہ الفاظ مجھے بہت کھٹکے۔ آخر فردری میں سلمیٰ علی گڑھ سے واپس آئیں۔ میں رشید صاحب کی تعزیت کے لیے ان کے ہاں گئی۔ سلمیٰ کی چھوٹی بہن عذرا بھی 6 ماہ سے آئی ہوئی تھی۔ یہ 2 مارچ کی صبح کا ذکر ہے۔ کرشن جی اطمینان سے صوفے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چند ماہ سے وہ گھر میں پلٹے پھرنے لگے تھے۔ کئی بار انھوں نے فون کرنے گئے اور خوب ہنسا بولا کیے۔ 8 تاریخ کی شام کو اطلاع ملی کہ کرشن جی کو پھر ہسپتال لے جایا گیا ہے۔ 7 کی

شام کو ہسپتال میں راجندر سنگھ بیدی، ظ. انصاری اور شام کیشن نگم موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ حالت بالکل قابل اطمینان نہیں ہے۔ اب گیلری میں ایک بار پھر وہی منظر تھا جو چند ماہ قبل اس جگہ کا رہ چکا تھا۔ وہی بے انتہا شکر اور مضطرب سلمیٰ۔ احباب اور اعزہ کا ہجوم لیکن 7 بارش کی شام Intensive Care Unit کی وہ محبوس سی گیلری بہت زیادہ ڈپریشنک معلوم ہو رہی تھی۔ دوسرے مریضوں کی عیادت کو آئے ہوئے لوگ حُلب معمول گردہ بنائے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ برابر کے ایک وارڈ میں دروازے کے قریب ایک دیندار بوڑھا مسلمان مریض اپنے چنگ پر بیٹھے بیٹھے نماز مغرب ادا کرنے میں مصروف تھا۔ گیلری میں چند کاروباری شیئر مارکیٹ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ وہ جوتے اتار کر اطمینان سے بیچ پر آلتی پالتی مارے دلال اسٹریٹ کی گھنگو میں منہمک تھے۔ اندر کسی کیمین میں ان کا کوئی قریبی عزیز موت کے منہ میں موجود تھا۔ یہ ایک ایسا منہ تھا جس کی عکاسی کرشن چندر سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا تھا اور خود کرشن چندر اپنے کیمین میں چنگ پر آنکھیں بند کیے خاموش لیٹے تھے۔ 8 کی صبح کرشن چندر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ دو پہر کو ان کی آخری ہسپتال سے لا کر ان کے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں اسی جگہ فرش پر رکھی گئی جہاں صرف چھ دن قبل انھوں نے صوفے پر بیٹھ کر اپنے مہمانوں سے ادھر ادھر کی باتیں کی تھیں۔

طلسمی آئینے کا ایک اور زاویہ۔





## درویش مزاج بی بی

(انیس قدوائی)

دو مہینے کی بات ہے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ غالباً 1928 عیسوی کے ایک رسالے میں ایک عبارت پر نظر پڑی جو ادب لطیف یا رومانی نثر کا ایک خوب صورت نمونہ تھی۔ نیچے نام لکھا تھا 'انیس قاطرہ بنت مہبوق'۔ سو چاہا اب کی بار دلی جاؤں گی تو انیس باجی سے پوچھوں گی کہ اس زمانے کے لٹریچر فیشن کے مطابق انھوں نے ادب لطیف پر طبع آزمائی کی تو افسانے بھی ضرور لکھے ہوں گے مگر ابھی جب دلی آئی تو اس کے تیسرے دن انیس باجی ہسپتال میں داخل ہوئیں اور 16 جولائی کو انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ میں بچپن میں اپنی والدہ سے ان کو تبادلہ خیالات کرتے دیکھا کرتی تھی۔ یہ دہرہ دون کی بات ہے اور بڑے ہو کر خود ان سے دنیا کے ہر موضوع پر باتیں کرنے میں کبھی نہ تھکی۔ وہ یقیناً ایک بہت ہی غیر معمولی خاتون تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے شاہ ولی اللہ کی ایک کتاب ان کو پڑھنے کو دی۔ بے حد خوش ہوئیں۔ راتوں رات کتاب پڑھ ڈالی اور صبح کہنے لگیں۔

”بھئی یہ تو بے حد ٹھیل ہے مگر اس کو پڑھ کر غور و فکر کے نئے نئے  
دروازے کھلتے ہیں۔“

میں ان سے مصر رہی تھی کہ اپنی سوانح حیات لکھیں۔ وہ اس دور کی اہم سماجی اور  
سیاسی دستاویز ثابت ہوگی۔ خود انیس باجی نے ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کے متعلق اپنے مضمون  
میں لکھا تھا۔

”وہ اپنا دور تھا جب قوم پرستی کی نکال میں انسان گڑھے  
جاتے تھے۔ جب ہماری تعلیم کا ہیں اہل علم و دانش سے بھر پور تھیں۔ جب  
سیاسی افق پر انسان دوستی اور درویشی کی فضا چھائی ہوئی تھی۔“

مصنفہ خود اسی دور کی ایک منور شخصیت تھیں۔ وہ اپنی سوانح حیات میں 1928 عیسوی تک  
پہنچ گئی تھیں۔ کتاب نامکمل رہ گئی مگر 1926 عیسوی تک کا زمانہ بھی جدید ہندوستان کی تاریخ میں  
بے حد اہم ہے اور اس سوسائٹی کو شائع ہونا چاہیے۔

میں نے شروع میں ادب لطیف کا ذکر کیا تھا۔ ادبی روایت تو ادبی ترقی پسند تحریک سے  
قلم ہی متروک ہوئی مگر انیس فاطمہ قدوائی کو خصوصیت کے ساتھ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہونے  
کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ شروع ہی سے تعمیر پسند تھیں۔ سماجی شعور کی بات کرنے والوں نے  
ادب کو زمانہ اور مردانہ خانوں میں تقسیم کر کے بہت سی باصلاحیت قلم کاروں کے ساتھ بے انصافی  
کی۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ہم عصر رشیدۃ النساء بیگم نے بہار جیسے قد امت پرست علاقے میں جنم لے کر  
1869 عیسوی میں ایک اصلاحی مادل تصنیف کیا تھا مگر پروفیسر وقار عظیم نے خواتین کی ادبی  
تخلیقات کو فنی لحاظ سے ادنیٰ درجے کا کہہ کر قصہ کوتاہ کر دیا۔ یہ وہاں کسی توصیف یا ادبی مرتبے کی  
طلب کار نہ تھیں محض غلوں اور لگن کے ساتھ لکھنے میں مصروف تھیں۔ ہماری موجودہ سماجی اور تعلیمی  
ترقی کے منظر نامے کی تشکیل میں ان اولین خواتین کا کتنا بڑا ردل ہے اس کا اعتراف آج تک  
نہیں کیا گیا۔

بیگم انیس قدوائی نے بھی اسی اصلاحی دور میں زمانہ رسالوں میں مضامین لکھنے شروع  
کیے۔ آزادی کے بعد دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ خود انیس باجی کو آگ کا پتھر لپٹا پڑا۔ اس کی داستان

انہوں نے نہایت معروضی اور سلیجے ہوئے انداز سے اپنی دستاویزی اہمیت کی تصنیف 'آزادی کی چھاؤں' میں 'قلم بند کی'۔ 'نظر خوش گزرنے' کے نام سے مضامین کا مجموعہ 1978 عیسوی میں شائع ہوا جن کے دیکھنے کو... اپریل 1980 عیسوی میں انشائیوں کے مجموعوں پر مفصل مضامین لکھے گئے ہیں لیکن انیس قدوائی، ان کے اسٹائل اور ان کی ان دو کتابوں کا ہمارے نقادوں نے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ گروہ بند ادبی تنقید نے جو صورت حال پیدا کی ہے اس کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب تک کوئی لکھنے والا اپنی شہرت کا انتظام نہ کر دے اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

انیس باجی نے کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر وہ اردو تہذیب اور ادب کے گہرا جانی تھے۔ ان کی معلومات وسیع اور اردو فارسی ادب، تصوف، اہلیات، تاریخ، عالمی سیاست اور سماجی مسائل پر ان کی بصیرت قویٰ، طنز و مزاح ان کا اصل میدان تھا۔ ان کے والد ولایت علی، بیوقوف کے جو مزاحیہ کالم کامریڈ اور نیو ایر اچھا کرتے تھے، بے حد مقبول تھے۔ حس ظرافت انیس باجی نے اپنے والد سے حاصل کی تھی۔

مغرب اپنے زمانے میں کہا جاتا ہے کہ عموماً خواتین کی تحریروں میں مزاح کی چاشنی کم ہوتی ہے۔ جب وہ لکھتے بیٹھتی ہیں تو جذبات اور حیات کی، انسانی رشتوں کی نزاکتوں کی عکاسی اور جزویات نگاری خوب خوب کرتی ہیں مگر چونکہ صدیوں تک ان کے اوپر سماجی پابندیاں عائد رہیں، وہ مکمل کر ہنسنا نہیں جانتیں اور لکھتے وقت بے حد سنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ یہ بات مغرب کی ادیب خواتین کے لیے کبھی گئی تو ہمارے یہاں کا کیا حال ہوگا۔ جہاں سماجی پابندیاں مغرب سے کئی گنا زیادہ تھیں اور ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے ادب میں لے دے کر سلمیٰ صدیقی اور شجیہ فرحت کا نام لیا جاتا ہے اور یہ صورت حال غور طلب ہے۔ خود اردو زبان کی ساخت ایسی ہے کہ مہذب اور لطیف طنز و مزاح اور پھلکڑ پن کے درمیان بال برابر کا فرق رہ جاتا ہے اور سوائے چند ایک کے ہمارے چند مشہور ظرافت نگار آسانی سے ابتر ال پر آتے ہیں۔ خواتین اپنی فطری تہذیب اور شائستگی کی وجہ سے اس میدان میں مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یہاں عصمت چٹائی جو افسانہ نگار ہیں، ان کے اسٹائل کا تذکرہ انشائیوں سے متعلق اس مضمون میں نہیں کیا جاسکتا۔

’نظر خوش گزرنے کے ایک مضمون کا عنوان ’کیا مولانا آزاد کبھی بچہ تھے؟‘ اس میں انہیں قدوائی لکھتی ہیں:

”بچارے مولانا! 50 سال پہلے کا مقدس گھرانہ جہاں انھوں نے جنم لیا تھا، نظروں کے سامنے آگیا۔ وہ بچارے اور کیا کھیلے۔ قدم قدم پر تو اس گھرانے میں اللہ اور رسول کی مہر تھی۔ بیرون اور مشائخ کا خاندان۔ ہر سمت سے قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں آتی ہوں گی۔ مریدوں اور عقیدت مندوں کے جنگیٹے تھے۔ بچہ ذرا بچہ اٹھاتا بھی ہوگا تو مرید اللہ آمین کر کے دوڑ پڑتے ہوں گے۔“

’فسانہ آزاد کے متعلق لکھتی ہیں:

”مجھ میں نہیں آتا سرشار نے ایسے طوفانی ہیرو کے لیے اتنی تشلیق ہیروئن کیوں منتخب کی۔ اتنی پٹکی، بنجیدہ اور بھیجی سی ہستی۔ دراصل ہیروئن کا کردار پوری طرح بھانڈا پائے کیونکہ ہندو مسلمان دونوں شریف زادیاں پردہ نشین اور حیا دار ہوا کرتی تھیں۔ ان کے کیریکٹر میں شوخ رنگ بھرنا سرشار کی قدامت پسندی نے گوارا نہ کیا۔“

مزید:

”سرشار کی وطن پرستی بھی اپنی مثال نہیں رکھتی۔ بھئی ہے تو لکھنؤ، قسطنطنیہ ہے تو لکھنؤ۔ میدان جنگ ہے تو اس پر بھی لکھنؤ کا رنگ چھایا ہوا ہے اور دریائے ڈیوب کے اس پار بھی لکھنؤ آباد ہے۔“

ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

”ایسا لگتا ہے سرشار کی بھی فاؤسٹ کی طرح دور دور میں تھیں اور ان میں ہر گھڑی جوتی ہیزاں ہوتی رہتی تھی۔ اسی کشش کی بدولت وہ خود زندگی بھر تو بہ تو بہ اور پے در پے تو بہ لگتی کرتے رہے اور اپنے ہیرو میاں آزاد خانہ بہادری سے کھڑے رہے۔“

امیر خسرو، غالب، مومن، نظیر، سرشار، فشی پریم چند، مرزا سواہرپرائس قدوائی کے مضامین ان کی اعلیٰ ناقدانہ بصیرت کے آئینہ دار ہیں اور ان کے گفتے اور دواں اشائیں نے ان کو بھاری

بھر کم تنقیدی مضامین کے بجائے ہلکا پھلکا، نہایت مزاحیہ اور دلچسپ انتظامیہ بنا دیا ہے۔ اقبال کی پرستار تھیں لیکن عورت کے لیے اقبال کے رویے کے متعلق فرماتی ہیں:

”انھوں نے لفظی مباحثے بھی کیے ہیں، شکایتیں اور مناجاتیں بھی کی ہیں، سیاسی فارمولے بھی پیش کیے ہیں، بین الاقوامی مسائل پر بھی بحث کی لیکن ہر جگہ مرد ہی سے مخاطب رہے ہیں۔ غضب ہے کسی کی گود میں ملی دیکھ کر وہ ملی کی مالکہ سے نہیں خود ملی سے مخاطب ہو جاتے ہیں جیسے عورت اور ملی میں کوئی فرق نہیں۔ عورت سامنے آئی نہیں اور انھوں نے صدی پرانی عینک چڑھالی۔ انداز مخاطب میں کسی جگہ بھی ان سے اس معاملے میں بھول چوک نہیں ہوئی۔ انسانوں میں مرد اور عورت دونوں ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مرد تو زمانے کو اپنے ساتھ لے چلے اور عورت ان دونوں کے ساتھ کھلتی چلی آئے۔“

انیس قدوائی کہیں بھی سلیف کا شمس (شعوری کوشش) میں جتنا نہیں ہیں۔ یعنی کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس ارادے سے بیٹھ کر لکھ رہی ہیں کہ اب مجھے اس موضوع پر ایک طرزیہ یا نظریہ مندرجہ لکھنا ہے۔ ان کے یہاں آمدنی آمد ہے اور یہ ہی بے ساختگی ان کے خاکوں میں بھی موجود ہے۔ ایڈیٹر مل نوٹ، سوانحی خاکے اور ادبی مضمون سبھی کسی ایک شخصیت کے بارے میں لکھے جاتے ہیں۔ ان کا انداز صحافتی بھی ہو سکتا ہے اور ادبی بھی۔ اپنے معاصرین اور احباب کے متعلق بہت سے مشہور ادیبوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ شوکت قانوی کے ’شیش محل‘ اور رشید احمد صدیقی کے ’سج ہائے گرانمایہ‘ سے لے کر عمر طفیل کے ’آپ جناب‘ اور ’صاحب‘ تک خاکوں کے بہت سے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انیس قدوائی بھی ایک نہایت کامیاب خاکہ نگار تھیں جن کی دردمندی اور انسان دوستی ان کے ان مضامین سے ظاہر ہوتی ہے جو دوسرے مجموعے ’اب جن کے دیکھنے کو...‘ میں شامل ہیں۔ ولایت علی، بیوق، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، شفیق الرحمن قدوائی، چودھری محمد علی رودلوی، مرزا ابوالفضل، ڈاکٹر کپلو، مردولا سارا بھائی، جواہر لال نہرو، قدسیہ زیدی، حافظ جن، ڈاکٹر سید عابد حسین، ان میں سے متعدد ہستیوں نے ایک گھر سے

سیاسی اور تہذیبی دور کو مرتب کیا تھا۔ انیس قدوائی خود اس تاریخ ساز عہد میں شامل تھیں۔ جس دور مندی اور دل سوزی سے انھوں نے یہ مرقع نگاری کی ہے اس کی ایک جھلک سیف الدین چلو کے متعلق مضمون میں نظر آتی ہے:

”دسمبر 1947 عیسوی میں چلی پارکھانے کی میز پر ملاقات ہوئی۔ رفیع صاحب کے پاس والی کرسی پر بوڑھا سیاست دان خاموش بیٹھا تھا۔ رفیع صاحب جب کوئی بات کہتے تو ایک کان پر ہاتھ رکھ کر اور دوسرا جھکا کر وہ سنتے اور جواب دینے کی کوشش کرتے۔ جلیان والا باغ کا ہیر و مہمان تھا۔ مرد لا سارا بھائی ان کی جان بچا کر ان کو لاہور سے لائی تھیں۔“

اس مضمون کا محض ایک جملہ ”جلیان والا باغی کا ہیر و مہمان تھا“ ہندوستانی سیاست کے ایسے کی مختصر ترین تفسیر ہے۔ آخر میں:

”شاید کوئی اس راز سے پردہ اٹھا دے کہ وہ کیوں پھر اس سرزمین پر (یعنی امرتسر میں) قدم نہ رکھ سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود طے کر لیا تھا کہ ہنسی کو بھلا دیں گے۔ شاید چوٹ بہت گہری تھی۔ زخم کا منہ بند نہ ہو مگر زبان بند ہو گئی۔“

”اولا دکیو نزم کی طرف چلی گئی۔ آپا کی مذہبیت ابھر آئی۔ ڈاکٹر صاحب بالکل اغڑ مارا ڈنڈ ہو گئے۔ جب بے گانہ وشی تھی۔ زندگی کی کشتی بے چوار کے بہرہ رخی تھی اور ڈاکٹر صاحب لینے ہوئے اطمینان سے چڑھ رہے تھے۔“

”نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے بہترے لوگوں کا یہ ہی حال ہوا۔ کسی کو فہم و غصے نے پاگل کر دیا، کوئی قنوطیت کے مارے دم بخود ہو گیا، کسی نے آستان حکومت کی جیس سائی شروع کر دی اور کوئی صرف داغ ہائے سین کا شمار کرتا رہ گیا۔ تھوڑے ہی سے تھے جو سینہ پر رہ سکے۔“

آخر کو ہارے ہوئے لوگ تھے ناہنڈل سے بھی فیروں سے بھی۔“

انیس قدوائی نے کلیشے کہیں استعمال نہیں کیے۔ ان کے طرز بیان کی بے ساختگی اور

رچاؤ، نری اور بٹاشت، خود ان کی اپنی شخصیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ انیس باجی نے اپنی عزیز ترین دوست مردولا سارا بھائی کی وفات پر لکھا تھا:

”یاروں کے قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔“

اور یہ کہ بقول مولانا روم:

”روز ہی کوئی نہ کوئی شاعر مہطل کر دی جاتی ہے۔“

لیکن انیس باجی خود ایک ایسی درویش مزاج بی بی تھیں جن کا دنیاوی اثاثہ ان کی کتابیں، کاغذات اور وہ بید کی نوکری تھی جس میں وہ مکہ معظمہ سے احرام اور خاک پاک کی پڑیا اپنے آخری سفر کے لیے لے کر آتی تھیں اور وہ نوکری ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی کہ نہ جانے کس گھڑی بلاوا آجائے۔ وہ ہمیشہ مسکرانے والی پامخت خاتون ابوذر غفاری اور ربیعہ بھری جن کے محبوب کردار تھے، ان کی یاد ایک قبرستان کے بجائے ان کی جیسی باہت مجاہدانہ زندگی گزارنے کا پیغام ہے۔ ایسا پیغام جس کی سب سے زیادہ اس وقت اس ملک اور معاشرے کو ضرورت ہے۔

(27 جولائی 1982ء، دہلی)





## ایک زندہ دل ہستی

(سلطانہ جعفری)

**16 جولائی 2004 عیسوی (جمعہ) کی شام ممبئی میں علی سردار جعفری کی بیگم سلطانہ جعفری کا انتقال ہو گیا۔ ان کا تعلق علی گڑھ کی نامور خواجہ فیلی سے تھا۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا۔ وہ سیاسی اور سماجی کارکن بھی رہیں۔ ان کی عصمت چٹائی سے رشتہ داری کے علاوہ گہری دوستی بھی تھی۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک میں بھی حصہ لیا اور علی سردار جعفری سے شادی کے بعد اس تحریک کی ایک اہم کارکن بنیں۔ وہ طویل وقفے تک ممبئی کی فریب بستیوں میں کام کرتی رہیں۔ اس لحاظ سے سردار جعفری کی وہ صحیح معنوں میں کامریڈ رہیں۔ وہ اصول کی بہت پابند تھیں۔ وہ خود تو ادیب نہیں تھیں لیکن شعر و شاعری کا ذوق رکھتی تھیں۔ وہ ایک بھلی خاتون تھیں۔ سلطانہ آپا بہت ہی پیاری اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ وہ ہندوستانی خواتین کی اس نسل کی ایک فرد تھیں جنہوں نے بہت سی نئی راہیں ڈھونڈ نکالیں اور نئے چراغ جلائے۔ وہ ممبئی کی سودا بیچنے والی گھانٹوں سے لٹ پاتھ پر بیٹھ کر مراٹھی زبان میں باتیں کرتی تھیں اور اونچی سوسائٹی کی کانفرنس**

میں بیرون ملک سے آئے ہوئے ادیبوں سے بحث بھی کرتی تھیں۔ ایسی خوبیوں کی مالک محوورتیں اب ہمیں آس پاس میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ علی سردار جعفری کے شعر کا ایک مصرع ایک زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا:

ہر عاشق ہے سردار یہاں ہر معشوقہ سلطانہ ہے

سردار کے جانے کے بعد وہ چار سال زندہ رہیں اور جب بھی سردار کی بات چلتی وہ رو پڑتیں۔ اب سلطانہ آپا بھی ہمیشہ کے لیے ہم سب کے سچ سے رخصت ہو گئیں۔

علی سردار جعفری اور سلطانہ جعفری اب محض دو مشہور شخصیتوں کے نام ہی نہیں رہے بلکہ دو علامتیں یعنی Symbol بن چکے ہیں۔ مسلسل جدوجہد، اصول پرستی Idealism اور انسان دوستی ان دونوں کے زندگی کے درخشاں آدرش تھے جنہیں حاصل کرنے میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔

سلطانہ آپا ایک نڈر، بہادر اور جفاکش خاتون تھیں۔ وسیع النظری، مہمان نوازی اور سبے پایاں خلوص کے اوصاف ان کی غطرت میں شامل تھے۔ ان کے گھر کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اور ان کے دوست و احباب بلا کھلے اندر جا کر سلطانہ آپا کی مہمان نوازی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ وہ ایک غیر معمولی طور پر متوازن شخصیت کی مالک تھیں اور انہوں نے اشتیاق کے فلسفے کو اس حد تک قبول کیا تھا کہ انہوں نے کبھی بھولے سے بھی کسی سے یہ ذکر نہیں کیا کہ ان کی نانی بہادر شاہ ظفر کی ملکہ زینت محل کی حقیقی چھوٹی بہن تھیں۔ گو سلطانہ آپا کی شخصیت کا شاہانہ وقار ان کے اس پس منظر کی نمائندگی کرتا تھا۔ ایسے گونا گوں اوصاف کی مالک خاتون کو قاعدے سے ایک نہایت پور قسم کی نینا ہونا چاہیے تھا لیکن ان کے حسن نظر انت یعنی Sense of Humour نے ان کو ہمیشہ ایک ہنستا اور زندہ دل ہستی بنائے رکھا۔ جب سردار نہایت خس قسم کے لوگوں سے بھی خندہ پیشانی سے ملنے تو وہ چپکے سے کہتیں سردار میں یوروں کو جھیلنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔

یہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے سچے رفیق یعنی صحیح معنوں میں کامریڈ تھے۔ ایک اور چیز جو قابل ذکر ہے میں نے سلطانہ آپا کو کبھی تھلائے یا ہرافروختہ ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہر Situation میں نہایت بردبار اور متین رہتی تھیں۔ اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب سردار کے متعلق

کسی رسالے کا خصوصی نمبر شائع ہونے والا تھا تو سلطانہ آپا نے مجھے کئی بار فون پہ کہا کہ میں اس کے لیے کچھ لکھوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ جب سردار کا انتقال ہوا میں لندن گئی ہوئی تھی اور وہیں اردو مرکز میں ان کے لیے تعزیتی جلسہ منعقد ہوا اور میں نے اس میں پڑھنے کے لیے ایک مضمون لکھا بعنوان 'سرت کا جواں ملاح'۔ اس مضمون کو میں نے اس طرح شروع کیا تھا کہ جب میں اسکول میں پڑھتی تھی، سردار کی ایک نظم شائع ہوئی تھی:

یہ کس نے فون پہ دی سال نو کی تہنیت مجھ کو  
تمنا رقص کرتی ہے تخیل گنگنا تا ہے  
سرت کے جواں ملاح کشتی لے کے نکلے ہیں  
غموں کے ناخداؤں کا سفینہ ڈگمگاتا ہے

اور اس کے بعد میں اور میری رشتہ دار لڑکیاں اور لڑکے ہر سال نو کی صبح ایک دوسرے کو فون کر کے بات ہی ان اشعار سے شروع کرتے تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس جلسے کے بعد میں نے وہ مضمون وہیں کہیں رکھ دیا اور ہال سے باہر آ گئی اور اس کے بعد وہ مضمون کھو گیا۔ اب نہ سردار ہے، نہ سلطانہ آپا۔ لیکن ان کی شخصیت اور ان کے اوصاف فراموش نہیں کیے جائیں گے۔

---

(مکمل مدبرگ، ہر تہہ مجیب احمد خاں، دہلی، 2008ء)



## نئے ہندوستان کی اسطوری ہستی

(عطیہ حبیب اللہ)

چند سال قبل اردو اکیڈمی یو پی کے ایک سیدنا میں شرکت کے لیے لکھنؤ گئی تب پہلی بار اکیڈمی کی عمارت دیکھی جو رانی صاحبہ کی ملکیت تھی۔ انھارویں صدی جاوین طرز تعمیر کی یہ عمارت کافی خستہ حالت میں ہے اور شاید روشن الدولہ کی پچھری کی طرح انتہائی بے حسی کے ساتھ اسے بھی گرا دیا جائے۔ اکیڈمی کی بلڈنگ کی اصل مالکہ تو اب لندن میں رہتی ہیں بوجہ انقلاب زمانہ، جس کا تذکرہ میں پچھلی کسی قسط میں کر چکی ہوں۔

عجب انقلاب زمانہ ہے

مرا مختصر سا فسانہ ہے

مگر یہ فسانہ مختصر نہیں ہے۔ زمانے کی تبدیلیوں اور انسانوں کے ذاتی حالات کے نشیب و فراز کا ایک طومار ہے جو کھلتا چلا جاتا ہے۔ مہدمقلہ کے وہ طومار توں کھولے گئے جانے کیا کیا المناک اعترافات ہوتے۔ لہذا بہتر ہے کہ وہ طومار بندھے ہی رہیں۔

ایڈی کی بلڈنگ کے کمروں میں کتابوں کی الماریاں رکھی تھیں۔ ریڈنگ روم سنسان پڑا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں چند افراد کیرم کھیلنے میں مصروف تھے۔ یہ سارا ماحول مجھے کچھ سرشار کے لکھنؤ والا معلوم ہوا۔ جس طرح وقت یہاں تھا ہوا تھا۔ اردو بھی ایک آہستہ خرام پاکی میں پردہ نشین ہو چکی تھی۔ پہلے روز جب میں وہاں گئی سورج ڈوبنے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی۔

برآمدے کی نیم فکٹہ پیل پایوں پر سے دھوپ سرکتی جا رہی تھی تب مجھے اچانک عطیہ حبیب اللہ کے ناول "Sunlight on a Broken Column" کا خیال آیا جو چند سال قبل لندن سے چھپا تھا اور اسی ماحول اور اس کی موجودہ اداسی کے بارے میں تھا۔ ایک بات آج تک مجھ میں نہیں آئی، ہمارے بزرگوں نے جو کچھ کیا سو کیا۔ شاید وہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا۔

عطیہ کی ساس یعنی بیگم حبیب اللہ اماں کی بہت پرانی سہیلی تھیں۔ 1947 عیسوی میں ان کی بہو عطیہ نے لندن ہجرت کی۔ ان کی بیٹی ترینین اپنے شوہر فریدی کے ساتھ کراچی گئیں لیکن بیگم حبیب اللہ ایک اور لیڈر خاتون بیگم اعجاز رسول کی مانند لکھنؤ ہی میں رہیں۔ پاکستان جانے یا نہ جانے کا فیصلہ عموماً لوگوں کے ذاتی حالات پر مبنی تھا۔ بہت سے کنبے زمین داری کے خاتمے کے بعد روانہ ہوئے۔ متحدہ حضرات سرکاری نوکریوں سے ریٹائر ہونے کے خطرہ رہے لیکن اپنے لڑکوں کو پاکستان بھیج دیا۔ یہی منظر میں نے اس وقت کے شرقی پاکستان میں دیکھا جہاں ہندو گھرانوں کے لوجوان تلاش معاش اور بہتر مستقبل کی امید میں کلکتہ چلے گئے تھے اور ان کے بزرگ اپنے اپنے قدیم مکانات میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ سید ولی اللہ مرحوم شرقی پاکستان کے ناولٹسٹ نے مجھے بتلایا تھا کہ ہر ہندو گھرانے کے مکان کے سامنے ایک تلسی کا پودا چوکور گیلے میں موجود ہوتا تھا اور روزانہ شام کو گھر کی بہو اس کے سامنے چراغ جلاتی تھی۔ کیونکہ تلسی کے پودے کو کشمی کا اوتار مانا جاتا تھا۔ 1947 عیسوی کے بعد ان گھرانوں میں تلسی کے نیچے چراغ روشن کرنے ترک کر دیے گئے کیونکہ ان کے ذریعہ ہی اقلیتی فرقے کی نشاندہی یا آسانی ہو

جاتی تھی۔ یہ واقعہ بذات خود بہت المناک تھا گو اس کی طرف بہت کم لوگوں کا دھیان گیا۔ سیاسی انقلابات کی وجہ سے کنبوں کی ہجرت کے المیہ کو ایک مغربی مصور نے اپنی ایک مشہور پینٹنگ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ چند افراد ایک کشتی میں سوار انگلستان کے ساحل سے دور جا رہے ہیں اور ایک عورت پیچھے مڑ کر انتہائی یاس کے ساتھ وطن کی آخری جھلک دیکھ رہی ہے۔ لیکن اگر یہ ہجرتیں نہ ہوتیں تو انسانی تمدن آگے نہ بڑھتا۔ تاریخ کی اپنی جبریت اور اپنی منطق ہے۔ فرسٹ جزییشن تارکین وطن نے اپنا ادب بھی تخلیق کیا اس کی دلدوز مثال امریکن مصنف ولیم سیرواں کے افسانے ہیں جو اس نے کیلیفورنیا میں آباد ہلستانی عیسائیوں کے متعلق لکھے۔ رفتہ رفتہ اردو میں بھی ایک Emigre لٹریچر پیدا ہو رہا ہے۔ عطیہ حبیب اللہ مرحومہ کا ناول بھی Emigre ادب کا ایک قابل قدر حصہ ہے اور عطیہ کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ Sunlight on a Broken Column کا اردو ترجمہ شائع کیا جائے۔

1947 عیسوی سے لے کر آج تک روزانہ ڈوبتے سورج کی روشنی نے اسی قیصر باغ اور اسی لکھنؤ میں کیسے کیسے گہرا جڑتے دیکھے۔ اردو اکیڈمی کے ان پبل پاپوں میں تو بڑی استقامت پائی گئی۔ قیصر باغ کے مکانوں کی سپاٹ پھتوں اور گول ستونوں والے برآمدوں پر سے دھوپ روزانہ بے نیازی کے ساتھ چڑھتی اترتی رہتی ہے۔ اسی قیصر باغ کے مشہور گول چوراہے پر افغانستان سینما اب بھی موجود ہے جس کا نام اب بدل دیا گیا ہے۔ 1947 عیسوی سے پہلے گھوڑا گاڑی جب گھمسیاری منڈی کی طرف مڑتی جہاں ہمارا اسکول تھا۔ اور جب چوراہے پر پہنچتی تو افغانستان سینما کے بڑے بڑے اشتہاروں پر سرخ نیلے رنگ سے وہ اعداد لکھے نظر آتے 'سنت کسی داس' 3rd Week, 4th Week, 5th Week وغیرہ۔ پھر نکار کے اعداد دکھائی دیے اس کے نمبر بڑھتے چلے گئے۔ شوقین لوگ سینما کے Weeks کے ذریعہ اپنا وقت ٹاپتے تھے۔ فی ایس ایلیٹ قہوہ کے چمچوں کے ذریعہ۔ آپ کا پیانا نہ جو بھی ہو عمر گزراں کے اعداد میں اضافہ روکا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ جب میری گھوڑا گاڑی جس پر میں سامنے والی سیٹ پر فراک میں لمبوس بڑا سا تانپورہ سنبھالے بیٹھی ہوتی۔ یہ جگہ خود میں نے اپنے لیے چن لی تھی تاکہ بڑی لڑکیاں آرام سے اپنی

جگہوں پر بیٹھ سکیں۔ میں نے ”آگ کا دریا“ میں یہ منظر ناول کی ایک راوی طلعت کے حوالے کر دیا۔ جو کنور یہ پڑی تھی تانپورہ سنبھالے موتی محل برج پر سے روز گزرتی ہے اور بیرس کالج جاتی ہے۔ 1998 عیسوی کے گیان پیٹھ ایوارڈ کے لیے حسب سابق میں ججوں کی کمیٹی میں شامل تھی۔ معمول کے مطابق فکشن کے بے شمار ہندی ناول گیان پیٹھ والوں نے مجھے پڑھنے کے لیے بھیجے جو اس انعام کی خاطر آئے تھے۔ اس میں ایک ہندی ناول کا پہلا صفحہ دیکھ کر میں چرکی۔ ایک کنور یہ پڑا ایک لڑکی تانپورہ سنبھالے بیٹھی ہے۔ یہ گویا اس ناول کا سوجھ بوجھ تھا اس ہندی ناول کی ہر دن روزانہ موتی محل برج کراس کر کے اپنی کنور یہ پر مع اپنے تانپورہ کے میوزک سینکے جاتی ہے۔ ساری منظر کشی وہی تھی جو میں نے ”آگ کا دریا“ میں طلعت (یعنی میں خود) کے لیے کی تھی۔ ہندی کا یہ ناول شاید 1998 عیسوی میں شائع ہوا۔

چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک کتنے ہزاروں Weeks الفینشن سینما کے پوسٹروں پر سے گزرتے چلے گئے ہیں۔ وقت کا یہ نہ سینما کا پوسٹر بھی تو ہو سکتا ہے۔ ابھی لندن سے خبر ملی کہ عطیہ حبیب اللہ بھی اپنے سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔ اس اطلاع کا محض ایک عنوان کافی ہے Death of a Beautiful Women عطیہ کے لیے ایک زمانے میں انگریز لوگ کہا کرتے تھے اگر تم ہندوستان جاؤ اور دو چیزیں نہ دیکھو، تاج محل اور عطیہ حبیب اللہ تو تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ عطیہ نے ہندوستان کی ایک ”اسطوری“ ہستی تھیں۔ گدی یا ضلع بارہ بکس کے قدوائی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور غالباً 1934 عیسوی میں انھوں نے از ایلا تھویرن کالج سے بی اے کیا تھا اور جب ہی ان کی شادی سنی حبیب اللہ سے ہوئی تھی۔ میں ان کو اپنے بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی۔ جب میں ڈراپائی ہوئی تو لکھنؤ ریڈیو کے ڈراموں میں ان کے ساتھ حصہ لیا۔ 1947 عیسوی میں ہندوستان کا نقشہ بدلا۔ لکھنؤ سے اتنا بڑا انخلا نہیں ہوا جو دہلی کا مقدر تھا، لیکن متعدد خاندانوں نے ترک وطن کیا۔ کچھ پاکستان چلے گئے اور کچھ لندن۔ 1947 ہی میں عطیہ بھی لندن چلی گئیں۔ جہاز پر لکھنؤ ریڈیو کی مشہور مضحیہ گوہر سلطان اور ان کے شو ہر حفیظ جاوید اور آل انڈیا ریڈیو کے (سنہری آواز والے) آل حسن بھی ان کے ہم سفر تھے۔ ان ہی دنوں رفیع احمد



قدوائی کے کزن انور جمال قدوائی مع اپنی بیگم شکستہ برطانیہ گئے جہاں ان کا تقرر بطور پی آر او  
 انڈیا ہاؤس میں ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر کرشنا سین تھے۔ یہ پہلا انگریز زمانہ  
 تھا۔ کرشنا سین اور اقبال سنگھ جیسے لوگوں نے لندن میں رہ کر ساری عمر برطانیہ کے خلاف جدوجہد  
 کی تھی۔ اب کرشنا سین انڈین ہائی کمشنر تھے اور ہندوستانی دانشوروں کا ایک گروہ اپنے ساتھ رکھتے  
 تھے۔ ہندوستانی موسیقاروں اور رقصاؤں نے لندن آنا شروع کیا تھا۔ انڈیا کی کلچرل پبلیٹی  
 زوروں میں کی جا رہی تھی۔ ایک خاص قسم کا فخر اور احساس برتری ہندوستانیوں میں پیدا ہو گیا تھا  
 کہ وہ پنڈت نہرو کے ویس سے آئے ہیں اور ان کا وطن عالمی سیاست میں ایک اہم ترقی پسند رول  
 ادا کر رہا ہے۔ برٹش لیٹ دنگ عرصہ دراز سے ہندوستانی قوم پرستوں کا محور ہوا تھا۔ لندن کے  
 بلومزبری گروپ میں ڈاکٹر ملک راج آنند بھی شامل تھے۔ بی بی سی کے اردو سیکشن میں علیہ نے  
 1948 سے براڈکاسٹ کرنا شروع کیا۔ اس سیکشن کے برطانوی سربراہ مسٹر ڈین اردو سے واقف  
 تھے کیونکہ وہ پنجاب پریس میں رہ چکے تھے۔ اس اردو سیکشن کی سرگزشت بھی کی کو قلم بند کرنا چاہیے  
 کیونکہ یہ اردو کے اہل قلم کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ فرنگی محل لکھنؤ والے صدیق احمد صدیقی جو  
 جگت چچا تھے، اور کہلاتے ہی چچا صدیقی تھے۔ یاد رہے اس جو خانوادہ میر انیس سے تعلق رکھتے تھے  
 اور محمد چوہان جنھوں نے ایک عیسائی خاتون سے شادی کرنے کے بعد کرچین مذہب اختیار کر لیا  
 تھا یہ لندن اس ارادے سے آئے تھے کہ شہزادی الزبتھ کو اردو پڑھائیں گے جو ممکن نہ ہوا۔ البتہ بی  
 بی سی میں ملازمت مل گئی۔ چوہان صاحب ہمیشہ جناح کیپ پہنتے تھے اور ایک مرتبہ انھوں نے  
 مجھے بتایا کہ تبدیلی مذہب سے قبل درود و وظائف بھی بہت کرتے تھے۔ چوہان صاحب کے لیے  
 اعجاز بنا لوی نے ارشاد کیا تھا:

کہا لندن چلا جاؤں  
 کہا لندن چلے جاؤ  
 کہا چوہان کا ڈر ہے  
 کہا چوہان تو ہوگا

(اسی قبیل کا پہلا شعر میں نے اپنے ایک ماسوں سے لکھنؤ میں سنا تھا۔)

کہا برا چلا جاؤں

کہا برا چلے جاؤ

کہا جاپان کا ڈر ہے

کہا جاپان تو ہوگا

میرے ایک رشتہ دار تقی احمد سید جو سر سید احمد خاں پر مہر سرج کرنے لندن آئے تھے، وہ بھی اردو کے غزلے میں شامل ہو گئے۔ اب یہاں ایک مختصر سا قصہ۔ اپنے متعلق... اردو سیکشن کے انگریز سربراہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مقامی براڈ کاسٹر کی حیثیت سے ہر ہفتہ مجھے پروگرام دیں گے جس میں غوروں کا پروگرام بھی شامل تھا۔ اسے عطیہ کنڈکٹ کرتی تھیں۔ اب اسی پروگرام کو ہمارے پڑوسی ملک کے ایک سینئر ڈپلومیٹ کی بیوی بھی گاہے بگاہے محض شوقیہ ترتیب دیتی تھیں۔ ان خاتون کے خاندان سے راقم السطور کے والدین کی اتنی قدیم دوستی تھی کہ جب وہ ڈپلومیٹ پیدا ہوئے تھے تو ان کا نام میرے والد کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ان کی بیگم بھی اماں کی بڑی عقیدت مند بھانجی تھیں۔ لیکن اب جو یہاں پہنچی اور بی بی سی میں پروگرام کرنے شروع کیے تو لوکل ملازمت کا وعدہ پورا نہ کیا گیا۔ میں اس طرح ہر پروگرام الگ الگ کنٹریکٹ پر کرتی رہی۔ جب معلوم ہوا کہ اس انگریز سربراہ کو ڈپلومیٹ مذکور نے کھانے پر بلایا اور کہا کہ صاحب آپ یہ کیا غضب کرتے ہیں۔ میری بیگم کے نشریات میں خلل پڑ جائے گا۔ انگریز کو اپنی ڈپلومیسی کا بھی خیال تھا۔ اس نے جواب دیا آپ فکر نہ کیجیے، آپ کی بیگم کا ہفتہ وار پروگرام جوں کا توں رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں حسب عادت اس سارے قصے سے بے نیاز رہی تب ایک روز تقی میاں نے مجھ سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے آپ کو ابھی تک کنٹریکٹ ہی کیوں دیے جاتے ہیں؟ فلاں فلاں ڈپلومیٹ کو ناخوش نہیں کیا جاسکتا۔

اس قسم کے واقعات دنیا کے ہر سرکاری اور غیر سرکاری ادارے میں عموماً پیش آتے رہتے ہیں جن کی زد چند افراد پر پڑتی ہے اور چند قائدے میں رہتے ہیں۔ لیکن مجھ پر کچھ ایسی بے وقوفی

طاری تھی کہ ان باتوں کا پتہ ہی نہ چلا تھا۔ میں حسب معمول خیریات میں شرکت کرتی رہی۔ مزید  
 احسن کا ثبوت یوں دیا کہ ایک فیملی فرینڈ جو حال ہی میں بی بی سی میں آئے تھے، انھوں نے مجھ سے  
 شیکسپیر کے پورے پورے ڈرامے اردو میں ترجمہ کروائے اور ایک ڈرامہ برٹارڈ شا کا  
 Candida، لیکن بطور مترجم نام ان کا نشر ہوا۔ فیروز جبین نے بھی اسی طرح چند ڈرامے ترجمہ  
 کیے۔ ہوتا یہ تھا کہ موصوف مجھ سے کہتے ’لو بھنؤ میکبھ کا ترجمہ کرو تو تمہارے لیے ہائیں ہاتھ کا  
 کھیل ہے، تم اس میں ایک چڑیل کا پارٹ کرو۔‘

آہا! چڑیل بہت اچھا رول ہے۔ اور میں جھٹ پٹ ترجمہ کرنے بیٹھ جاتی۔ عطیہ کو ہم  
 سب بہت ایڈماز کرتے تھے۔ وہ ایک ماہر فن براڈ کا مٹر تھیں۔ وہ ان ڈراموں کی ہیروئن بنتی۔  
 اعجاز بٹالوی ہیرو۔ عطیہ ایسی اہم خیریات کے لیے ایک انگوٹھی پہن کر آتیں جو ان کو شاید کسی بزرگ  
 نے دی تھی۔ اس زمانے میں پروگرام پہلے سے ریکارڈ نہیں کیے جاتے تھے۔ ساری خیریات فنی  
 الہدیہ ہوتی تھیں اور طویل ڈراموں میں ہمیشہ یہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں ڈرامی بھول چوک نہ ہو  
 جائے۔ دراصل ہر پروگرام سے پہلے یہی فکر رہتی تھی۔ عطیہ خاص طور پر طویل ڈراموں کے لیے  
 یہ انگوٹھی پہن کر آتی تھیں۔

ایک بار فیروز نے چپکے سے مجھ سے کہا نہیں معلوم ہے عطیہ کتنی بڑی ہیں۔ وہ 35 سال  
 کی ہیں۔ دستور کے مطابق ہمیشہ ان کا نام لیا۔ ایک تو عطیہ کو ہانسی پکار کر خود کو کس ثابت کرنے  
 کی مجھے کوئی ترسنا نہیں تھی دوسرے یہ کہ مطرب میں اپنے سے بڑوں کو آہا، بھائی وغیرہ کہنے کا دستور  
 نہیں ہے۔

مٹی اور عطیہ نے چلیسی میں ایک فلیٹ خریدا تھا اور ان کے دونوں بچے وہاں اسکول  
 میں داخل ہو گئے تھے۔ عطیہ انگریزی میں لکھتی تھیں۔ ان کے انگریزی افسانوں کا مجموعہ  
 'Phoenix Field' ایک بلند پایہ پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوا۔ نہ جانے کیوں عطیہ کو تراجم کے  
 ذریعہ اردو میں متعارف نہیں کیا گیا۔ ان کے انگریزی ناول کو بھی اردو میں چھپنا چاہیے تھا۔ عطیہ  
 ایک بہت خلعتی، ملسار اور خوش مزاج بی بی تھیں۔ ساری زندگی ان کی بے پناہ مدد سرائی کی گئی اور

قدرت نے ان کو مہی بھر کے ہر طرح سے نوازا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو کوئی خاص الخاص ہستی بھی نہیں سمجھا۔ برطانیہ کا حلقہ امرا یعنی لارڈ اور لیڈی لوگ ان کی ایک بہت ہی حیکر اور علاحدگی پسند سوسائٹی ہے۔ عطیہ ان گنتی کے چند ہندوستانوں میں شامل تھیں، جن کی اس سوسائٹی میں پنڈرائی کی جاتی تھی۔ لیکن جس طرح وہ لارڈ فلاں اور لیڈی فلاں کے یہاں ویک اینڈ پارٹیوں میں مدعو کی جاتی تھیں اسی اطمینان کے ساتھ وہ لندن کے گناہ ہندوستانوں کی دعووں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ کسی قسم کا پرسنالٹی پر اہم عطیہ کے یہاں نہیں تھا۔

اپنے بھائی فواد کے انتقال کے بعد عطیہ ٹوٹ سی گئی تھیں۔ فواد ایک ماہر ہوا باز تھے۔ طیارے کے حادثے میں وہ ہلاک ہوئے۔ وہ جتنا غم نہ کرتیں کم تھا۔ عطیہ کے بیٹے وارث حسین اور بیٹی شمع دونوں قلم ساز ہیں اور بچپن سے انگلستان میں رہے ہیں۔ ایک قابل تعریف بات یہ تھی کہ شمع نے انگلستان کے بجائے ہندستان آکر اپنا کام شروع کیا۔ شمی نے بھی میں واؤن روڈ پر ان کے لیے ایک فلیٹ خریدا۔ یہ فلیٹ میرے پڑوس میں تھا۔ کبھی کبھی عطیہ لندن سے آکر وہاں قیام کرتیں۔ ڈاکٹر ملک راج آنند اور نوشو بنرجی ان کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ وہ سہ پہر مجھے یاد آتی ہے جب عطیہ کے یہاں گئی وہ دروازہ کھول کر باہر آئیں اور زارو جھارو روئے لگیں۔ وہ فواد کے انتقال کے بعد بے حد رقیں القلب ہو گئی تھیں۔ اور بات بات پر انگبار ہو جاتی تھیں۔ فواد کی بے وقت موت نے ان کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ایک مرتبہ جب عطیہ بمبئی آئیں۔ فلم 'شعلے' کی کامیابی ہر جگہ زیر بحث تھی۔ عطیہ کے یہاں بھی یہ ذکر نکلا۔ ان کے شوہر بھی آئے ہوئے تھے۔ شمع اردو نہیں بول پاتی تھیں۔ ہیرا چائے لے کر آیا تو شمع نے مجھ سے کہا کہ اسے سے پوچھیے 'شعلے' اتنی زیادہ کیوں پسند کی گئی۔ وہ بولا میں صاحب اس میں ڈائلاگ بہت جبر جھٹ مارا ہے جیسے آدمی تین گولی چھ۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ میرے نے کیا ڈائلاگ دہرایا تھا۔ اس وقت میں سوچ رہی تھی کہ شمع اور وارث اپنی مکمل برطانوی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ ہندستان کی اجتماعی سائیکس کے اسرار و رموز اپنی گرفت میں لے آئیں تو ہات بے گی۔

پچھلی بار جب میں لندن گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ عطیہ علیل رہتی ہیں۔ میں فیروز اور یاد  
 عباس ان کے یہاں گئے۔ ہم لوگ بہت دیر تک پرانی باتیں کرتے رہے۔ چلتے وقت میں نے کہا  
 آج ہم لوگوں نے ریٹائرڈ جرنیلوں کی طرح بیٹھ کر اپنے اپنے محاذ اور میدان کارزار کا تذکرہ کیا  
 ہے۔ عطیہ بہت فحسیں۔  
 افسوس کہ ریٹائرڈ جرنیلوں کی اگلی ری یونین میں شرکت کے لیے وہ موجود نہ  
 ہوں گی۔

---

(ماہنامہ 'آج کل'، نئی دہلی، اگست 1998)



## جو جھکوں تو شاخ گلاب ہوں

(عزیز بانو داراب وفا)

مصرع اولیٰ مجھے یاد نہیں، سوچتی تھی کہ عزیز بانو کو خط لکھ کر پوچھوں کہ اپنا پورا شعر لکھ کر  
بھیج دو لیکن کل شہر یار نے علی گڑھ سے فون پہ یہ اطلاع دی کہ عزیز بانو وفا بھی دنیا سے رخصت ہو  
گئیں۔ یہ خبر بالکل غیر متوقع تھی کیونکہ بانو کی علالت کا کبھی کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔ شاید اچانک  
روانہ ہو گئیں۔ میری دوست سرت جہاں تیوری جو بہادر شاہ ظفر کی پر نواسی کی حیثیت سے اس  
جہان گزراں کے فراز و نشیب اور گرم و سرد کو بخوبی پہچانتی ہیں، انھوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا تھا  
کہ جب بھی کسی نامور ادیب یا شاعر کا انتقال ہوتا ہے اور تمھارے پاس اخبار اور رسالے والوں  
کے ٹیلی فون آنے لگتے ہیں اور ان کی فرمائش پر تم فوراً ایک عدد مضمون لکھ دیتی ہو، اس طرح تم  
باضابطہ نو حد گرم مشہور ہو جاؤ گی۔

سرت جہاں خالص دہلی والی ہیں۔ اہل لکھنؤ سے زیادہ واقف نہیں۔ ورنہ وہ نو حد گرم کے  
بجائے رونے کی اصطلاح استعمال کرتیں۔ جاننا چاہیے کہ لکھنؤ میں متوفی کے لیے گریہ دہکا کرنے

والے کرائے پر مل جاتے ہیں، لیکن ہے یہ رسم اب موجود نہ ہو۔ اب تک میں بی بی سی اردو سیکشن والے صدیق احمد صدیقی، ابن انشاء، عطیہ حبیب اللہ، ملک راج آنند اور صاحب قزلباش پر اپنے رنج و غم کا اظہار کر چکی ہوں۔ اس میں عزیز بالو کا نام بھی آگیا۔ اب اللہ میاں سے درخواست یہی ہے کہ وہ اس فہرست میں اضافہ نہ کریں۔

عزیز بالو مشاعروں میں شرکت کے لیے کافی دور دور تک جاتی تھیں لیکن اب کچھ عرصے سے سنا ہے کہ خانہ نشین ہو گئی تھیں۔ اس کا معاملہ یہ تھا جب انھیں کسی بیرونی مشاعروں کے لیے مدعو کیا جاتا تو اکثر دعوت نامے ان تک پہنچتے ہی نہیں تھے۔ اس کا تجربہ مجھے بھی ہو چکا تھا کہ جب مجھے نیو یارک میں ایک بہت اہم کانفرنس کے لیے بلایا گیا تو وہ دعوت نامہ مجھ تک پہنچنے کے بجائے ایک اور خاتون کو دے دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ میں بہ وجہ مصروفیت نہیں جاسکتی۔ بعد میں جب نیو یارک گئی تو چند دوستوں نے مجھے بتایا کہ ہم تو قصص لینے کے لیے ایئر پورٹ گئے تھے لیکن وہاں ایئر لائنیا کے طیارے سے ایک اور خاتون اتریں۔ بعد میں ان نیک مادام کو دعوت نامہ کی اس ہیرا پھیری کے متعلق لاعلم رکھا گیا۔ یہ تو ایک معمولی واقعہ تھا لیکن انٹرنیشنل سیاست میں کیسی کیسی دھاندلی ہوتی ہوگی، اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجیے۔

جمیل الدین عالی نے مجھے دوئی کے ایک انٹرنیشنل مشاعرے کا افتتاح کرنے کے لیے مدعو کیا۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ کر چکی ہوں۔ میں نے ان سے کہا ”میں شاعر تو ہوں نہیں، کسی مشہور شاعر کو بلائیے۔“ جب موصوف نے مزید اصرار کیا تو میں نے کہا ”ہندستان کی ایک بلند پایہ شاعر جن کے بیرونی دعوت نامے اکثر ان کو نہیں ملتے، آپ اپنے مشاعرے کے متعلق مجھے لکھ بھیجئے۔ وہ خط موصوف کو لکھتے کسی کے ہاتھ پہنچا دوں گی۔“ چنانچہ یہ ترکیب کامیاب رہی اور بانو مشاعرے کے لیے تشریف لے گئیں۔ جب وہ ہزاروں کے مجمع میں اپنا کلام پیش کر رہی تھیں اور واہ واہ کے ڈوگرے برس رہے تھے۔ عالی اسٹیج کے پیچھے قاتلوں کے درمیان ٹپٹلتے ملے۔ کہنے لگے ”بھئی یہ تو بہت ہی مشاعرہ لوٹ قسم کی خاتون نکلیں۔ میں نے جواب دیا ”میں نے خواہ مخواہ ہی تو آپ سے نہیں کہا تھا کہ انھیں بلائیے۔“



موصوفہ بے پناہ خود اعتمادی اور وقار کے ساتھ اپنا کلام سناتی تھیں۔ وہ پبلک کی نہیں بھی خوب پہچان گئی تھیں اور جس قسم کے سامعین انھیں دکھلائی دیتے وہ ان ہی کے ذوق کی مناسبت سے اپنے اشعار کا انتخاب کرتیں۔

میں یہ واقعہ 'کار جہاں دراز ہے' میں قلم بند کر چکی ہوں کہ جب ہلکی اسکول میں ہماری اردو کلاس لینے سوز شا جہاں پوری پہلے روز تشریف لائے اور لڑکیوں سے باری باری کوئی عبارت یا کچھ اشعار پڑھوا کر سنے۔ بانو میرے قریب ہی تشریف فرما تھیں لیکن ہماری باری آنے سے قبل ہی سوز صاحب نے جھنجھلا کر فرمایا، آپ لوگ بالکل کوری ہیں۔ بانو نے فوراً کاپی پر لکھا، جی ہاں! ہم لوگ ابھی ابھی کبھار کے یہاں سے بن کر آئے ہیں اور کاپی میری طرف سرکا دی۔ میں نے شاید پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ میر دروڈ لال باغ کی جس تاریخی عمارت میں ماسٹر پر جتنی سنگھ سروسٹو نے اپنا اسکول کھولا تھا، وہ اس محل سرا کا گیسٹ ہاؤس تھا جس میں دارن مسنگو نے اٹھارویں صدی میں جیمات اودھ کو نظر بند کیا تھا۔ اس وقت اس عمارت اور اس کے گچن میں شاعی خاندان کی خواتین اور ان کی کنیزیں اور خواص عین اسی جگہ اپنے شب دروڈ گزارتی ہوں گی۔ وہ کیہ سا مانہ رہا ہوگا۔ اس تصور کے لیے عہد جان کہنی کی برطانوی تصاویر سے ہی مدد لی جاسکتی ہے لیکن اس وقت لکھنؤ کے مصور بھی تناظر، روشنی اور سائے کا استعمال کرنے لگے تھے۔ لکھنؤ میں انگریزی تہذیب سرایت کر چکی تھی۔ شاعی حرم میں فرنگی عورتیں شامل ہو رہی تھیں اور کہنی کی حکومت نے اپنی جعل سازی سے اودھ کے ہر فرماں روا کو کسی نہ کسی طرح اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ لکھنؤ کا اینگلو اینڈین طبقہ بھی تبھی وجود میں آیا۔ اس رنگارنگ سوسائٹی میں جھٹی غلام اور کنیزیں بھی موجود تھیں۔ یوریشین رفاہیوں اور فرانسیسی گیسو تراش اور پار چہ دوز بھی یہ ایک بہت ہی فراغ دل مخلوط سوسائٹی تھی۔ حضرت گنج کے ایک امام باڑے کا تذکرہ میں نے پہلے بھی کیا تھا جہاں ایام نذر میں انگریزوں نے چڑھ جتا لیا تھا اور اس کے شاگرد پیچھے میں دیسی بیسائی آباد کر دیے تھے۔ وہ امام باڑہ تو کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو واپس دے دیا لیکن بیسائی کتبے وہاں آج تک آباد ہیں اور وہ پورا علاقہ مقبرہ کپاؤنڈ کہلاتا ہے۔ اسکول میں ہماری جغرافیہ کی ٹیچر سزا داس بھی وہیں

رہتی تھیں اور ہائی اسکول کے امتحان سے چند روز قبل انھوں نے ہمیں چائے پر بلایا تھا۔ جانا چاہیے کہ ٹی پارٹی برٹش امپائر کی سوسائٹی کی ایک خصوصیت تھی۔ ہماری والدہ اور ان کے حلقہ احباب کی سوشل مصروفیات میں ٹی پارٹی ایک اہم مقام رکھتی تھی۔

چنانچہ مسز واس کی پارٹی میں ہم لوگ نہایت ذوق و شوق سے مقبرہ کپاؤنڈ گئے۔ میں نے بڑے اہتمام سے اپنی واحد ساڑی پہنی چونکہ میں محض فرائیڈ تھی۔ ایک شلوار سوٹ حاضر ماموں کی بیوی نے دیا تھا۔ جب ہم ان کے یہاں لکھنؤ سے دہرہ دون گئے تھے اور وہ سوٹ میں نے بروز عید زیب تن کیا۔ وہی سوٹ میں اپنے ساتھ بتارس لے گئی جب ہم امتحان دینے کے لیے وہاں وارد ہوئے تھے اور اسی سوٹ کا جاپانی جارجٹ کا دوپٹہ جس پر چٹیلی ہیلکس والی تیل لگی تھی۔ واضح ہو کہ اس زمانے میں رنگوں کی مناسبت کا شاید کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا تھا کیونکہ بڑھیا سلک کے سوٹ پر ہلکی گلابی اور ہلکی نیلی لکیروں کے پرنٹ کا کوئی جوڑ تاریخی دوپٹہ سے نہیں تھا۔

بہر حال ہائی اسکول کے اس گروپ فوٹو گراف کے لیے عزیز بانو داراب نے وہ دوپٹہ مجھ سے مستعار لیا۔ سامنے فرش پر ایک طرف عزیز بانو اور دوسری طرف حمیدہ زیدی اس تصویر میں شاداں و فرحاں بیٹھی ہیں اور جب تک وہ تصویر باقی ہے، ان کے یہ عکس بھی موجود ہیں گئے لیکن حمیدہ زیدی نے چند سال قبل پاکستان میں رحلت کی اور عزیز بانو دقائے بھی حال ہی میں دنیا کو خیر باد کہا یعنی پکٹنے کا غد پر چھپا فوٹو گراف اشرف المخلوقات سے زیادہ پائیدار نکلا۔

کاش بانو نے اپنا مجموعہ کلام ہی چھپوا لیا ہوتا تاکہ وہ محض مشاعروں کی شاعرہ کے طور پر یاد نہ کی جاتیں۔ آگ کا دریا میں نے عزیز بانو کو حمیدہ بانو کے نام سے پیش کیا ہے:

”حمید بانو جو وسط شہر کی ایک زبردست محل سرا میں رہتی تھی، شاعری کرتی تھی اور سخت درمیک رو رہتی تھی۔

...حمید بانو جس کے یہاں ڈرامے کا احساس بے حد شدید تھا، اپنا سر ہلا کر بڑے پراسرار انداز میں کہتی، شاہ زمیں غازی الدین حیدر کی انگریز سالی اشرف القسا بیگم یہاں رہتی تھیں۔ ان کی مہری کو بادشاہ کے

آدمیوں نے اسی زینے پر قتل کیا تھا۔  
 کیوں گپ مارتی ہو۔ کسم بحث کرتی ہے۔  
 کون اشرف التسابیگم۔ وہ جان پاکیزہ والٹرز کی لڑکی؟  
 ہاں وہی۔  
 وہ تو بیگم کوٹھی میں رہتی تھیں۔  
 اپنی ماں سے لڑ کر یہاں چلی آئی تھیں۔ مجھے معلوم ہے۔  
 حمید بانو سے لکھنؤ کی تاریخ کے حعلق کوئی زیادہ بحث نہ کر سکتا  
 تھا۔ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ خیال آتا کہ یہ تو سو سال پہلے کے لکھنؤ کا ایک  
 کردار ہے جو اس پرانی برجی میں سے جھانک کر ہم سے باتیں کر رہا ہے۔  
 ابھی زینے کا دروازہ بند ہوگا اور یہ غائب ہو جائے گی۔ طلعت کو یقین تھا  
 کہ بڑی ہو کر حمید بانو، بیگم عبدالقادر اور حجاب امتیاز کی طرز کے افسانے  
 لکھا کرے گی۔“

(آگ کا دریا، ص: 272-273)

لیکن یہاں میں نے تھوڑی سی سبالڈ آرائی کی ہے کیونکہ بانو کا اصل میدان لکھنؤ کی تاریخ  
 کے بجائے شاعری تھا جو انھیں اپنے دارا خوجہ عزیز لکھنوی سے ورثے میں ملی تھی۔ خوجہ صاحب  
 فارسی کے نامور شاعر اور علامہ اقبال کے ذاتی دوست تھے۔ گزشتہ صدیوں کے خواجگان اور کشمیری  
 چنڈتوں کو ان کا آب و دانسان کی جنت ارضی سے نکال کر کہاں کہاں لے گیا۔ کتنے ہی پنڈت لوگ  
 الہ آباد اور لکھنؤ میں جا بے، کتنے پنجاب میں رہ پڑے لیکن ان میدانوں کی کھلسا دینے والی دھوپ  
 نے ان کے رنگ و روپ پر آنچ نہ آنے دی۔ کہا جاتا ہے کہ سعادت علی خاں نواب وزیر اودھ کی  
 شادی میں شرکت کے لیے مہاراجہ کشمیر لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ ان کے ہمراہ سری نگر کے بہت  
 سے اہل قلم اور اہل حرفہ بھی اودھ کی راجدھانی میں وارد ہوئے۔ یہاں کی رونق اور گہما گہمی دیکھ کر  
 یہیں رہ پڑے۔ لکھنؤ کا کشمیری محلہ انھوں نے آباد کیا۔ یہ لوگ آپس ہی میں شادیاں کرتے  
 رہے۔ لہذا ان کا رنگ و روپ ابھی تک برقرار ہے۔ ہنود میں سپرد، کچلو، کالچو، ہنر و غیرہ ان ہی کی  
 اولادیں ہیں۔ یہ لوگ خالص لکھنوی ہو چکے ہیں اور اپنی کشمیری زبان سے واقف نہیں۔ اسی طرح

اجتماعی ترک وطن سے پوری پوری آبادیوں کی زبان اور تہذیب بدل جاتی ہے۔ کشمیری ہندوؤں میں ملا اور آغا جیسے خاندانی نام بھی موجود ہیں۔

بانو کی خاندانی دو منزلہ حویلی کی پیشانی پر اواخر اٹھارویں صدی کا ایک اعداد انگریزی میں منکس ہے جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ عہد آصفی میں انگریزی کس حد تک لکھنؤ میں رائج ہو چکی تھی۔ میں نے لفظ حویلی مجبوراً لکھا ہے کیونکہ ہندوستانی فلموں میں یہ اصطلاح بے دھڑک ہر جھوٹے بڑے مکان کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ اب تو یہ لفظ بہت فیشن میں آ گیا ہے اور نئی دہلی کا ایک ریستوران بھی حویلی کہلاتا ہے۔

بانو کے آبائی مکان عزیز منزل کو دو سال سے ماشا اللہ اسی خاندان کے افراد نے آباد کر رکھا ہے جو ایک غیر معمولی بات ہے۔ انگلستان اور یورپ میں صدیوں پرانے مکانات کو جدید ترین سہولتوں سے آراستہ کر کے کرائے پر اٹھایا جاتا ہے یا اسی کے موجودہ وارث رہتے ہیں کیونکہ وہ ایک پرچی لکھی قوم ہے اور اپنے تہذیبی ورثے کی اہمیت کو خوب سمجھتی ہے۔ ہمارے یہاں عہد جان کنی کی کولمبیاں بھی بے دردی سے سمار کی جا رہی ہیں۔ ہم شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا بنگلہ مول لائنز میں ہے تو ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی اصطلاحات استعمال کر رہے ہیں۔ یورپین نوآبادکاروں نے ہندوستان کے گنجان شہروں سے متاثر کھلی فضا میں بستیاں اپنے لیے بسائیں۔ کنٹونمنٹ (Contonment) جسے عوام نے چھاؤنی کہا جس کے ساتھ ایک پلٹن بازار بھی ہوتا تھا، لکھنؤ اور غازی پور کے پلٹن بازار، گورا بازار اور لال کرتی بازار (لال کرتی Red coats فرنگی سپاہیوں کا ہندوستانی نام تھا) ماشا اللہ اب تک آباد ہیں۔ ان کی دکانوں میں آؤ یہ اس نوٹو گراف البتہ بائیسکوپ کی تصویروں کی طرح بدلتے رہے ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ، ایڈورڈ ہفتم، جارج چہم، ایڈورڈ ہفتم، ملکہ الیزابیتہ، اندرا گاندھی۔

چنانچہ بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے نامور شعرا کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پرسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہل نظر نے اپنے عہد رفتہ کے مشاہیر کے مکانات

کو اسی طرح سمجھنا کے رکھا ہے اور میں یہ رونا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کوئلے کی دکان کھل گئی۔ خود ہانوں کی وسیع حویلی میں میراثا آ کے رہے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے پہلے کہیں یہی لکھا تھا۔ اس زمانے میں اس پاس کے مکانات بھی ہانوں والی حویلی کے احاطے میں شامل تھے۔ چنانچہ جو کشمیری تاجر لکھنؤ میں آباد ہوئے مشغولِ زہر عشق کا سوداگر بھی اسی زمانے کا ایک فرد رہا ہوگا:

جس محلے میں تھا ہمارا گھر وہیں رہتے تھے ایک سوداگر  
مرد اشرف صاحب دولت تاجروں میں کمالِ ذی عزت  
غم نہ تھا کچھ فراقِ ہالی سے تھے بہت خاندانِ عالی سے

شہر لکھنؤ میں باقیاتِ الصالحات کی افراط ہے جو پرانی دہلی میں اتنی موجود نہیں رہی۔ 1947 میں آدمی پرانی دہلی پیسے اور پر لگا کر کراچی چلی گئی۔ لکھنؤ میں اللہ کے فضل و کرم سے امی جمی رہی بلکہ پنجاب سے آئے ہوئے شہر ترقی اور ان کی اولاد بھی اب بہ اعتبارِ دلچسپی لکھنؤ ہو چکے ہیں جو سماجی ارتقا اور تہذیبی کا ایک قدرتی عمل ہے۔ لندن میں ہندوستانی اور پاکستانی مزدور پیشہ آبادی کی تیسری نسل اب کوئی انگریزی بولتی ہے۔ میں سڈنی گئی تو وہاں اسماعیل میرٹھی کے پر نواسوں کو خالص آمریلیٹین لہجے کی انگریزی بولتے پایا۔ ہمارے اپنے خاندان کے بچے جو تقسیم کے بعد لاہور اور چنڈی میں پلے بڑھے پنجابی لہجہ اختیار کر چکے ہیں۔

لیکن اگر آپ اندرونِ شہر لکھنؤ میں تشریف لے جائیے تو آپ کو اب بھی پرانا لب و لہجہ سنائی دے گا۔ ہانوں کا گھرانہ اس تہذیب کے آخری رکھوالوں میں شامل ہے۔ سنیہ جیت رے جب شطرنج کے کھلاڑی بنانے کے لیے لکھنؤ تشریف لے گئے اور عزیز منزل کی زبانی محلِ سرا میں عزیز ہانوں اور ان کی چھوٹی بہن بدر سے ملاقات کے بعد انھوں نے تعجب سے کہا کہ لکھنؤ ایسا شہر ہے جہاں مجھے ایک قدیم محلِ سرا میں اعلیٰ درجے کی انگریزی بولتی ہوئی خواتین ملیں۔ شاید ان کا خیال تھا کہ پرانے لکھنؤ کی ساری خواتین اُن پڑھ اور پر دے کی بوبو ہوں گی۔ مسلم سماج کے لیے یہ تصویر یوں بھی عام طور پر پایا جاتا ہے کہ ساری مسلمان عورتیں جاہل اور پردہ نشیں ہیں۔

لکھنؤ کی پرانی حویلیاں رفتہ رفتہ غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ اسی طرح کچنی کے عہد کے جنگلے اور کوٹھیاں ملیا میٹ ہو جائیں گی۔

ترقی پسند ملتے نے جب یہ سب کوتاہ بینی ہر پرانی چیز کو رجعت پسند قرار دیا اور ماسکو سے گویا اپنی ترقی پسندی کی سند حاصل کی۔ لیکن جب میں نے دوسرے سوویت یونین کے متعدد ممالک کی سیاحت کی اور سارے گرجا گھروں کو فروزاں دیکھا تو اپنے ملک کے پروگریسو اہل دانش پر تعجب ہوا۔ دراصل روسیوں کو اپنی تاریخییت کا بخوبی احساس ہے جسے ہم اپنے جوش و خروش میں زائل کر چکے ہیں۔ یوں تو ہمارے یہاں سال کے بارہ مہینے کوئی نہ کوئی تہوار ملک گیر پیمانے پر منایا جاتا ہے مگر اکثر بلکہ زیادہ تر اس کی آمد سے قبل ہی لوگ سہم جاتے ہیں کہ اس بار زیادہ سر پھٹول نہ ہو۔ آپ نے بھی سنا ہے یا مغرب کے اخباروں میں سرخیاں دیکھی ہیں کہ فلاں جگہ کرسمس کی شام اتنے گھر نذر آتش کیے گئے یا Easter کی صبح اتنی دکانوں سے رنگین اڑے لوٹ کر بلوائیوں نے چوراہے پر پھوڑا ڈالے۔ آخر وہاں ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ کیا وہ لوگ سب فرشتے ہیں یا سب نے آکسفورڈ اور سوربون سے ڈگریاں حاصل کی ہیں؟

ہم لوگ نہ صرف بد قین، بد تہذیب اور بیہودہ ہیں بلکہ پرلے درجے کے احمق اور کند ذہن بھی ہیں۔ محض ڈگریاں حاصل کرنے سے محفل نہیں آتی۔ ہندوستان میں کسی تہوار کے موقع پر کہیں جم غفیر موجود ہو، فوراً فساد کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ گشت کے لیے پولیس نمودار ہو جاتی ہے۔ انگلستان میں تہواروں کے زمانے میں لڑکے لڑکیاں رات رات بھر سڑکوں پر ناچتے گاتے پھرتے ہیں اور اسی پر امن طریقے سے صبح کو منتشر ہو جاتے ہیں۔ میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں اور یہ واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کہ سال لو کی شام گوا کے سب سے بڑے کنٹینرل میں رات کی سڑکوں کے دوران میں نصف شب کے بعد گر جاسے باہر نکلی۔ سارے شہر میں سناٹا تھا۔ میں بالکل سنسان سڑک پر تنہا پیدل چلتی اپنی جائے قیام پر پہنچ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ پانچ سو سال سے یورپین تہذیب کے دائرے میں رہا ہے۔

خود شہر لکھنؤ میں بہت سے ایسے علاقے اب بھی موجود ہیں جو عہد شاہی اور کچنی کے امداد

کی ملی جلی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن پرانے بئرس یا پرانے لندن یا قرون وسطی کے پرستانی جرمن شہروں کی طرح ان کو محفوظ رکھنے کی کوئی سعی نہیں کی گئی بلکہ ان یادگاروں کو مٹایا بھی جا رہا ہے۔ پاکستان کے متعدد مہاجرکنوں کے بچے جو وہیں پیدا ہوئے اور ہندوستان کبھی نہیں آئے یہ بھی نہیں جانتے کہ تخت کیا چیز ہے اور اس پر لوگ کیوں اور کیسے بیٹھتے تھے۔ جب میری کسی تحریر میں آج کی نسل کی ایک لڑکی نے موٹر خانہ پڑھا تو اس نے ذرا محفوظ ہو کر مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ میں نے کہا ”ہمارے زمانے میں کار کو موٹر اور گیراج کو موٹر خانہ کہا جاتا ہے۔“

کیسے پتے کی بات جو گیندر نے کل کہی

موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا نموش

اور یہ لفظ مذکر تھا۔ ہمارے والد مرحوم بھی اسے مذکر ہی کہتے تھے۔ الفاظ کا استعمال اور ان کی تذکیر و تانیث وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اودھ میں تذکیر زیادہ مستعمل ہے۔ مجھے اب تک یاد ہے اور اس کا میں پہلے بھی تذکرہ کر چکی ہوں کہ جب ہم لوگ غازی پور سے روانہ ہو رہے تھے تو والدین کو رخصت کرنے والوں نے اوک لینڈ کو پھولوں اور ہاروں سے لاد دیا تھا۔ وہ کرکس کا زمانہ تھا۔ شہر سے باہر ایک جگہ گاڑی رکی تو ایک دیہاتی نے کہا ”بڑے دن کا موٹر سجا ہے۔“ مجھے یہ جملہ لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ مطلب یہ کہ مذکر لفظ موٹر عام طور پر مستعمل تھا۔ اب عوام موٹر آگیا کہ بجائے کار آگئی کہتے ہیں۔ بول چال کی زبان میں اس قسم کی ہلکی پھلکی تہذیبیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آج کل الفاظ جس نئے طریقے سے لکھے جا رہے ہیں وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ مثلاً طوطا آپ ڈ سے لکھے تو واقعی وہ طوطا چشم معلوم ہوتا ہے۔ ’ت‘ سے تو تائیا لگتا ہے جیسے اس بچارے کو گنجا منڈا کر دیا ہو۔ ابھی ایک مدرسے سے فاضل نے کمرے کی کھال کے چندہ کی رسید کاٹنے ہوئے کھال کو خال نکھا۔ جب ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے یہ کہا کہ یہ جدید اردو ہے۔ کل کو آپ کہیے گا کہ گلشن کو گل شن لکھو۔ نہیں صاحب، معاف کیجیے۔ مجھے آپ کی یہ نئی اردو نہیں چاہیے۔ آپ کا جو جی چاہے لکھیے۔ بلیکزہ کو علی گڑھ کر دیا ہے۔ کل آپ کانپور کو کان پور لکھیے گا وہ آپ کو مبارک ہو۔

ہالو کا کتبہ قدیم لکھنؤ کے ان چند خاندانوں میں سے تھا جن کی زبان اور محاورہ اس میں ان کے یہاں پہلی بار گئی تھی تو ان کی قدیم نہایت فریبہ خادہ کو دیکھتے ہی میں نے بے ساختہ کہا تھا Stone Age یعنی وہ نہ جانے کیوں ہماری عہد کی ایک یادگار معلوم ہوتی تھیں۔

خواجہ عزیز الدین لکھنؤ کے پوتے یعنی ہالو کے والد دنداں ساز تھے اور ان کا مطب قیصر باغ کے چوراہے یعنی قیصر باغ سرکس (گول چکر) میں واقع تھا۔ ہالو شاعرہ بھی تھیں اور خوش آواز بھی۔ لیکن انھوں نے مشاعروں میں کبھی جوت اللفظ کے بجائے ترنم سے نہیں پڑھا۔ انھوں نے ہندستانی شامریہ سنگیت بطور ایک اختیاری مضمون لے رکھی تھی اور اس کلاس میں بھی وہ میری ہم درس رہیں۔ انھوں نے کرامت حسین مسلم گرو کالج سے انٹرمیڈیٹ، ازاہیلا تھو برن کالج سے بی اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔

ایک مرتبہ لندن بھی تشریف لے گئیں لیکن کچھ عرصہ بعد وہاں بیمار پڑیں تو فرمایا علاج میں لکھنؤ ہی میں کراؤں گی اور واپس آگئیں۔ ایک نیچرل شاعری کی حیثیت سے ان کے یہاں آمدنی آمد تھی۔ ظریف طبع بھی بہت تھیں۔ ایک مزاحیہ نظم انھوں نے نہایت روانی سے لکھ کر کاپی ہماری طرف سرکادی تھی لیکن انھوں نے کبھی اپنا کلام کہیں شائع نہیں کروایا۔ ان کی اس قدیم حویلی کے صحن میں ایک اندھا کنواں بھی موجود ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے طے کیا کہ شاعری ترک کر دیں گی اور اپنی وہ ساری کاپیاں جن میں انھوں نے اپنے اشعار قلم بند کیے تھے، انھا کراس کنوئیں میں ڈال دیں۔ کہا گیا ہے کہ تنگی کراؤر کنوئیں میں ڈال۔ عزیز ہالو وفاتے کہا شاعری کراؤر کنوئیں میں ڈال۔ خوش قسمتی سے کنوئیں میں پانی نہیں تھا اور ان کے رشتہ داروں نے وہ کاپیاں کنوئیں سے نکال لیں۔

ہالو نے لکھنؤ کے ایک گرو کالج میں برسوں انگریزی ادب پڑھایا اور وہیں سے ریٹائر ہوئیں۔ ان کا انگریزی کا مطالعہ گہرا اور وسیع تھا مگر ان کے شدید حس طرافت نے ان کو ایک بور قسم کی عالم فاضل پروفیسر بننے سے بچالیا۔ لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں ہالو باجی ایک نہایت محترم و مقبول ہستی تھیں۔ پھر بھی میں یہ کہوں گی کہ ایک طرف سے عزیز ہالو وفا اور دوسری طرف سے



صحاب قزلباش بیک وقت پھاٹک میں داخل ہو رہی ہیں۔ یعنی قلم سازی کی زبان میں دونوں نے ایک Time میں Entry دی۔ صاحب لندن سے آرہی تھیں اور ہالو لکھنؤ سے۔ یہ دونوں خواتین نہایت باوقار انداز سے تحت اللفظ میں اپنا کلام پیش کرتی تھیں۔ حالانکہ دونوں غیر معمولی طور پر خوش آواز تھیں اور اگرچہ انہیں تو اپنے اشعار بطور نغمہ بھی پیش کر سکتی تھیں۔

عزیز ہالو کو اپنے کتبے کی تاریخی اہمیت کا احساس تو ضرور تھا لیکن بہ وجہ لکھنؤ کسر نشی کبھی اس کا تذکرہ ہی نہیں کرتی تھیں۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ لکھنؤ کے وہ کتبے اور وہ شخصیات جنہوں نے اس شہر نگار کو بقول مجاز بند و تار بنایا، ان کے بارے میں ہالو کتنا کچھ لکھ سکتی تھیں لیکن انہوں نے اپنا کلام ہی جمع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ اس کے تاریخی و ثقافتی پس منظر کے حلقے بھلا کیوں لکھتیں۔ ہالو کے ایک بھائی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انگلش کے پروفیسر ہیں۔ دوسرے بھائی لکھنؤ ٹیلی ویژن کے ایک مقبول اداکار رہے ہیں۔ چھوٹی بہن بدر بھی انگلش کی استاد رہ چکی ہیں۔ یہ دونوں بہنیں اس قدیم حویلی میں سکونت پذیر تھیں جسے National Heritage میں شامل کرنا چاہیے۔ راجستھان کے دور اندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں ٹورسٹ انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نوہ گری کر چکی ہوں کہ علی گڑھ کے وہ پھوس والے جنگل جو جان کبھی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سرسید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذر و آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ سترھویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے یکن اہمی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمرائیشب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماثلی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے

پاس وادی اماں کی آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی عینک اور سینے پر ونے کی ٹوکری بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ کیے گئے ہیں۔ میں یہ بھی لکھ چکی ہوں کہ روس میں یسکن کے گھوڑے کی ایال کو جس چوٹی کنگھے سے سنوارا جاتا تھا وہ کنگھا بھی محفوظ ہے۔ جس زمانے میں ہمارے ترقی پسندوں نے ہر پرانی چیز کو منسوخ کیا، اس وقت تک شاید ان میں سے کوئی بندہ روس نہیں گیا تھا۔

چنانچہ عزیز بانو کا مکان بھی لکھنؤ کے چند اور مکانات کی طرح National Heritage میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کو ضرور یہ رائے دیتی مگر وہ خود ہی غائب ہو گئیں۔

ہر مہد کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اپنی دیوالا اور اپنی شناخت۔ عزیز بانو کے مہد کی کڑیاں میر انشاء، مرزا شوق اور میر باقر علی داستان گو کے ادوار سے مربوط تھیں۔ بانو کا مکان عزیز منزل اور ان کا محلہ گویا اب تک 'فسانہ آزاد' میں شامل تھا۔ بانو اور ان کے اہل خاندان کی اردو اور اس کا لب و لہجہ ابھی تک خالص لکھنوی رہا ہے۔ یہ لکھنؤ والے لفظ قسمل خانہ کو بے حد میسب سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ان کے بہت سے محاورے اور رد و مزمرہ 'فسانہ آزاد' کے مکالمے کی یاد دلاتے ہیں۔ جب ٹرین لکھنؤ چار باغ اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو پلیٹ فارم پر اترتے ہی آپ کو فوراً یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ سرشار کا لکھنؤ آج 125 سال بعد بھی موجود اور بارونق ہے۔ امین آباد میں شاید اب بھی شام کے وقت چورن بیچنے والوں کی گولی اندر دم باہر جیسی دلچسپ صدائیں سنائی دے جائیں۔ میں نے پہلے بھی کہیں لکھا ہے کہ ابھی چند سال قبل ہی ایک صاحب جو علی گڑھ سے گئے تھے، انہوں نے امین آباد میں ایک ہندو دکاندار کو اپنے نوکر سے کہتے سنا 'خیر روشن کر دو۔ یعنی وہ اب بھی موسمِ ہتی جلا دو نہیں کہہ رہا تھا۔ ہماری چھامانی ہجرت کر کے پاکستان گئیں تو جب وہ ملازم سے کہیں کہ دسترخوان بڑھا دو یا آج میں نے اپنی نیلی چڑیاں بڑھا دیں تو یہ محاورے اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

لیکن عزیز بانو ابھی تک اسی کلچر ایریا میں موجود ہیں۔ زبان ایک ایسی غیر مرئی خیالی اور

موہوم شے ہے اگر رہے تو صدیوں تک زندہ رہے اور ترک کر دی جائے تو غائب۔ جیسے معر قدیم کی قبیلے میں پہلے یہ بھی ذکر کر چکی ہوں کہ آج سے 20 سال قبل تک مراد آباد کے گلی کوچوں میں جوانہائی و نشیمن بائیں اور مرصع عوامی زبان سننے کو ملتی تھی، وہ اب غائب ہو چکی۔ وہ زبان بولنے والے اچانک کہاں چلے گئے۔ یہ ایک بہت ہی ڈراؤنی بات ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ صاحب آپ نے زبان دانی کو اتنا بڑا بکھیرا کیوں بنالیا ہے، تو بھی آپ کسی انگریز سے پوچھیے کہ وہ آکسفورڈ اور کیمرج کی انگلش کو اپنا معیار کیوں مانتا ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے وہ بھی انگریزی لہجے کے معیار کو بھول جائے۔

مطلب یہ کہ ایک انٹنی (Anty) کلچر رو یہ آج کا فیشنل رویہ ہے اور عزیز بانو وقا جیسے لوگ جو اس معیاری نکسالی اردو کے رکھوالے تھے، وہ اٹھتے جاتے ہیں:

سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی



## ایک اہم اسکالر

(ڈاکٹر رفیق زکریا)

لیجیٹ صاحب ڈاکٹر رفیق زکریا بھی گئے۔ فیض احمد فیض نے کہا تھا:

جئے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بھگے گئے ہیں

جئے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سرشام بھگے گئے ہیں

بہنکی کی یہ بساط یاراں ایک منفرد شان رکھتی تھی۔ شہر مہاراشٹر دالوں کا، پیسہ گجراتیوں کا

جن میں ہندو، جین، مسیحی، خوب جے، ڈہرے، مارا ماری ساؤتھ انڈین، بنگالی اور بولی والے

(جنہیں عام طور پر بھیا کہا جاتا ہے) سبھی شامل ہیں۔ چونکہ یہاں مراٹھی اور گجراتی زبانوں کا اردو

سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے لہذا اردو بھی خوب بھل پھول رہی ہے۔ بہنکی کی میونسپل کارپوریشن سارے

شہر میں سوا سو کے قریب اردو اسکول چلاتی ہے۔ بولی اور بہار سے آئے ہوئے مسلمان یہاں

مذہب سے آباد ہیں۔ ان کی ایک خصوصی بہیا اردو کلچر بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ محرم کے زمانے

میں دھوم دھام کی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں جن میں لکھنؤ کے علاوہ ایرانی کلچر کا اثر بھی غالب ہے

کیونکہ یہاں کافی ایرانی بھی مرصے سے آباد ہیں۔ ایک مرتبہ عصمت آپا کو خیال آیا کہ یہ سب محرم کی عزاداری وغیرہ کیا معاملہ ہے؟ اسے معلوم کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے کالی ساڑی اور کالا بلاؤز زیب تن کیا اور مجلسوں میں جانے لگیں۔ ایک بار میں بھی ان کے ساتھ گئی۔ شہر کے گنجان محلوں میں جہاں میاں بھائی رہتے ہیں، عصمت آپا بے حد مقبول ہو گئیں اور ان کی دین داری کی بڑی شہرت رہی۔

ایسی ایک مجلس کے لیے میں نے ایک نامور دھر پد سنگر جو بمبئی آئے ہوئے تھے، ان سے کہا کہ وہ وہاں چل کر موز خوانی کر دیں۔ چنانچہ اس محفل کی صدارت کے لیے ڈاکٹر رفیس ذکر کیا کو مدعو کیا گیا۔ انھوں نے وہاں موقع کی مناسبت سے شہادت امام حسین پر تقریر کی۔ تب مجھے خیال آیا کہ ایک ماہر سیاست داں کے پاس ہر موقع پر ہر فرقے اور ہر تنظیم کی مناسبت سے اپنا اشاک موجود رہتا ہے اور عوامی رابطے کا فن لطیف بھی اسی کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی قابلیت کے لحاظ سے ایک مرکزی وزیر ہونا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں ایسا نہ ہوا:

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

ڈاکٹر صاحب نے بھی شاید آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھا تھا۔ بمبئی آکر وہ بطور انگریزی صحافی مشہور ہوئے۔ کوئے صحافت سے سیدھا راستہ میدان سیاست تک جا پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر ذکر یانے بھی بمبئی ہائی کورٹ میں قانون کی پریکٹس ترک کی اور سیاست میں آ گئے۔ وہ ایک نہایت قابل ذکر مورخ بھی تھے۔ انھوں نے سلطان رضیہ کے بارے میں انگریزی میں ایک تاریخی ناول لکھا جو بیچ بیک میں شائع ہوا۔ اس ناول میں چند لوگوں نے سلطان رضیہ اور اندرا گاندھی میں مشابہت تلاش کر لی۔ بہر حال ڈاکٹر ذکر یا ایک اہم اسکالر اور مورخ تھے۔ وہ ماہر تعلیم بھی تھے۔ انھوں نے شہر بمبئی میں متعدد داروہ اسکول قائم کیے اور مہاراشٹر کالج کے صدر بھی رہے۔ ان کی بیگم فاطمہ نے الشریف دیکنی آف انڈیا کی انتظامیہ میں بہت اہمیت حاصل کی اور وہ کئی سال تک 'آئی وٹھی' کے فرضی نام سے بچوں کا صفحہ بھی مرتب کرتی رہیں۔ دیکنی کے نئے ایڈیٹر نے مزید ذمہ داریاں بھی انھیں سونپیں۔ ان سے قبل کی 'آئی وٹھی' پارسی یا انگریزی

خواتین رہی تھیں۔

انہیں دنوں اتفاق سے اندرا گاندھی بھی سیاسی اسٹیج پر جلوہ گر ہوئیں۔ مجھے اس زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ شاہ ایران مع شاہ بانو بمبئی آنے والے تھے۔ سرگاندھی وزیر اعظم تھیں۔ نواب علی یادر جنگ مہاراشٹرا اسٹیٹ کے گورنر تھے۔ ان کی بیگم ایک ایرانی نژاد خاتون تھیں، جنہوں نے حال ہی میں اپنے ہم وطن ڈپلومیٹ شوہر سے طلاق حاصل کر کے نواب صاحب سے عقد کیا تھا۔ نواب علی یادر جنگ کی والدہ طیبہ بیگم ہندوستان کی پہلی مسلمان گرجا بھوت خاتون تھیں جنہوں نے علی گڑھ سے شاید 1907 میں بی اے پاس کیا تھا (بریکٹیل تذکرہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ حیدر آبادی بیگمات نہایت مدبغ ہوتی ہیں اور ان کے مرد سیدھے سادے) سر اندرا گاندھی نے مشورہ دیا کہ بمبئی میں شاہ بانو کی پذیرائی کے لیے بیگم علی یادر جنگ سوچ رہی ہیں۔ اس وقت بیگم فخر الدین علی احمد ہندوستان کی فرسٹ لیڈی تھیں۔ چنانچہ بیگم عابدہ احمد جو علی گڑھ کے سلطان حیدر جوش کی صاحبزادی ہیں اور بیگم علی یادر جنگ اور مہاراشٹرا اسٹیٹ کے وزیر صحت رفیق زکریا کی بیگم فاطمہ زکریا ان تینوں بیگمات نے مل کر شاہ بانو ایران کی پذیرائی کی۔ ان تینوں میں پہلی دو خواتین بالکل اصلی تے وڈی بیگم صاحبہ تھیں جبکہ فاطمہ جمہوریت پسند بمبئی کی ایک سین پٹی نہایت مستعد و رنگ و دھن اور جرنلسٹ کی حیثیت سے مزاجاً مختلف تھیں۔ بمبئی کے تجارت پیشہ فرقوں کی اجتماعی نفسیات شمالی ہند کے فیوڈل بیک گراؤنڈ والے لوگوں سے یکسر مختلف ہے اور بنگال کے نواب زادوں کا کیا کہنا۔ جنرل اسکندر مرزا جو ایک زمانے میں مرزا اسکندر علی بیک کہلاتے تھے اور انڈین پولیٹیکل سروس میں نامزد ہونے کے بعد شاید بحیثیت کلکٹر ضلع علی گڑھ میں بھی مقیم رہے تھے، جہاں ان راقم الحروف کے والدین سے ان کا بہت میل جول تھا۔ اس کے بعد بھی والد مرحوم جب بھی کلکتہ سے کلکتہ جاتے تھے تو مرزا صاحب کے یہاں قیام کرتے تھے لیکن اب فلک حقہ باز نے اپنا حقہ پیچے پیچے ایک قلابازی کھائی تھی۔ موجودہ بیگم اسکندر مرزا پہلے ایران کے ایک جوئیز سفارت کار کی اہلیہ تھیں اور ان سے طلاق لے کر جنرل مرزا سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ واقعی بہت شاندار اور حسین خاتون تھیں لیکن فرد مجسم۔

رقص زمانہ ہوا سے باتیں کرتا جا رہا ہے۔ ابھی بہت طویل عرصہ نہیں گزرا لیکن وہ سب خواتین و حضرات جو اس میز پر اس شام موجود تھے کہاں گئے؟ ایک پرانے فرانسیسی گیت کے بول ہیں: کہاں ہے پچھلے برسوں کی برف۔ ایران کا تختہ ہی الٹ گیا۔ زمانے کے دیو نے تخت طاؤس کے نیچے سے قالین کو بہار کھینچ لیا۔ ادھر ایسٹ پاکستان کی جگہ بنگلہ دیش نمودار ہوا۔ بھانت بھانت کے انسانوں کی آمد و رفت بھی دنیا میں جاری رہی۔ وقت کے ہائیکوپ میں تصویریں بدلتی رہیں:

آئی ہوں میں آئی ہائیکوپ لائی  
بارہ من کی دھوبن دیکھو  
آگرے کا تاج محل دیکھو  
دہلی شہر کا قلعہ دیکھو  
اور بمبئی شہر کی بہار دیکھو  
گھر بیٹھے سارا سنسار دیکھو  
چہرہ بھینکو اور تماشہ دیکھو  
چہرہ نہ ہو تو ادھار دیکھو

ہائیکوپ والا اپنا ڈبہ کندھے پر اٹھائے ہائیکوپ کی صدا لگاتا گاؤں گاؤں گھومتا تھا اور اتنی دو آہنی تماشائیں سے لے کر انہیں میر جین سے محفوظ کرتا تھا۔ زندگی کتنی آسان اور سادہ تھی۔ اب گاؤں گاؤں ٹیلی ویژن لگ گئے اور ہائیکوپ والا غائب ہو گیا لیکن وقت کا تماشہ گرا اپنے کام میں مصروف ہے۔ آج کے اخبار (مورخہ 10 جولائی 2005ء) کی خبر ہے کہ 85 برس کی عمر میں ریفی ذکر یا بھی گئے۔ فاطمہ شاید دانشمنین ہی میں رہتی ہیں جہاں ان کا ایک بیٹا ہندوستانی امور کے لیے صدر بٹش کا مشیر خاص ہے۔

وارڈن روڈ بمبئی کے آشامعل کے گراؤنڈ فلور فلیٹ میں فاطمہ اپنے بھائی بھادج کے ساتھ رہتی تھیں اور یہیں سے وہ کچھ عرصے کے لیے ازاہلا تھوہرن کا لچ لچتی تھیں۔ وہاں سے واپسی پر ریفی ذکر یا سے ان کی شادی ہوئی۔ فاطمہ اور ان کے بھائی کے اس فلیٹ سے جانے کے بعد



راقم الحروف نے اسے کرایہ پر لیا تھا۔ اس کے مالک کراچی سے آئے ہوئے ایک سندھی ہندو مشر شرنگی تھے، میں اٹھارہ سال اس کلیٹ میں رہی۔

کمال لال کا خوشنما علاقہ تھا اور آشاکل ذرا سی او مچائی پر واقع تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر Aqua Mareen نامی ایک اور رہائشی عمارت ایسا دہ تھی۔ اس کی چوتھی منزل پر میجر محمود حسین اور ان کی بیگم ثریا اور بچے مقیم تھے۔ میجر صاحب پٹن صوبہ گجرات کے ایک قدیم خاندان کے سید زادے تھے۔ وہ پنڈت نہرو کے ملٹری اسٹاف پر رہ چکے تھے اور اپنا یاد نامہ لکھنے میں مصروف تھے۔ بہت ہی کم گوشتین اور نہایت ثقہ انسان تھے۔ ثریا کے چچا سکندر خان دہلوی پرانے آئی سی ایس اور پاکستان کے ایک عالی مرتبت افسر تھے۔ ان کی بیوی فریج تھیں۔ جس زمانے میں ایس کے دہلوی صاحب حکومت مشرقی پاکستان کے چیف سکرٹری تھے، اپنی شادی سے قبل ثریا ان کے یہاں ڈھاکہ ہو آئی تھیں۔ میں موصوفہ کا تذکرہ پہلے بھی کر چکی ہوں۔ چونکہ وہ ایک بہت ہی قابل ذکر خاتون تھیں۔ کانوینٹ اسکول کی تعلیم یافتہ، شہسواری اور ہال روم ڈانس کی ماہر لیکن اس کے ساتھ ہی بیروں اور فقیروں کی بے انتہا عقیدت مند۔ ایک بار وہ مجھے اپنے ساتھ ایک درگاہ پہ لے گئیں اور اپنے کسی جائیداد کے مقدمے کے سلسلے میں رورڈ کر صاحب حزارے سے بڑبانا انگریزی اپنی روداد بیان کرتی رہیں۔ وہ ایک ایسی خاتون تھیں کہ ان کے بارے میں پورا ایک مضمون علاحدہ سے لکھنا چاہیے۔ ان کی بیٹی شیم نے لندن میں ایک انگریز نوجوان سے شادی کر لی جس کے چچا برطانوی پارلیمنٹ کے ایک نامور ممبر تھے۔ ثریا نے مجھے وہ تصویر دکھائی جس میں شیم انگریزی لباس اور بڑی پکچر ہیٹ پہنے ہاتھ میں گلدستہ لیے کھڑی ہے۔ ساتھ ہی اس کا شوہر اور اس کا سارا خاندان۔ سامنے اس کا اور اس کے پہلے شوہر کا بچہ بھی گلدستہ لیے موجود ہے۔ اس تصویر سے مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کا فرق بھی معلوم ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر رفیق زکریا کی پہلی بیگم شہناز بھوپال کی ایک نہایت حسین و جمیل خاتون تھیں لیکن شادی کے چند سال بعد وہ ڈاکٹر صاحب سے طلاق حاصل کر کے کراچی چلی گئیں جہاں انھوں نے ہم لوگوں کے ایک بہت پرانے لکھنوی فیملی فریڈ وک کمانڈر ڈاکٹر مشرف علی سے نکاح کر لیا۔

ڈاکٹر علی کے بڑے بھائی اشرف علی مشہور کیونٹ لیڈر تھے۔ شرف ایک بہت ہی خوش مزاج اور اچھے سُخاؤ والے آدمی تھے۔

ادھر آ شامل نور دجی گماڈیاروڈ کا نمبر 2 گراؤنڈ فلور فلیٹ قاطعہ ذکر کیا کے بھائی حید ستار کے جانے کے بعد اس فلیٹ کے سندھی مالک سے راقم الحروف نے کرایہ پر لیا۔ (جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے) اس فلیٹ کے در پہلوں سے مٹھی بھر سمندر نظر آتا تھا۔ سچ میں ایکو امرین کی رہائشی عمارت اور اس کی ڈھلان پر وارڈن روڈ، اس کے بعد مفت لال پارک سمندر تک جانے کے راستے میں حائل تھے۔ یہ سارا علاقہ بہت ہی خوش منظر تھا۔

وارڈن روڈ کو پیڑ روڈ سے ایک پتلی سی سڑک منسلک کرتی تھی۔ اس کا نام نور دجی گماڈیاروڈ تھا اور یہیں ایکو امرین اور آ شامل ایستادہ تھے۔ میجر محمود حسین کا وسیع و عریض فلیٹ ان کو آرمی کی طرف سے ملا تھا۔ ثریا کے یہاں ان کے سیکے اور سسرال کے عزیزوں کی آمد و رفت رہتی تھی لیکن ایک روز دیکھا کہ ایک انگریز کمزراں کے باورچی خانہ میں کھانا پکا رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے ڈانٹنگ روم میں آکر ہاتھ دھو کر کھانا سر دیا اور بڑی خوش دلی سے باتیں کرتا رہا۔ بعد میں ثریا نے بتایا کہ یہ صاحب محمود کے پرانے دوست ہیں۔ انھوں نے محمود سے کچھ رقم قرض لی تھی، وہ اوائی نہیں کر سکے تو انھوں نے کہا میں اس کے عوض میں لندن واپس جانے سے پہلے تمہارے یہاں چھ مہینے کھانا پکاؤں گا۔ چنانچہ وہ اصول پرست اور قول کا پکا انگریز ثریا کے یہاں باورچی گیری کرنے کے بعد لندن چلا گیا۔

ثریا کے چچا سکندر خاں دہلوی کے نام سے میں ان کو ہمیشہ دہلی والا سمجھا کرتی تھی لیکن اب جا کے معلوم ہوا کہ ان کا اصل خاندانی نام دلوئی تھا جسے انھوں نے دہلوی کر لیا تھا اور یہ دلوئی لوگ گجرات کے باشندے تھے اور میں نے اندازہ لگایا کہ چونکہ یہ عہد وسطی میں سلاطین دکن کے دل یعنی فوج میں رہے ہوں گے، اس لیے دلوئی کہلائے۔ دور حاضر میں بھی دلوئی لوگ بمبئی میں موجود تھے جن میں سے ایک حید دلوئی کا نام کسی سیاسی مناقشے کے سلسلے میں پریس کا ایک موضوع رہا۔ کچھ عرصہ بعد ثریا اور میجر محمود حسین اپنی اولاد سے ملنے انگلستان گئے اور وہیں دونوں نے

وفات پائی۔ ثریا یقیناً ایک غیر معمولی شخصیت رکھتی تھیں جنہیں کوئی باسانی فراموش نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جس زمانے میں قاطرہ اپنے بھائی بھادرج کے ساتھ نمبر 2 آشاکل میں مقیم تھیں اور کچھ عرصہ ازاہلا تصور بن کالج میں گزار آئیں تھیں۔ ایک روز وہ سماجی تنظیم کے جلسے کی صدارت کے لیے مدعو کی خاطر اپنی چند دوستوں کے ساتھ ڈاکٹر زکریا کے دفتر گئیں۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت تک اپنی بھوپالی بیگم سے علاحدگی اختیار کر چکے تھے۔ انھوں نے قاطرہ کے بھائیوں کے یہاں اپنا پیغام بھجوایا جو منقول کر لیا گیا۔

سیر زمانہ وقت کے ساحل پر اپنے نقش چھوڑنا جاتا ہے۔ زیادہ تر نقوش موجوں کی نظر ہو جاتے ہیں۔ ہمارے حاضر ماموں دہرہ دون کے جو ایک ملک التجار اور پلیڈیم سنیما کے کاسٹریکٹر تھے، ان کے فرزند اکبر خوجہ مظہر القیوم جو علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے، مجھے اور اپنے چھوٹے بھائی توفیق رفعت کو ایک کچر دکھانے لے گئے۔ یہ پہلی ہندوستانی فلم تھی جو میں نے دیکھی۔ اس کا ایک سین مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک بے حد فریب مس گوہر ساحل پر ریت کا گھر دندا بناری ہیں۔ بغیر آستین کا بلاؤز اور یہ فریبی۔ لیکن وہ رنجیت سنگھ کہنی کی آدھی مالک تھیں، انھیں ہیر دُن بننے سے کون روک سکتا تھا۔ اس زمانے میں بمبئی کی ایکٹرسوں کے نام کے ساتھ کس ضرور لگایا جاتا تھا۔ ان کی جو تصاویر شائقین کے لیے دکانوں پر ملتی تھیں، وہ چمکیلے ذروں سے مزین کی جاتی تھیں۔ ہیر دود پاری بھائی ای بی موریا اور ڈی بی موریا بہت مشہور تھے اور انھوں نے اپنے فرقے کے پاری تھیٹر کی روایت کو بولے سنیما کے دور میں گویا زعمہ رکھا تھا۔

پیڈر روڈ بمبئی کے ایک بیوٹی پارلر جس کا نام گلنار تھا، اس کی زرتشتی ایرانی مالکن خود کرپجین سائنس کی پیرو تھیں اور اپنی گاہکوں کے ہال تراشنے سے پہلے آنکھیں بند کر کے صدق دل سے دعا مانگتی تھیں۔ یہ بیٹھین بننے سے قبل وہ ایک مشہور ہجرت ناٹم رقاصہ کی حیثیت سے اپنے ٹروپ کے ساتھ آدھی دنیا کا دورہ کر چکی تھیں لیکن کبھی بھولے سے بھی اپنی سابقہ گیسٹس زندگی کا ذکر نہیں کرتی تھیں۔ نامور فلم ڈائریکٹر نریمان ایرانی ان کے بڑے بھائی تھے اور بمبئی کی مغربی طرز زندگی کے مطابق ایک مملوٹ بیوٹی پارلر تھا جہاں خواتین حضرات ایک دوسرے کا ٹوٹس لیے بغیر

خاموشی سے اپنے اپنے بناؤ سنگار میں مصروف رہتے اور اپنا کام ختم ہونے کے بعد اسی طرح چپ چاپ باہر چلے جاتے۔ بہنئ کی بسوں میں بھی زمانہ درجہ علاحدہ سے موجود نہیں ہے اور مرد اور عورتیں ایک ساتھ سیٹوں پر بیٹھتے ہیں۔ اس قسم کی مہذب اجتماعی طرز زندگی شمالی ہند میں ناممکن ہے۔ مغربی ساحل چار سو سال سے اقوام یورپ کا مسکن رہا ہے۔ لہذا یہاں کی آبادی پر پہلے یورپ سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ اگر آپ ہاندوہ یا ماتم کے صاف سترے گلی کوچوں میں نکل جائیں تو آپ کو وہاں پر نکال کی جھلک صاف نظر آجائے گی۔ بالخصوص کرسس سیزن میں جابجا عظیم الجثہ کاغذی ستارے آویزاں کیے جاتے ہیں جو اشار آف ڈیوڈ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ رات میں کیرل گانے والوں کی ٹولیاں سڑکوں پر گھومتی ہیں۔ شہر کے بعض محلے بہنئ کے پڑوسی علاقے گوا کی توسیع معلوم ہوتے ہیں۔ گوالنی بیرے اور خانساں عالمی شہرت رکھتے ہیں اور ساری دنیا کے قارئین اشار ہوتوں میں موجود ہیں۔ یہ جہاں رنگ و بودا قبی کس قدر حیرت افزا دیر انکی شو ہے۔ زمانے کا بوڑھا تماشا گرا پی پشت پر سیر بین کی گھڑی لادے قریب قریب اب بھی صدالگا تا پھر رہا ہے۔

گماڈیا روڈ کے دوسرے سرے پر پیڑ روڈ کے اس پار ایک سفید عمارت کے فلیٹ میں دن ٹھیکہ کر رہتی تھیں۔ یہ علاقہ بھی خوشنما منظر کہا لائل میں شامل تھا۔ دراصل پرانے زمانے میں متعدد سرسبز جنگی پہاڑیوں پر مشتمل یہ علاقہ ایک گھٹا جنگل رہا ہوگا۔ یہیں پر حاجی علی کی درگاہ سمندر کے ایک ٹاپر پر واقع ہے، جہاں تک جانے کے راستے پر صبح سے شام تک ہندو مسلمان زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ سمندر کا پانی جوار بھاتا کے دوران راستہ پانی میں غائب ہو جاتا ہے اور پانی اترنے کے بعد آمدورفت پھر شروع ہو جاتی ہے۔ درگاہ کے اس ٹاپو پر یسین فرے کی صحت گاہ بھی موجود ہے۔ اسی ساحل پر اور آگے جا کر حضرت مخدوم ماہی کی درگاہ بھی ایک بڑی زیارت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت مخدوم ماہی رسول اللہ کے تنج تابعین میں سے تھے اور غالباً اولین بزرگوں میں شامل تھے جو اسلام کے دور اول میں ہندوستان تشریف لائے۔

ہندوستان کیا عجیب و غریب ملک ہے کہ درگاہوں پر مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی بھیڑ بھی موجود رہتی ہے لیکن ان ہی درگاہوں کے سامنے والی سڑکوں پر فساد بھی پھوٹ پڑتے ہیں اور

دونوں فرقوں کے لوگ چھرے بازی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ بمبئی کے نزدیک کی مشہور ترین درگاہ کے منتظمین ایک ہندو خاندان کے افراد ہیں۔ ایک بار میں ثریا کے ساتھ وہاں گئی تو دیکھا تو گزری ساڑیاں پہنے نہایت شاندار گوری چٹی دوسرے خواتین کچھوں کا کچھا سنبھالے نمودار ہوئیں، درگاہ کا دروازہ کھولا اور دوسرے انتظامات میں مصروف ہو گئیں۔ واقعی عجیب ملک ہے صاحب! جو انگریز امریکن وغیرہ یہاں آکر اس دلش کے متعلق کتا ہیں لکھتے ہیں۔ جب ہم خود اسے نہیں سمجھ پائے تو بھلا یہ لوگ کیا سمجھیں گے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا ساحل کوکن کے باشندے اور فاطمہ بھی مین یعنی دونوں گجرات اور مہاراشٹر کی مسلم تہذیب سے تعلق رکھنے والے اور شمالی ہند کے عمرانی علاقے سے مختلف لیکن اردوان کی بھی ایک مشترکہ زبان تھی حالانکہ فاطمہ کی مادری زبان گجراتی اور رفیق زکریا کی کوکنی مراٹھی۔ انگریزی دراصل سبھی کی مشترکہ میراث رہی۔ مغرب کے نوآبادیاتی تسلط نے مشرقی تاریخ کی کاپیا پلٹ دی۔ مغربی ساحل پر یونان قدیم اور عہد وسطی کے عرب جہازرانوں کی آمدورفت کی وجہ سے ایک نیا قلعہ کچھ پیدا ہوا۔ مغلوں کے زوال کے دور میں ان کے جاں نشین مرہٹوں نے مغل کچھراسی طرح اختیار کیا جیسے ان کے بعد ہندوستانوں نے انگریزی طور طریق قبول کیے۔ مراٹھی زبان میں آج تک بیس فیصدی الفاظ عربی اور فارسی کے موجود ہیں۔ ان کا ڈرامہ تماشا کہلاتا ہے۔ بمبئی کے عوام بھی اٹھ سے کو بیدا کہتے ہیں یعنی بیٹہ۔ مراٹھی رقاصائیں نمسکار کے بجائے مغلیہ انداز میں کورنکس بھالاتی ہیں۔ یہ ایک تاریخی اور عمرانی حقیقت ہے کہ دو مختلف قومیں یا فرقے تمدنی لحاظ سے ایک دوسرے کے بہت نزدیک ہوں، ان ہی کے مابین جھگڑا اور مخالفت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ہم کسی سے لڑنے جھگڑنے کو یا نہیں جانتیں، اپنے پڑوسی ہی سے لڑیں گے۔

(راشٹریہ سہارا، مانگ، 17 اگست 2005ء)

حواشی:

1. بنگال کے نواب میر جعفر جنرل اسکندر مرزا کے جد امجد تھے۔ جعفر از بنگال، صادق از دکن



## جھونپڑے کا خواب دیکھنے والی

(رشید جہاں)

خواتین و حضرات! 1857 عیسوی کے بعد اردو نے عہد جدید کے ایک اہم نقیب کا رول ادا کیا اور ہمارے یہاں زیادہ تر ہندوستان کے دوسرے لسانی طبقات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ عورتیں اردو ادب کی ترویج و ترقی میں اپنی سماجی پابندیوں کے باوجود ادب اور صحافت کی دنیا میں کبھی پیچھے نہیں رہیں۔ انھوں نے رسالے نکالے، کتابیں شائع کیں اور بالخصوص ناول نویسی کے میدان میں اپنی دھماک بٹھادی۔ وہ یہ Male Chauvism یعنی مراد نہ احساس برتری کے زیر اثر ان کے تخلیق کردہ لٹریچر کو پروفیسر و کار عظیم جیسے اہم نقاد نے ادنیٰ درجے کا ادب کہا۔

رشیدۃ النساء بیگم کے زمانے سے خواتین نے ناول نگاری شروع کی اور اکبری بیگم والدہ افضل علی مصنفہ 'گودڑ کالال' کے دور سے لے کر آج تک گزشتہ سو سال میں ان گنت ناول خواتین نے لکھے جن میں اے آر خاتون کی تعریف 'شع' جیسے ناول بے انتہا مقبول ہوئے۔ مگر آنگن کی

تصویر کشی خواتین سے بہتر کون کر سکتا تھا لیکن لکھنے والیوں نے اپنے قلم کو اپنی انگلی کی تک ہی محدود نہیں رکھا۔

حجاب امتیاز علی نے ایک فنی کی دنیا تخلیق کی۔ دراصل ان کے خاندان کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا لیکن ان کی اپنی پرورش مدراس میں ہوئی اور کلکتہ، بمبئی، مدراس یہ تین پریذیسی ہاؤس ایسٹ انڈیا کمپنی نے آباد کیے تھے اور یہاں کی کلچر ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے مختلف تھی۔ علاوہ ازیں حجاب نے ایک منفرد خیالی معاشرہ تخلیق کیا جس میں ان کی دادی مادام زبیدہ طعام شب سے پہلے لباس تبدیل کرتی تھیں۔ اردو کے قارئین اس اجنبی اور انوکھی طرز زندگی کی تصویر کشی سے مسحور ہوئے۔ میری والدہ کی حجاب سے دیرینہ خط و کتابت تھی۔ جب وہ بحیثیت مس حجاب اسٹیل مدراس میں رہتی تھیں۔ والد مرحوم علی گڑھ یونیورسٹی کے پڑھے چھپوانے کے لیے اس طرح مدراس جاتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ پڑھے کہاں، کس شہر اور کس پریس میں چھپوائے جا رہے ہیں۔ اسی دوران ان کی اور ان کے دوست سر محمد یعقوب کی ملاقات محمد اسٹیل صاحب سے ہوئی۔ سر یعقوب کے برادر نسبی امتیاز علی تاج ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں حضرات کے سلسلہ جنہانی کے بعد غالباً 1935 میں امتیاز بھائی سے مس حجاب اسٹیل کی شادی ہوئی۔ لاہور آکر بیگم حجاب نے پنجاب کے باشندے کے زیر عنوان ایک استہزائیہ مضمون بھی لکھا جو تہذیب نسواں میں شائع ہوا۔ ان کی ہم عصر رشید جہاں بالکل ایک مختلف طرز زندگی اور نظریہ حیات کی ترجمان تھیں۔ ان کے والدین شیخ محمد عبداللہ اور ان کی بیگم بانی مسلم گریڈ کالج علی گڑھ تھیں۔ شیخ صاحب کشمیر کے ایک نو مسلم اور بیگم صاحبہ دہلی کے ایک پرانے خاندان کی خاتون تھیں۔ یہ دونوں ہندوستان کی سماجی تاریخ میں اپنا نام کر گئے۔ ان کی بیٹی ممتاز جہاں اور خاتون جہاں ماہر تعلیم تھیں۔ تیسری بیٹی خورشید جہاں مرزا نے ایک مختلف قسم کی پیش قدمی کی۔ انھوں نے بمبئی ٹائیکز کی فلم جیون پر بھات میں 1937 عیسوی میں ایک مختصر رول ادا کیا۔ اس کے بعد فلم بھائی اور نیا سنسار میں بطور رینو کا دیوی ہیروئن بنیں۔ 1947 عیسوی میں اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان گئیں جہاں غالباً ان کی کوئی فلم تیار نہیں ہوئی۔ 1960-61 میں



علی گڑھ تشریف لائی تھیں جہاں ان سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی۔ اس وقت تک ان پر مذہبیت نہایت شدت سے طاری ہو چکی تھی۔ میں نے خورشید آپا سے اس ملاقات کا تذکرہ اپنے مضمون عبداللہ لاج کی ایک شام میں کیا ہے جو شاید آج کل میں چھپا تھا۔

زمانے کے سیر رواں کی لہر میں ساحل پر اپنے نشان چھوڑ جاتی ہیں لیکن وہ نشان بھی بہت جلد معدوم ہو جاتے ہیں۔ آج کی نسل ندرینو کا دیوی کو جانتی ہے نہ ان کے ظلم نیا سنسار کا نام کسی نے سنا ہے اور اس کا گیت جو شاید خورشید آپا نے اپنی ہی آواز میں گایا تھا:

ایک نیا سنسار بسا لے ایک نیا سنسار

جنتا کا ہو راج جنت میں جنتا کی سرکار

یہ شہید آئینہ لزم قلم کی کہانی کے مصنف خواجہ احمد عباس کے خیالات کی ترجمان تھی۔ وہ اسی آئینہ لزم کا دور تھا لیکن اس کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ خورشید آپا اور ان کی نسل کے متعدد افراد اس جہان فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔

رشیدہ آپا مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ وہ میری والدہ کے پاس اکثر نمبر 21، فیض آباد روڈ آیا کرتی تھیں اور میں بھی ان کے یہاں جا چکی تھی۔ وہ شاید نظیر آباد میں سڑک کے کنارے بنے ایک معمولی مکان میں رہتی تھیں۔ کہاں وہ دہرہ دون کا کنٹری ہاؤس اور کہاں یہ مکان لیکن اپنا یہ کنٹری ہاؤس انھوں نے پارٹی کو بخش دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک روز میں نے دیکھا وہ موٹی کھردری خاکی رنگ کی اون سے سوئٹرنٹی موٹی ٹل برج پر پیل آر ہی تھیں۔ ایسی سادہ اور ہر قسم کے تصنع سے بے نیاز زندگی کم لوگ ہی گزار سکتے ہیں۔ رشیدہ آپا، محمود الفطر، سجاد ظہیر ان منتخب روزگار لوگوں میں سے تھے جنھوں نے محلوں میں رہ کر جمہوریتوں کے خواب دیکھے۔

ایک دن وہ والدہ سے ملنے ہمارے یہاں آئیں اور انھیں کسی تقریب میں ملنے کے لیے کہا۔ والدہ نے جواب دیا کہ اس روز حضرت علی کا یوم شہادت ہے۔ مجھے ایک مجلس میں جانا ہے۔ رشیدہ آپا نے کہا ”وہ کون صاحب تھے؟ میری ان سے ملاقات نہیں۔“ اماں نے ڈپٹ کر جواب دیا ”رشیدہ تم مجھ سے باؤلی باتیں مت کیا کرو۔“ مجھے ان دونوں کا یہ مکالمہ لفظ بہ لفظ یاد ہے۔

رشیدہ آپا بغرض علاج ماسکونگی تھیں۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ میں اس زمانے میں لندن میں تھی۔ ایک روز شکستہ اور انور جمال قدوائی کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ جب محمود ان سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ وہ رشیدہ آپا کی وفات کے بعد ماسکو سے لندن آئے تھے۔ محمود کی ساری تعلیم و تربیت اعلیٰ درجے کے برطانوی طریقے سے ہوئی تھی۔ جب وہ اردو بولتے تھے تو لگتا تھا کہ وہ برٹش طرز گفتگو کے غیر شعوری طور پر اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرتے جا رہے ہیں۔ ان کے والد صاحبزادہ سعید انظر خان نواب رام پور کے شاید فرسٹ کزن تھے لیکن محمود انظر نے اپنے آپ کو اس نوابی سلسلے سے بالکل بے نیاز کر رکھا تھا۔

رشیدہ آپا بہر حال ایک بہت ہی غیر معمولی نہایت شفیق اور وضع دار خاتون تھیں۔ بحیثیت کیونٹ ان کے قول و فعل میں کبھی کوئی تضاد نہیں دیکھا گیا۔ وہ ایک ایسی خاتون تھیں جنہیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

وہ انکارے کے مصنفین میں بھی شامل تھیں۔ اس زمانے میں اس کتاب پر بہت لے دے ہوئی۔ اس کے بعد بھی انھوں نے چند افسانے لکھے۔ اُن کے افسانے بھی سماجی بقاوت کے قریب تھے۔ یہی زمانہ یعنی 1930 عیسوی سے لے کر 1939 عیسوی تک کا دور انگلستان میں Pink Decade کہلایا اور اس کے ترجمان Leftwing Intellectual پکارے گئے۔ ملک راج آنند اور سجاد ظہیر وغیرہ کے زیر اثر ہندوستان کی دانش گاہوں کے نوجوان بھی بائیں بازو کے دانشور بنے۔ اسکاٹ لینڈ کے سرمایہ داروں نے ہندوستان میں قبوے کی کاشت کو فروغ دیا اور بڑے شہروں میں کوئی ہاؤس کھولے گئے جن کی بدولت ایک نئی ذہنی اور ثقافتی ماحول کی تخلیق ہوئی۔ گویا اس نئی Intellectual فضا کے پس منظر میں برطانوی سرمایہ داری کا فرما تھا۔ اس فضا نے بہر حال ہندوستانی ادب میں زندگی کی نئی لہر دوڑادی۔ سماجی فیشن بھی بدل گئے۔ پہلے بڑے شہروں میں اکاؤنٹنٹس تھے جہاں شرفا شاذ و نادر ہی جاتے تھے اور خواتین کا تو این ریسٹورانوں میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، لیکن اب اس نئی کوئی ہاؤس کلچر میں کالج کی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ گویا اب بھی وہ خواتین کے علاوہ گوشے میں بیٹھتی تھیں۔

آزادی کے بعد پنجاب سے آئے ہوئے نوجوان نے گورنمنٹ کالج اور ایف سی کالج لاہور کی فضا یہاں تخلیق کی۔ رشیدہ آپا بھی لکھنؤ کی اس نئی فضا میں نئی نسل کی قیادت کرتی رہیں۔ سلام پھلی شہری نے ایک جگہ لکھا ”رشیدہ آپا Brule Force بنی ہوئی ہیں۔“ یہ دراصل اس زمانے کے انگلش فلم کا نام تھا جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے۔ وہ مرحومہ ترقی پسند ادیبہ نمایاں رہیں۔ ان کے والد خان بہادر سید رضا حسین اجیر کے ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور وہ بھی ہماری والدہ کے ایک منہ بولے بھائی تھے۔ رضیہ آپا کالج کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور رضیہ دلتاد کے نام سے زمانہ رسالوں میں مضامین بھی لکھتی تھیں۔ اصرہار عے والدین کے ایک اور بہت قریبی دوست سید وزیر حسن اور ان کی بیگم اپنے بیٹے سجاد ظہیر عرف بٹے میاں کی طرف سے بہت گہرا منہ تھے کیونکہ یہ حضرت اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے آئے دن جیل جانے پر تلے رہتے تھے اور لاوی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ چاہتے تھے۔ حالانکہ ان کے اپنے خاندان میں چند گرجوینٹ لڑکیاں موجود تھیں لیکن بہر حال غالباً 1938 عیسوی میں بنے بھائی کی شادی رضیہ آپا سے ہو گئی۔ منگنی کی رسم کے لیے مٹھائی وغیرہ کی سینیاں نہایت مرصع خوان پوش سے ڈھکی ہمارے یہاں سے ہی دزیر منزل بھیجی گئی تھیں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی بنے بھائی جیل چلے گئے۔

چنانچہ بنے بھائی اور رشیدہ آپا وغیرہ کا یہ گروپ میری یادداشت میں اچھی طرح محفوظ ہے۔ اسی زمانے میں مجاز سموری ٹوپی اوڑھے، الکیوں میں جلتا ہوا سگریٹ، لکھنؤ میں اپنے مکان قصر سراج سے ٹھٹکتے ہوئے ہمارے گھر نمبر ۹، رائے بہاری لال روڈ آئے اور اپنی نئی کتاب ’آجک‘ والد مرحوم کو پیش کی۔ وہ ترقی پسند تحریک کا دور اولین تھا اور بڑی گہما گہمی کا زمانہ۔ بقول مشتاق احمد زاہدی یلدرم ایم اے ادا کالج کے دور سے ترقی پسند اور آزادی نسواں کے جو شیلے حای رہے تھے۔ وہ موجودہ دور کے انتھائی نوجوانوں کو بھی بہت پسند کرتے تھے اور ترقی پسند تحریک کے متعلق انھوں نے لکھا تھا:

صد شکر از سہی کنو جواناں یک کسر ادب خلد ست تغیر

ایم اے ادا کالج میں ان کی چند تجاویز بہت ہی حیرت انگیز تھیں۔ مثلاً یہ کہ کرسیوں پر بیٹھ

کر جوتوں سمیت نماز ادا کی جائے وغیرہ۔ اردو ٹائپ کے فروغ کے بھی وہ خواہاں رہے۔ 1924 عیسوی میں جب وہ دوبارہ ترکی گئے تو وہاں سے انھوں نے اپنی خواہر نسیتی ثروت آرا بیگم کے نام دو بچہ پوسٹ کارڈ بھیجے جن پر بے پردہ ترک خواتین کی تصویریں چھپیں تھیں اور ان کے پیچھے والد مرحوم نے لکھا ”محبوس خواہراں ہند کے لیے ترک خاتون کا سلام۔۔۔“

1920 عیسوی سے 1928 عیسوی تک مرحوم علی گڑھ میں رجسٹرار رہے۔ وہ بھی ایک نہایت دلولہ خیز زمانہ تھا جبکہ ایک خاتون یعنی نواب سلطان جہاں بیگم اس یونیورسٹی کی چانسلر تھیں۔ ہمارے اہل قلم اور صحافی اپنے یہاں کے معاملات اجاگر کرنے کے سلسلے میں خاصے بے نیاز ہیں۔ آج کے ہندوستان میں نواب سلطان جہاں بیگم کا نام بھی بہت کم لوگوں نے سنا ہوگا۔ ایک مسلمان کی چار بیویاں ہوتی ہیں اور ہر مسلمان عورت پردے کی بوبو ہے۔ یہ اس فرقے کے متعلق ایک عام تصور ہے اور اب مسلمانوں کو باضابطہ ایک بیک ورڈ کیونٹی پکارا جاتا ہے اور اخبارات اسے سیڈول کاسٹ کے ساتھ بریکٹ کرتے ہیں۔ سیاں بھائی اپنے اس انجی سے بھی نہایت مطمئن ہیں۔ ایک اور عجیب و غریب معاملہ یہ ہے کہ اکثر اس فرقے کی لڑکیاں جب بہت زیادہ آزاد ہوتی ہیں تو قلم ایکٹریس بن جاتی ہیں یعنی یا پردے کی بوبو یا فلم اسٹار، درمیانی راستہ کوئی نہیں ہے۔ اس کے برعکس ملک کے دوسرے فرقوں کی عورتیں اس انتہا پسندی کا شکار نہیں ہیں۔

اس صدی کے اولین برسوں میں پردے کی شدت سے عاجز آ کر کچھ لڑکیوں نے راہ فرار اختیار کی اور وہ عیسائی ہو گئیں۔ چنانچہ بطور رد عمل بہت سے گھرانوں میں قید و بند کو زیادہ شدید کر دیا گیا۔ میرے خیال میں ہندوستان کے زنانہ اردو پریس نے اس اندوہناک صورت حال میں ایک نہایت مثبت رول ادا کیا۔ محسب العلامہ مولوی ممتاز علی نے لاہور میں اور علامہ راشد الفخیری نے دہلی سے رسالے جاری کیے۔ شیخ محمد عبداللہ نے علی گڑھ میں اور جسٹس کرامت حسین نے لکھنؤ میں لڑکیوں کے لیے اسکول کھولے جس میں ایک بہت ہی جرات مندانہ اقدام یہ تھا کہ ان مدرسوں کے ساتھ زنانہ بورڈنگ ہاؤس بھی کھولے گئے اور روشن خیال مسلمانوں نے اپنی لڑکیوں کو وہاں بھیجا۔ آج کے آزادی کے دور میں ہم ایسی زنانہ اقامتی درس گاہیں قائم کرنے والوں کی

ہمت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ جو مسلمان اشرافیہ اپنے گھر کی ڈیوڑھی سے باہر قدم نکالنے کی لڑکیوں کو اجازت نہ دے، اس نے اپنے اپنے شہروں سے دور ایک انجینی شہر میں اپنی بیٹیوں کو بورڈنگ ہاؤس میں بھیج دیا۔ ہمارے یہ بزرگ کتنی ہمت اور حوصلے والے اور کتنے ہوش مند افراد تھے۔ لکھنؤ میں جب جنس کرامت حسین نے اسکول قائم کیا تو بیگم وزیر حسن اور راقم المعروف کی والدہ نذر سجاد حیدر ہر ہفتے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں جا کر وہاں کے باورچی خانے اور دوسرے انتظامات کا معائنہ کرتی تھیں اور ہماری والدہ نے بتایا کہ اس زمانے میں بھوپال سے بھی چند لڑکیاں بورڈنگ ہاؤس میں بھیجی گئی تھیں۔ بھوپال سے آئی ہوئی ان لڑکیوں میں سے ایک کی بڑی بہن کی شادی بیگم وزیر حسن کے فرزند اکبر سید علی ظہیر سے ہوئی اور چھوٹی بہن سعیدہ جنس محمد رضا کے صاحبزادے سید عباس رضا سے بیاہی گئیں۔

1938 عیسوی میں جب لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا، سعیدہ آپا اس میں عورتوں کے پروگرام کی انچارج مقرر کی گئیں۔ جنگل کشور امہراڈاکٹر تھے۔ یہ لاہور سے آئے تھے اور وہاں امتیاز بھائی وغیرہ کی کلوزی کے ایک رکن تھے۔ انھوں نے امتیاز بھائی کی فلم 'سہاگ' کا دان میں ہیرو کا ردل ادا کیا تھا۔ طویل القامت نہایت عمدہ پورے سوٹ میں ملبوس۔ اس زمانے میں محض پینٹ شرٹ پہننا بدتہذیبی سمجھی جاتی تھی۔ دوران جنگ میں امریکنوں کے زیر اثر بشرٹ کی بے تکلفی رائج ہوئی۔ لوگ بغیر ٹائی لگائے گھومنے لگے۔ زنانہ لباس میں محض ساڑی کا رواج تھا اور زیادہ تر مسلمان خواتین اور لڑکیاں غرارے پہنتی تھیں۔ لاہور کی بنی فلم 'خزانچی' (1941ء) انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔ اس فلم کی ہیروئن بھیمی کی ایک یہودی لڑکی رمولا تھی اور ہیرو نارنگ جو اس وقت لاہور میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک اور صاحب سر گوگل چند نارنگ اس زمانے میں آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے صدر تھے اور اردو میں بھی مضمون لکھتے تھے لیکن غالباً ہمارے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا جو اس وقت دوراً آبادہ بلوچستان میں کالج اسٹوڈنٹس رہے ہوں۔

اب تک ہندوستانی فلموں پر نیو تھیٹرز کلکے کا بیچالی رنگ غالب تھا یا بھیمی تائیز کی نئی مغربی

اسٹائل بمبئی کلچر ان میں جھلکتی تھی۔ 'مخز انجی' فلم نے لاہور کی نہایت جوشیلی اور ہٹاش بے فکری اور بے تکلفی سے بھرپور سماجی زندگی سے باقی ہندستان کو متعارف کیا۔ 'ساون' کے نظارے ہیں گاتے ہوئے سائیکل سوار لڑکے اور لڑکیاں ایک آزاد خیال معاشرے کے نمائندے تھے۔ لاہور فلم سازی کا نیا مرکز بنا۔

لکھنؤ جو راگ رنگ، رقص و موسیقی، ٹانگ اور تھیمز کا روایتی مرکز رہا تھا، نہ جانیں کیوں وہ فلم سازی کے میدان میں پھسڑی رہ گیا۔ ریڈیو اسٹیشن سے بالکل نئے ہوئے احاطے میں آنیڈیل فلم اسٹوڈیو موجود تھا لیکن اس کا پھانگ ہمیشہ بند رہا اور اس پر گھاس پھوس آگ آیا تھا۔ اس اسٹوڈیو میں ایک فلم 'رشید و لہن' بنی شروع ہوئی تھی جس کے ڈائریکٹر غالب نسیم سندیلوی تھے اور ہیروئن ایک افغان لڑکی جس کا نام مجھے یاد نہیں، شاید شہناز گل تھا۔ اس افغان کنبے کی کہانی بھی کافی المناک تھی۔ مجھے سمجھتی میں ایک خاتون ملیں، جنہوں نے کہا کہ وہ آخری افغان بادشاہ کی بیٹی ہیں۔ ان کے لڑکے فلموں میں کام کرتے تھے۔ اسی طرح الہ آباد کا ایک خاندان بھی خود کو شاہ کا بل کارشتہ دار بتاتا تھا۔ انقلاب روس کے بعد روسی شہزادوں نے پیرس میں ٹیکسیاں چلائیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بہر حال یہ افغان لڑکیاں اب کچھ یاد آتا ہے کہ ان کے نام شاہ گل اور ماہ گل تھے۔ فلموں میں آئیں یا نہیں اور نہ معلوم اب کہاں ہیں۔

رشیدہ آپا کے یہاں نئے ادیبوں کا مجمع رہتا تھا۔ حیات اللہ انصاری بھی لکھنؤ میں موجود تھے۔ ان کی بیگم سلطانہ قاضی میرٹھ کے قاضی خاندان کی دختر تھیں۔ یہ کنبہ بھی ہماری والدہ کے حلقہ احباب میں شامل تھا۔ حیات اللہ انصاری کی آواں گارڈ فلم 'نیچا ٹگر' بھی نا کام رہی۔ کرشن چندر نے بھی فلم لکھے اور بیدی صاحب اور منٹو نے بھی لیکن سب سے زیادہ کامیاب عصمت آپا ہیں۔ انھوں نے شاہد لطیف کے مشترک سے کئی فلمیں بنائیں۔ 'دسک' شاید بیدی کی فلم تھی جس میں الہ آباد کی ایک لڑکی رحمانہ سلطان نے ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ وہ ایک شائستہ پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اس کے والد سلطان صاحب بہائی فرتے میں شامل ہو گئے تھے۔ عصمت آپا کا گھر ایک اوپن ہاؤس تھا۔ اس کا بیرونی دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ بھانت بھانت کے لوگ آتے جاتے

رہتے۔ بعض اصحاب فرج کھول کر بھانک کر کہتے "اچھا آپا ہم جا رہے ہیں۔" "اچھا جاؤ۔" وہ جواب دیتے اور پلنگ پر بیٹھی اسی طرح سر جھکائے پیشکش کھیلنے میں منہمک رہتیں۔ وہ بھی کیا نادر اولو جو دے بے مثال خاتون تھیں۔ جس زمانے میں ان کی مالی حالت نہایت پریشان کن ہو گئی تھی، انھوں نے کبھی اس کا کسی سے تذکرہ کیا نہ اس سلسلے میں کسی کی شکایت کی۔ جس روز شاہد بھائی کا انتقال ہوا اور اطلاع ملنے ہی ہم لوگ ان کے یہاں پہنچے۔ ان کی سنگ روم میں فرش پر ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی اور وہ چپ چاپ اس پر بیٹھی تھیں۔ فلمی اور غیر فلمی افراد کا تاننا بندھا ہوا تھا اور تعزیت کے لیے آنے والے چند لوگ عصمت آپا کے پاس بیٹھنے کے بجائے نرمس اور تندرہ وغیرہ کو تنک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد عصمت آپا کی بڑی بیٹی سہما، جو ایک بہت ہی بھلی اور ملسار لڑکی ہے، بنگلور سے آگئی۔ اب اس سلسلے کا مختصر ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے۔ ایک روز میں علی سردار جعفری کی ہمیشہ گان رباب اور ستارہ جعفری کے ہمراہ والدہ مرحومہ کے حزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گئی۔ اب یہ دونوں بہنیں بھی اپنے بھائی بھانوج کی طرح شہر خوشاں آباد کر چکی ہیں مگر اس وقت ابھی زمین کے اوپر چل پھر رہی تھیں۔ چنانچہ ہم تینوں شاہد لطیف کا حزار ڈھونڈتے پھرے۔ اتنے میں قبرستان کے نگراں مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ سمیٹی کے سارے مسلم گورستانوں کے نگراں مشعل بہتی کے رہنے والے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ شاہد لطیف کے حزار پر پہنچے۔ مولوی صاحب نے اپنے پوربی لہجے میں کہا "دعہ رحمان کی مانیں کی قبر بھی یہیں ہے، چل کر دیکھ لیجیے۔" ہمیں یہ بات بہت ہی عجیب لگی کہ فلمی شخصیتیں سمیٹی کے حصاروں کے ذہنوں پر بھی مسلط ہیں۔ میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ نے یہ کیوں نہ بتایا کہ فلاں جگہ فلاں عالم دین کا حزار بھی موجود ہے، وہاں چلی چلیے۔"

تو بہر کیف ڈاکٹر رشید جہاں اور حیات اللہ انصاری بہت پہلے گئے اور وہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ اب بعد میں سردار جعفری بھی روانہ ہوئے جنھوں نے کہا تھا:

ہر عاشق ہے سردار یہاں، ہر محبوبہ سلطانہ ہے

چنانچہ رشیدہ آپا سے لے کر سلطانہ آپا تک ایک پورے دور کو یاد رکھنے والے بھی موجود

نسل کے ساتھ کوئی واقعی رابطہ قائم نہیں کر سکتے کیونکہ یہ نئے لوگ اس زمانے کے ماحول اور معاملات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ ہر دور کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں جنہیں اس زمانے کی نسل پہچانتی ہے۔ اگر آج ہمارے سامنے کسی طور سے میراث نمودار ہو جائیں تو کم از کم میری توسعی گم ہو جائے گی۔ اس لیے Future Shock کی بات نہ کیجیے جو وقت زمانہ حال کا چین سے گزر جائے نیست جاوے۔

(سہ ماہی، نیاسفر، دہلی، چوتھا شمارہ، 2005ء)

حواشی:

1. 1947 عیسوی میں مہرا صاحب نے اسلام قبول کیا اور بطور شیخ احمد سلمان لاہور تشریف لے گئے۔ انور ہائی آف امرتسر سے نکاح کیا۔ انور ہائی کی نوادی دور حاضر میں بطور سلٹی آغا فلم 'نکاح' کی ہیروئن بنیں۔ یہ خاندان اب اسکاٹ لینڈ میں رہتا ہے۔



## انسان دوستی کا سفیر کبیر

(گلزار دہلوی)

دوستو! مجھے وادی کشمیر میں کسی جگہ ایک طویل القامت پروہت دکھائی دیا جو ایک سنسان پگھڑی پر تنہا چلا ہوا شومندر کی طرف جارہا تھا۔ چاروں طرف خاموشی۔ جسے ایک آہستہ کی آواز منتشر کر رہی تھی۔ نہ جانیں کیوں ان لمحات میں مجھے ہزاروں برس قبل کے مصری اور اشوریائی معبد اور ان کے دراز قد پر اسرار پروہتوں کا خیال آیا جو گویا 1981 عیسوی کے اس کشمیری پروہت کے ہم عصر تھے کیونکہ سارا وقت ایک ہے مگر قابل غور بات یہ ہے کہ مصر قدیم کے وہ پروہت ہزاروں برس قبل معدوم ہو چکے لیکن کشمیر کے ان پروہتوں کا ایک پڑپوتا، ایک برہمن زادہ یعنی اقبال رمز آشنائے روم و تہریز نکلا۔ میرا خیال ہے کہ اس برہمن کے باشندوں کو جس حد تک اپنے ماضی کی ہمہ گیری کا احساس ہے تو یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد زائل ہو گیا۔ ہمارے یہاں اپنے اپنے ماضی کے شدید احساس نے مختلف فرقوں میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب کیے جن سے مختلف نتائج برآمد ہوئے۔ بہر حال وہ سرخ پوش طویل القامت

پردہ ہٹانے کے لئے اپنے راستے پر گامزن ہے اور کھل پوٹ کشمیری صوفی بھی چٹار کے درخت کے نیچے جائے نماز بچھائے بیٹھا ہے۔ یہ دیکر محمد بھی ہیں اور متحرک بھی۔ آج کے دور میں جبکہ وقت بہت تیزی سے بدل رہا ہے، پنڈت آنند موہن گلزار دہلوی جن کا نام ہی اس ساری تاریخ کا مظہر ہے، وہ جس روایت کی نمائندگی کرتے ہیں وہ عالم گیر Humanism کی ایک درخشاں روایت ہے۔ اردو شاعری کی کشادہ شربلی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس کی تسمیحات Establishment کی ہمیشہ سے مخالف رہی ہیں اور اسی روایت نے دونوں فرقوں میں ایک سے ایک اعلیٰ اعلیٰ قلم شاعر، ادیب، موسیقار اور مصور پیدا کیے۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی پڑ پڑتی یہ تاجپور شرق و مغرب کے مختلف ملکوں کی سیر کر چکی ہے۔ لیکن کہیں ایسی رنگارنگ کثیر الجہت تہذیب نہیں دیکھی جو برصغیر ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں موجود ہے۔ سارے لڑائی جھگڑوں، بیوقوفیوں اور حماقتوں کے باوجود یہ تینوں گاڑیاں چمک چمک چلے جا رہی ہیں:

کچھ بات ہے کہ ہستی نئی نہیں ہماری

ذاتی طور پر میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اس بزرگ صوفی کی تامل ہوں جنہوں نے کہا تھا کہ میرا کام قہقہے سے کاٹنا نہیں بلکہ سوئی دھاگے سے جوڑنا ہے۔ لہذا یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ گلزار دہلوی اس مثبت اور درخشاں روایت کے امین ہیں۔

علامہ پروفیسر پنڈت تر بھون ناتھ زتشی زار دہلوی یادگار داغ جنہوں نے ریٹائر ہونے کے بعد اندر پرستھ کالج دہلی میں 39 سال اردو فارسی پڑھائی اور مجھے فخر ہے کہ اس کالج میں پنڈت جی میرے استاد رہے، جہاں دہلی یونیورسٹی کے بی اے میں انگلش کے ساتھ اردو کا ایک پرچہ بھی لازمی تھا اور ایک دلچسپ بات جو آج کے لوگوں کو بہت اچھی معلوم ہوگی وہ یہ تھی کہ پنڈت جی باضابطہ مولوی صاحب کہلاتے تھے اور ساری دہلی میں وہ مولوی صاحب کے لقب سے ہی مشہور تھے۔ چنانچہ جانا چاہیے کہ ہندو مسلم اتحاد سرکاری پالیسی، سمینار اور کانفرنسوں کے ذریعے تخلیق نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک خود رو گلشن ہے جو صدیوں کی رواداری اور تہذیبی یگانگت کے ذریعے پیدا ہوا ہے۔ دہلی، بکنورو اور الہ آباد میں پنڈت ناتھ کشاکش کی آبادیاں اسی فراخ دل اور رچی

ہوئی تہذیب کی نمائندگی کرتی رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے لکھنؤ کے ایک مشہور معالج جو کشمیری پنڈت تھے۔ ان کی بیٹی کا بیاہ ایک اور کشمیری پنڈت سے ہو رہا تھا۔ منڈپ میں پھیرے پڑنے والے تھے۔ شادی کی ساعت جو برہمنوں نے اپنے علم کے ذریعے نکالی تھی وہ آیا ہی چاہتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہماری دوست کے خاندانی پیر جن کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی کھڑاویں کشمیر سے اب تک لکھنؤ نہیں پہنچیں جن کے گرد گھوم کر پھیرے ڈالے جاتے کیونکہ کشمیر میں سیاسی گڑبڑ شروع ہو چکی تھی اور وہ لڑکا ابھی تک لکھنؤ نہیں پہنچا تھا۔ سارے منڈپ میں شدید پریشانی اور اضطراب کا عالم طاری تھا جب اچانک آ گیا آگیا کا شور مچا اور وہ لوجوان شاداں و فرحاں منڈپ میں داخل ہوا۔ چنانچہ انگی کے گرد پھیرے ڈالنے کے بعد دولہا دلہن نے حیر صاحب کے کھڑاؤں کا بھی طواف کیا تب شادی کی رسوم مکمل ہوئیں۔

آج کے دور میں جب زیادہ تر دیے منشی رجحانات کے مظاہر ہیں اس تہذیبی اہم آبجیکٹ کو اگر اپنے معاشرتی رویوں کے ذریعے اکثر لوہور یافت اور جا کر کیا جائے تو ہمارے بیشتر معاملات خود بہ خود سلجھ جائیں گے۔ اردو شاعری میں استاد اور شاگرد کا یہ سلسلہ کسی شاعری خاندان کے نسب نامے سے کم اہم نہیں۔ اہل مغرب روایت کے اس سلسلے کی معنویت سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ استاد اور شاگرد کی یہ کلچر مغرب میں مفقود ہے۔ جب معاشرے میں امن و آسائش کی فراوانی تھی، مختلف اساتذہ کے شاگردوں کے مابین آدیش بھی رہتی تھی۔ شعر و شاعری اور شعر گوئی اعلیٰ تمدن کی خصوصیت تھی جس طرح جاپان میں رسم چائے نوشی ان کے فلسفہ ذہن کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ ہمارے یہاں اردو قاری شاعری تصوف کی انسان دوستی کی علامت تھی اور استاد و شاگرد کا سلسلہ گویا ایک مابعد الطبیعیاتی سلسلہ بھی تھا۔ انگلستان یا یورپ میں آپ کو کوئی شخص ایسا نہیں ملے گا کہ اس کے پردادا جان کیلیس کے شاگرد تھے۔ وہاں کی تہذیب بھی مختلف ہے۔

چنانچہ ہمارے یہاں حضرت گلزار دہلوی کی شخصیت اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ وہ ایک ہمہ گیر ادبی روایت کے رکھوالے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے ممالک غیر میں

آباد ہونے والے ہندوستانوں نے کنیڈا سے لے کر آسٹریلیا تک اردو کی چھاؤنیاں چھائی ہیں۔  
جہاں چند اردو والے جمع ہوں وہاں ایک مشاعرہ بھی ضرور ہوگا اور آج کل سات سمندر پار منعقد  
ہونے والے مشاعروں کے میر محفل گلزار دہلوی کی موجودگی اس شعر کی تفسیر ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں دلت

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اردو شاعری محض ادب ہی نہیں آداب محفل کی آئینہ دار اور بذاتہ خود ایک تہذیب ہے۔  
ایک پابند وضع اردو مشاعرے سے مشابہ ایک اور اعلیٰ مدنیّت کی نمائندگی راقم الحروف نے جاپان  
کی رسم چائے نوشی میں دیکھی جو ان کے فلسفہ زمین کی شارح ہے۔ اسی طرح اردو شاعری تصوف  
کی بنیادی انسان دوستی کی مضمر ہے۔ کشمیر کی شعری روایت اس انسان دوستی کی پیٹا بر ہے اور  
پنڈت گلزار دہلوی اس انسان دوستی یا Humanism کے ایک نمائندے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ  
انسان دوستی ایک صبا بہار موسم گل ہے اور گلزار دہلوی اس کے ایک ہر دل عزیز سفیر کبیر۔ خدا  
کرے موصوف کے ایسے اور اُن مکت جنم دن گلستان اردو میں منائے جائیں۔ آمین!

(گل محمد مرگ، مرتب مجیب الرحمان)

## الہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے

(فیروز جیوں)

لو صاحب! فیروز جیوں بھی لگیں۔ شاید جزیرہ برطانیہ کی مٹی ہمارے دوستوں کو اتنی بھانجی ہے کہ وہ تاقیامت اسی میں رہنا چاہتے ہیں حالانکہ ہمارے بگت چچا صدیق احمد صدیقی نے ایک بار ہم سے کہا تھا:

”نیا ہم زندگی میں تو انگریز کے پڑوسی بن گئے لیکن ہروز شریک

گورستان میں گوروں کے مسائے نہیں بننا چاہتے۔“

مگر فرشتہ اجل پر کسی کا بس نہیں۔ وہ جہاں چاہے بغیر پاسپورٹ اور ویزا اڑ کر پہنچ جائے۔ کہاں فرنگی محل لکھنؤ اب رہا کہاں بحر ثانی کا ایک کمر آلودہ پورا انگلستان۔ اگرچہ ہماری بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں ”ہر شخص اپنے لکھے پورے کرتا ہے۔“ اس محاورے کا مطلب آج کل کے بہت سے اردو داں شاید سمجھ نہ پائیں۔

ہماری عزیز دوست فیروز جیوں علی گڑھ سے گریجویشن کے بعد احتشام حسین صاحب کی

شاگردی کا فخر حاصل کرنے کے لیے لکھنؤ آ گئیں۔ وہ کیا زمانہ تھا جب دانش گاہوں کے پشتر پروفیسر صاحبان مختلف علوم کے ایسے جید عالم تھے کہ ان کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے لیے دور دراز کے علاقوں سے چل کر طالبان گوشتی کے ساحل پر آن پہنچتے تھے۔ ہمارے ازاہلا تصویرن کالج میں سندھ اور بلوچستان کی لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ کشمیر، آسام اور کیرالہ کی بھی۔ چنانچہ اس برصغیر میں نوجوانوں کی ایک مشترکہ کلچر بن گئی تھی جس میں حصول علم کے اصول اعلیٰ ترین برطانوی روایات پر مبنی تھے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ نیا لیشیا یا نیا افریقہ عہد برطانیہ کی دین ہے۔ درندہ کاری وہی حالت ہوتی جو آج تک افغانستان یا تبت کی رہی ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ برطانیہ اور یورپ ترقی کی دوڑ میں ہم سے تین چار سو سال آگے نکل چکا تھا۔ اس کے باوجود اپنی فطری ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر اہل ہند نے بہت کم عرصے میں ایسی ترقی کی جو آج تک مشرق کے بیشتر ممالک حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ میں نے ایران کی حالت دیکھی ہے جہاں دور حاضر تک شہروں میں پینے کے لیے صاف پانی کا انتظام ناقص تھا۔ ریلوے ندارد۔ تہران سے باہران کے یہاں بڑے شہروں کا تصویر ہی ناپید تھا۔ میں نے افغانستان نہیں دیکھا لیکن سنا ہے اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

برطانوی ہند میں سترہ اٹھارہ یونیورسٹیاں اور ان گنت ڈگری کالج موجود تھے۔ یہاں کے ریاضی دان اور سائنس دان مغرب میں اپنی دھاک بٹھا رہے تھے۔ علامہ اقبال نے دعا مانگی تھی کہ مسلمان کو ایک بار پھر ذہن ہندی اور نطق اعرابی عطا ہو۔

اب خواتین کا معاملہ لیجیے۔ یہاں بھی مشنری اداروں اور ہندو اور مسلمان لڑکیوں کے مدارس اور کالجوں کے ذریعے تعلیم کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ دراصل ہم لوگوں کو اپنے حال زار پر گریہ و زاری کی ایسی راسخ عادت پڑ گئی ہے کہ ہم مجموعی حالات کے مثبت پہلو نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ آزادی کے بعد تو خیر بے شمار یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ خواہ ان کا معیار کیسا ہی ہو لیکن بہر حال کچھ نہ ہونے سے بہتر ہی ہے۔

فیروز جیہی عہد حاضر سے ذرا قبل کے عبوری دور میں پیدا ہوئیں۔ علی گڑھ اور لکھنؤ میں

تعلیم حاصل کی۔ اس لحاظ سے وہ اس دور کی ایک نمائندہ خاتون تھیں۔ لکھنؤ سے ایم اے کرنے کے بعد رتن ناتھ سرشار پر کام کرنے کی غرض سے لندن گئیں۔ یہ بھی ایشیا اور افریقہ کے معاملات کی پوائنٹ تھی ہے کہ یہاں کا طالب علم اپنے ہی علوم سنسکرت، عربی، فارسی، اردو وغیرہ میں ریسرچ کرنے کے لیے لندن جاتا تھا۔ اسی طرح فرانسیسی متونصاات کا ایشیائی یا افریقی نوجوان طالب علم پیرس کا رخ کرتا تھا۔ ہمارے کتب خانوں کی بے شمار اہم ترین کتابیں جو ذوال سلطنت مغلیہ کے دور میں انگریز انگلستان لے گئے، اس طرح وہ وہاں محفوظ رہیں۔ ورنہ یہاں کی افراتفری میں وہ تلف ہو جاتیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے ایک ہندوستانی مسلمان سیاح جو 1799 عیسوی میں یورپ پہنچا تھا، اس کا نام شاہ مرزا ابو طالب اصلہائی تھا۔ اس نے اپنے سفر نامے میں لکھا کہ ڈبلن کے ایک لارڈ کے یہاں اس نے نواب شیرجنگ کے محل سے لوٹے ہوئے نوادر بچے دیکھے۔ اسی طرح اگر آپ لندن کے عجائب خانوں میں جائیں تو عہد مغلیہ کے ہندوستان میں بکھرے ہوئے نوادر وہاں محفوظ پائیں گے۔

برسٹل تذکرہ آج سے تقریباً بیس سال قبل میں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی مولانا آزاد لبریری میں بہت سے متقل مندوق رکھے دیکھے جو معلوم ہوا کہ ہندوستان کے امراد نوامین نے اپنے اپنے کتب خانوں سے نکال کر نادر کتابیں یونیورسٹی کو تحفہ پیش کی تھیں لیکن یہاں اس اہم ذخیرہ کی نہ تو فہرست سازی کی گئی تھی نہ انھیں الماریوں میں سجایا گیا تھا اور وہ الماریاں خالی پڑی تھیں۔

بی فیروز اور ان کی طرح کے متعدد دانش جو لندن پہنچے، وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ہمارے ایک کزن تقی احمد سید جو سر سید پر ریسرچ کرنے لندن گئے تھے، اسی زمرے میں انھیں بی بی سی کے اردو سیکشن میں مستقل ملازمت مل گئی۔ چنانچہ ریسرچ کون کرتا، موصوف بی بی سی میں لگ گئے۔ اب اس ناچیز کا احوال سنئے۔ مجھ سے وعدہ کیا گیا کہ مجھے ہر ہفتہ باضابطہ دو یا تین پروگرام دیے جائیں گے۔ معاوضے کے ریت ایک گنی فی منٹ تھا۔ گنی کا مطلب ہے طلائی اشرفی۔ اب اشرفیوں کا دور ختم ہو چکا تھا لیکن انگریز بیجا اپنی قدامت پرستی لفظ گنی 21 پونڈ کے لیے

استعمال کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، شاید یہ ہی رہیت تھا اور براڈ کاسٹ کا معاوضہ ایک گنی فی منٹ تھا۔ چنانچہ بہت سے نوجوان اردو والے ایک ہفتہ میں دو پروگرام کر کے اچھا خاصا کمالیتے تھے۔ اچھے فلیٹ کا کرایہ پانچ پوٹ یا اس سے ذرا سا زیادہ فی ہفتہ۔ زیر زمین فلیٹ کا کرایہ تین پوٹ۔ سینٹ جانزڈا میں جواد بیوں اور آرٹسٹوں کا نہایت پر فضا محلہ تھا، میرے پاس ایک رہائشی عمارت کی دوسری منزل پر بیڈ سنگ روم اور ذاتی غسل خانہ پانچ گنی فی ہفتہ کرایہ پر تھا۔ کھانا پکانے کا گوشہ کمرے ہی میں شامل تھا۔ اب ایسے فلیٹ اور ایسے علاقے کے کرائے بے تحاشہ بڑھ چکے ہیں۔

فیروز کا فلیٹ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یونیورسٹی کے علاقے میں تھا۔ لندن میں مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کے طلبہ کی کثرت تھی اور ان دونوں ملکوں کے یہ بنگالی زیادہ تر ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر یہ ثابت ہوا کہ برصغیر کے باشندوں کے لیے زبان کی یگانگت بہت اہم تھی۔ مشرقی اور مغربی پنجاب کے ہندو، سکھ اور مسلمان طلبہ بھی اپنے پنجابی پروگرام اکثر اکٹھے منعقد کرتے تھے۔

فیروز گل رنگ علی گڑھ سے آئی تھیں اور خود بھی سرخ رنگ اختیار کر چکی تھیں۔ ان کے حلقہ احباب میں زیادہ تر بنگالی لڑکیاں اور لڑکے شامل تھے اور یہ مغربی بنگال اور مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔ بنگالی تو ہمیشہ بنگالی ہی رہے گا۔ مغربی پاکستان کے مسلمان اور مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھ بھی انگریز کے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ فیروز کا مکان بنگالیوں کا ایک اڈہ تھا۔ یہ اڈہ بنگالیوں کی خاص اصطلاح تھی۔ یعنی کپ شپ کی محفل۔ فیروز کے یہاں اڈے میں نشست مکر جی بھی آتے تھے جو بنگال کی بہت ہی افسانوی بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی ایک متول زمین دار گھرانے کے چشمہ چراغ جو بائیس بازو میں شامل ہو گئے تھے۔ گویا بے بھائی کی روایت کا بنگالی ایڈیشن۔

لندن میں اس نوع کے بہت سے نوجوان موجود تھے۔ یہ سب مل کر برطانیہ کے خلاف نعرے لگاتے تھے، جلسے کرتے تھے، جلوس نکالتے تھے لیکن اسی ملک میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر



رہے تھے اور یہ روایت گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ اس میں حرید  
باریکی یہ پیدا ہوئی کہ دورِ حاضر میں بہت سے نوجوان تعلیم مکمل کر کے نہایت جوش و خروش سے  
ہندستان واپس آئے کہ اب اپنے ملک کی خدمت کریں گے لیکن یہاں ان کو کوئی ڈھنگ کی  
ملازمت بھی نہیں ملی اور وہ پھر برطانیہ واپس چلے گئے جو ان کی آخری جائے پناہ ثابت ہوا۔  
نشیست کرجی کی بیک گراؤنڈ والے زمین دار گھرانوں کی تہذیب بنگالی نادلوں اور بنگالی  
فلموں کے ذریعے ایک اسطوری حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہ ہندو زمین دار طبقہ انگریزوں نے  
نوابین مرشد آباد و ڈھاکہ کی حکومتوں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد اپنے وقار و اربوں کی حیثیت سے  
تحقیق کیا تھا۔ ان نئے ہندو زمین داروں نے نوابین مرشد آباد کی تہذیب اور طور طریق اختیار کیے  
اور مسلمان مشنریز ایک پسماندہ اور آن پڑھا کثرت میں تبدیل ہو گئے۔ یعنی بائبل کی زبان میں  
وہ پانی بھرنے اور لکڑی چیرنے والے بن کر رہ گئے۔

#### Drawers of water and hewers of wood

عالم یہ بھی وجہ تھی کہ بنگال میں مسلم لیگ اتنی کامیاب رہی اور مشرقی پاکستان وجود میں  
آیا۔ نشیست کرجی جیسے اُن گت بنگالی نوجوان کیونسٹ تحریک میں بھی شامل ہوئے۔ برطانوی دور  
میں کسی انگریز نے جل کر لکھا تھا:

”سب سے پہلے بنگالی کو چھینک آتی ہے، اس کے بعد باقی  
ہندستان بڑکام میں جٹا ہوتا ہے۔“

آزادی کے بعد جوت در جوت بنگالی بزمِ حصولِ اعلیٰ تعلیم لندن پہنچا اور وہاں ہندستانی  
طلبہ کی تاریخی انجمن لندن مجلس پر اس نے دھاوا بولا۔ یہاں یہ نقطہ قابل ذکر ہے کہ یہ انجمن سجا  
کے بجائے مجلس کہلاتی تھی کیونکہ اردو اس وقت بہر حال ہندستان کی تہذیبی زبان تھی۔ دورِ حاضر  
میں بنگالی طلبہ ہی مجلس کے کر تا دھرتا تھے۔ انھوں نے بھی یہ نام تبدیل نہیں کیا۔ مشرقی پاکستان  
کے دانش جو بھی لندن مجلس میں جوش و خروش سے شامل رہے۔ علی گڑھ سے بی فیروز بھی آ گئیں۔  
انھوں نے نکلسن یونیورسٹی سے ایم اے کر لیا تھا اور اب وہ رالف رسل کی نگرانی میں سرشار پر کام

شروع کر رہی تھیں لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے پلی ایچ ڈی میں چاہے آپ دس سال تک گاہے بہ گاہے پڑھا کیجیے، چاہے تین سال بعد فصل کاٹ لیجیے۔ فیروز طلبہ کی سیاسی و تہذیبی مصروفیات میں لگ گئیں۔ مختلف ملازمتیں کیں۔ اسی دوران میں نہایت کمرچی سے سول میرج منعقد ہوئی۔ مجلس کے سارے لڑکے لڑکیاں تقریب میں شامل ہوئے۔ پکوان کپے۔ گانا بجا مارا۔ دفافو قفا پڑھائی بھی کی۔ فیروز کو ڈاکٹریٹ مل گیا اور دونوں ہندوستان واپس آئے۔ کلکتے پہنچے، ملازمت تلاش کی۔ حسب دل خواہ کام نہ ملا تو پھر لندن واپس چلے گئے۔ میرے خیال میں یہ ایک بڑا ہی دلہندہ و واقعہ تھا یعنی جس ملک و قوم کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد ہمارے بزرگوں نے اور بعد میں ہم نے کی اور اس کے بعد خود ہی برطانیہ ہمارے لیے آخری دارالامن ثابت ہوا اور اب تو یہ خبریں عام طور پر اخباروں میں چھپتی ہیں کہ ہندوستانی مزدور طبقہ کے افراد کشتیوں میں سوار ہو کر بغیر پاسپورٹ انگلستان کے ساحلوں پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے برطانوی پولیس ان کو واپس نکال دیتی ہے۔ لیکن یہ گزشتہ دور کے ذہن پرست نوجوانوں کا طبقہ تھا جو اس خیال سے انگلینڈ جاتا تھا کہ وہاں پڑھ کر لوٹنے کے بعد ہم لوگ ہندوستان میں سرخ انقلاب لائیں گے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ہندوستانی طلبہ اور طالبات کی ایک ٹولی لندن سے وڈاپیٹ پوٹھ فیسٹیول کے لیے روانہ ہو رہی تھی جس میں ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر سارے لڑکوں اور لڑکیوں نے ایک نہایت جوشیلا انگریزی انقلابی گیت گایا:

"One great vision unites us through remote be the lands of our birth."

اور اس کا اردو ترجمہ بھی کیا گیا:

دنیا بھر سے ایک ہوئے نوجوان

ایک آدرش مہمان لیے

اب دیکھیے نوجوانوں کے یہ خواب کسی طرح سچے ثابت نہ ہوئے۔ پہلے تو خود مشرقی

پاکستان میں جنگ چھڑی۔ میرے پاس Federation of Indian students unions کی سالانہ کانفرنس کی ایک تصویر موجود ہے جس میں اسٹیج پر مشرقی پاکستان کے عطاء الرحمن اور ہمایوں

رشید چودھری ہارمونیم پر گارہے ہیں اور سنگت میں راقم الحروف اور فیروز جیسے اور ایک پنجابی لڑکی شیلانہ سرائی میں منہک ہیں۔ پیچھے دیوار پہ ہندوستانی ترنگے کی جھنڈیاں آویزاں ہیں۔

ہمایوں رشید چودھری وہ حضرت تھے جنہوں نے سب سے پہلے شاید ایک پاکستانی سفارت خانہ چھوڑ کر بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان کیا اور جیسا کہ میں نے ابھی لکھا ہے فیروز اور نصیحت وطن واپس آ کر بے حد دل برداشتہ ہوئے اور پھر واپس لندن چلے گئے اور آخر وقت تک وہیں رہے۔ اس کہانی میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں افراد مغربی ممالک میں جا بسے ہیں لیکن فرسٹ جنریشن مہاجرین کو جلا وطنی کے رنج بھی پہنچے پڑتے ہیں۔ ان کی اولاد جو وہیں پیدا ہوئی ہے وہ اس قسم کے کسی جذباتی دکھ سے نا آشنا ہے۔ اب اگر ان کی لڑکیاں شام کو اپنے بوائے فرینڈس کے ساتھ باہر گھومنے کے لیے جائیں گی تو ان ہندوستانی نژاد ماں باپ کو اس پر شاید کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

فیروز نے مغربی معاشرے کے قوانین سے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ان کا اکلوتا بیٹا، بہو اور پوتی ان ہی کی عمارت کی چوتھی منزل پر رہتے تھے اور محض ہفتے یا اتوار کی صبح فیروز اور نصیحت کے ساتھ ناشتہ کر لیتے تھے۔ کچیلی پار میں نے رائل سے کہا تمہاری ماں اردو کی اسکالر ہیں اور تم نے ایک لفظ بھی اردو کا نہ سیکھا، نہ ماں کی کچل سے کوئی رابطہ رکھا۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا:

مجھے اس کی کیا ضرورت ہے۔ I am a Bengali Mukerji

تو سارا مسئلہ آج کی دنیا میں تمدنی شناخت اور تہذیبوں کے تصادم کا ہے اور اکثر اس تصادم میں ایک تہذیب دوسری تہذیب پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اس کی سب سے روشن مثال گواہ ہے جو تمدنی لحاظ سے پر نکال کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے لیکن کچھ تو انگریز کی رواداری اور کچھ برصغیر کی اپنی مقامی ہندو مسلم تہذیب کی عظمت اور استقامت کہ وہ چار سو سال میں بھی نہ پورے ملک کو عیسائی کر پائے اور نہ مقامی ہندو یا مسلم معاشرے کو زیر کیا۔ بے شک انہوں نے ایک نئی کولونیل تہذیب کی تشکیل کی۔

اہل ہند نے تقریباً دو سو سال قبل سے انگلستان جانا آنا شروع کیا۔ انگریز کی تہذیب ہمارے معاشرے میں اس حد تک شامل ہوئی کہ آج ہم یہ بھی نہیں پہچان سکتے ہیں کہ جو چیزیں ہم استعمال کر رہے ہیں جو طرز رہائش ہم نے اختیار کر رکھا ہے وہ کتنی حد تک انگلستان کی دین ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ برطانیہ نے ہندوستان کو اپنی مارکیٹ بنایا اور اپنا مال یہاں فروخت کر کے ہمیں وہ چیزیں استعمال کرنے یا کھانے یا پینے کی عادت ڈالی جن سے ہم پہلے واقف نہیں تھے۔ فرنیچر کا بیشتر سامان، برتن، گلاس، جھپے، ملبوسات، کوٹ پتلون اور بوٹ وغیرہ کس کس چیز کا نام لیجیے۔ لیکن مثال کے طور پر آپ مراد آباد کے کسی پرانے گھر انے میں جائیے تو آپ کو آج بھی عہد مغلیہ کے چمچ مل جائیں گے جو چینی ریسٹورانوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں یعنی یہ وسط ایشیا، چین، ملاحین، ایران اور کشمیر سب ایک سلسلے کی کڑیاں رہی ہیں۔ ہمارے استعمال کی چیزوں میں تو شک، تکلیف، ڈیجیٹی، فیشٹری، بچہ اور پیالہ وغیرہ کا ہندی میں مترادف تلاش کرنا آسان نہیں۔

رتن ناتھ سرشار پر فیروز جی کا مقالہ غالباً لاہور سے شائع ہو چکا ہے لیکن شاید وہ کتاب ہندوستان نہیں پہنچی اور یہاں کے قارئین فیروز کرجی کے نام ہی سے ناواقف ہیں۔ اردو ادب ایک دولت مشترکہ ہونا چاہیے لیکن سیاسی حد بند یوں نے دونوں ملکوں کے قارئین کو اس میں خزانے سے نا آشنا رکھا۔ لاطینی کا یہ عالم ہے کہ بچپنی ہار لاہور کی ایک ادبی محفل میں کسی نے مجھ سے اپنی کتاب پر دستخط کرنے کو کہا۔ جب میں لکھنے لگی تو ایک صاحب نے استہزائیہ انداز میں مجھ سے پوچھا ”کیا آپ اب بھی اردو لکھ لیتی ہیں؟“ یہ صاحب اردو کی ایک نامور ادیبہ کے داماد ہیں۔ اسی طرح ہماری ایک کزن یہاں سے لاہور گئیں تو ان کی خالہ زاد بہن نے اپنی والدہ سے کہا ”امی ایک سیلا ڈریف کرو لیجیے۔ ان بچاری نے انڈیا میں سیلا ڈریف کہاں سنا ہوگا۔“ یہاں اکثر پاکستانی معاشرے کے متعلق اسی قسم کی حیرت انگیز لاطینی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے کے دوران انڈیا کے ایک مقرر اخبار میں آرٹس کی بنائی ہوئی ایک تصویر چھپی تھی جس میں نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو دونوں ماں بیٹیوں کو برقع پوش اور نقاب پوش دکھلایا گیا تھا۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی مسلمان عورت ہے تو وہ لازمی طور پر برقع اوڑھتی ہوگی۔ اسی طرح پاکستانی

اخباروں میں اگر کسی ہندو کردار کا کارٹون بنے تو اس کے سر پر پٹیا ضرور دکھلائی جائے گی۔ دنیا کے ہر ملک میں دوسری اقوام کے متعلق اسی قسم کے تصورات وہاں کے اجتماعی حافضے میں جاگزیں ہیں۔ کارٹون میں ترکی ٹوپی اوڑھے اونٹ مسلم شخصیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ بسلسلہ عیاشی بھی کارٹونوں میں ایک غیر مسلمان پاشا دکھلایا جاتا ہے جو گاؤں کے سہارے بیٹھا حقہ پی رہا ہے اور سامنے ایک رقامہ تاج رہی ہے۔ ان مسلمان سائنس دانوں کا نام بھی مغرب میں کوئی نہیں جانتا جن کی بدولت یورپ کے نشاطِ ثانیہ کے چراغ روشن ہوئے۔ لیکن اس صورتِ حال میں مغربی تعصب کے علاوہ مسلمانوں کی اپنی بے حسی بھی شامل ہے جنہوں نے اپنے اجداد کے علمی کارناموں سے اہل یورپ کو روشناس ہی نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس خود یورپ کے مستشرقین نے یہاں کی گمشدہ علمی دولت ڈھونڈ نکالی۔

اٹھارویں، انیسویں صدی کے اہل مشرق کی مجموعی جہالت اور بے علمی کی بنیادی وجہ کیا تھی، اس کا سارا الزام ہم یورپین قارئین پر نہیں ڈال سکتے۔ اگر وہ آپ کے کتب خانے لوٹ کر لے گئے تو آپ نے ان کی مدافعت کیوں نہیں کی؟ آپ تاج رنگ میں کیوں لگدے؟ ڈیڑھ سو سال سے ہماری عادت بن گئی ہے کہ ہم اپنی ہر کمزوری اور ہر بیہودگی کے لیے سورہ الزام اہل مغرب کو گھبراتے ہیں اور اپنی کمزوریوں اور حماقتوں کا اعتراف نہیں کرتے۔

فیروز کئی برس تک برٹش میوزیم کے کتب خانے میں جا کر اپنی ریسرچ میں لگی رہیں لیکن یہاں پر اگر کسی نے ان کا نام سنا بھی تو یہ اعتراض کیا کہ یہ فیروز مکرری کیا مطلب ہے۔ بہر حال انھوں نے تو لندن میں ایک مطمئن زندگی گزاری اور ان کی طرح کے بہت سے اہل دانش جو یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں جا بیسے، اپنی جلاوطنی کی بنیادی خلش کے باوجود انھوں نے ایسی آسودہ زندگی گزاری جس میں وہ اپنا اپنا علمی یا ادبی کام بھی کر سکے۔

فیروز کے میاں بنگالی تھے۔ بیٹا اردو سے ناواقف ایک برطانوی نوجوان ہے۔ بہو انگریز اور پوتی بھی انگریز ہی سمجھیے۔ اسی طرح ایک نسل کے ہندو دوسری نسل میں تارکینِ وطن کی پوری کلچر مختلف ہو جاتی ہے۔ اجداد کی تہذیبی خصوصیات ہمیشہ کے لیے معدوم اور نیست و نابود اور تہذیبوں

کے دھارے مختلف راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے 1947 عیسوی کے بعد ہندوستان کا رنگ بدل گیا۔ ایک کے تین تین ہو گئے۔ زبانیں، خیالات، سیاسی نظریات اور طرز رہائش ہر چیز میں بھونچال آیا۔ زمانے کی ہکس کوپ کچے منظر بدل گئے۔ یہ تغیر تاریخ کا ایک اہل قانون ہے۔ نہ ہم آج اشوک کے زمانے میں زندہ ہیں نہ محمد شاہجہاں ہمارا دور ہے۔ وہ زمانے کیسے تھے اور وہ لوگ کون تھے؟ ان کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عجائب خانوں میں محفوظ اشیاء برتن، بھائے، ہلیو سائٹ سے ہم کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ان چیزوں کو استعمال کرنے والے لوگ کیسے تھے۔ ان کی آوازیں، ان کے الفاظ، حرکات و سکنات، ان کے آداب و رسوم محض ہم تصور ہی کر سکتے ہیں۔ اگر بغرض محال کوئی فرد بشر مرد یا عورت سرحدیں یا اٹھارویں صدی سے نکل کر سامنے آ جائے اور بولنے لگے تو ڈر کے مارے ہماری جھکی بندھ جائے گی یا آنے والی صدیوں میں کسی نے سائنس کی مزید ترقی کی بدولت ہماری جھکی دیکھ لی تو وہ بھی دہشت زدہ رہ جائے گا۔ لہذا عاقبت اسی میں ہے کہ محفل پانی کے جس حصے میں تیر رہی ہے اسی پہ قناعت کرے۔ ہمارے جیشیل نگاروں اور ظلم سازوں نے ماضی کی جو جھلکیاں پیش کی ہیں وہ آج کل کی تخلیق ہیں۔ ماضی کو اس کی اصل حالت میں پیش کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہمارے سوچنے سمجھنے کے طور طریقے بھی مختلف ہو چکے ہیں۔ اگر آپ ملک کے ان دور افتادہ گاؤں میں جاییے جہاں ابھی تک ٹیلی ویژن نہیں پہنچا تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ لوگ اب بھی بڑی حد تک ماضی میں جی رہے ہیں۔ عورتوں کے متعلق ان کی رسومات اور پابندیاں اب تک مہر رفتہ کی یاد دلاتی ہیں۔

ہمارے سماج کے بیشتر گھرانوں میں تین سلیبس یکجا نظر آتی ہیں۔ پہلے ان کو گزرتے دادا ابا، ان کے بیٹے جنھوں نے کالج میں تعلیم حاصل کی اور پوتے پوتیاں جو مغربی ممالک سے پڑھ کر لوٹے ہیں یا وہ ہیں آباد ہو چکے ہیں یعنی مہد جارج بنجم، مہد جواہر لال نہرو اور بالکل آج کا زمانہ جو کوئی ایک مہد نہیں ہے بلکہ اس میں تین چار زمانے گنڈھ ہو گئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ Information Explosion کا دور ہے۔ ہمدقت ٹیلی ویژن دیکھنے والا بچہ بچہ پڑھا جن بن چکا ہے۔ ان کی معصوم اور بھولی باتوں کا زمانہ بھی رخصت ہوا۔ وہ اب وقت سے پہلے عمر رسیدہ ہو

چکے ہیں۔ اب بچوں کے رسالے بھی ناپید ہیں جن میں وہ خود چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتے تھے اور دوسروں کی لکھی ہوئی کہانیاں بڑے اٹھاک سے پڑھتے تھے۔

اتنی تیز رفتار ترقی ذہن کی بتدریج نشوونما کے لیے مضرت ثابت ہو سکتی ہے۔ لڑکیاں اب گڑیاں نہیں کھیلتیں۔ ہائی اسکول کے زمانے تک میری الماری میں گڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ دوسری الماری کے سب سے ٹپلے خانے میں گڑیوں کا کچن تھا جہاں وہ جیل کے ظروف رکھے تھے جن کے چھوٹے چھوٹے سیٹ بنارس میں ملے تھے۔ ان کے علاوہ چینی کے ظروف گڑیوں کے ڈزینٹ اور ٹی سیٹ اوپری تختے پر ڈرائنگ روم میں بچے ہوتے تھے۔ گڑیوں کا پورا فرنیچر دکانوں میں دستیاب ہوتا تھا۔ گڑیوں کا چھوٹا بیاٹو بھی موجود تھا۔

میں نے پہلے کہیں ذکر کیا ہے کہ کپڑے کی گڑیوں کو میں نے نوکرانی بنایا تھا اور انگلش اور جرمن گڑیاں اور گڈے ان کے آتھے۔ اس طرح غیر شعوری طور پر میں نے اس زمانے کی سوسائٹی کی نمائندگی کی تھی۔ علاوہ ازیں جب میں حاضر ماسوں کے صاحبزادے کو فٹنس ریفٹ جو میرے ہم عمر تھے لیکن میں کو دیکھ کر میٹرک میں پہنچ گئی تھی اور وہ ابھی دہرہ دون کے ایک انگلش اسکول میں شاید جونیئر کیمرج میں ہی تھے۔ میں نے نہایت احساس برتری کے ساتھ پرستانی کہانیوں کی ساری کتابیں انھیں بخش دی تھیں۔

بہر حال ہمارے اُن گنت لوگ مغربی ممالک میں جا بے ہیں۔ فیروز بھی انھیں میں شامل تھیں اور ان کا کتبہ آج کے بچے رتے معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ خود یوپی کی مسلمان، شوہر بنگالی برہمن، بیٹا برطانوی نوجوان، بہو انگریز، پوتی کو بھی انگریز ہی سمجھتے۔ اب ان کا طرز زندگی برطانوی ہی رہے گا۔ عید کے روز سونیاں پکانے یا دیوالی کی شام گھر میں چراغاں کرنے کی رسم احتراماً جاری رہے گی۔ ذرا سوچئے کہ جب ہمارے اجداد وسط ایشیا اور ایران سے بھارت ورش پہنچے وہ ہارویں صدی عیسوی یا اس سے ذرا آگے کا زمانہ تھا۔ ہمارے یہاں کوئی عجائب خانے اس طرح کے نہیں بنائے گئے ہیں جن کے مختلف کمروں میں ہر دور کا ساز و سامان موجود ہو اور اسی دور کی پوشاک پہنے گا نیز آپ کی رہنمائی کریں۔ وہاں کے عجائب خانوں میں مختلف تاریخی

کردار اداکاری کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ عام سیاحوں اور شہریوں کے علاوہ اسکول کے بچوں کی ٹولیاں نہایت انہماک سے انھیں دیکھتی ہیں۔ ہمارے یہاں اس قسم کے میوزیم تیار کرنے کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ اس نوع کی تماشاگری میں بھی فرقہ وارانہ مسائل کی اڑچیس پیدا ہو جائیں گی۔ ہمارے امتیاز بھائی مرحوم و مغفور کا تصنیف کردہ ڈراما 'انارکلی' ایک منفرد فن پارہ ہے اور اس سے بہتر اور فسون خیز ڈراما دور حاضر میں آج تک لکھا نہیں گیا۔ ہندوستان میں تو شاید انارکلی کو پڑھائی بہت کم لوگوں نے ہوگا۔ جب میں از ایلا تھورن کالج لکھنؤ میں سیکنڈ ایئر کی طالب علم تھی، میں نے انارکلی کے چند مناظر اسٹیج پر پیش کروائے تھے۔ ہیر دکن صولت دھن بنی تھیں جو اپنے اصل نسل مغلیہ چہرے مہرے کی وجہ سے واقعی انارکلی ہی معلوم ہوتی تھیں۔ گو بیچترن دتوش ایک غریب کتیر کی بجائے ایک نہایت بھاری بھر کم مثل شہزادی نظر آتی تھیں۔ رام پور کی ایک پٹھان لڑکی شہزادہ سلیم بنی تھی۔

دوسری بار کیلاش ہوسٹل کی پیش کش میں کلاں ہال انارکلی بنیں۔ وہ ادے شکر کے بچہ سینٹر الموزا میں رقص سیکھنے کے علاوہ لکھنؤ میں بھی بنگالی طرز کا تاج سیکھ چکی تھیں۔ کیلاش ہوسٹل والے ڈرامے کے لیے مکالمے یاد کرانے کا فریضہ میں نے فیروز کو سونپا۔ وہ چند روز قبل ہی علی گڑھ سے وہاں آئی تھیں اور بہت ہی عجیبی اور وقار کے ساتھ انھوں نے کتاب ہاتھ میں لے کر اداکاروں کو مکالمے یاد کروائے۔ اس مرتبہ نجی تال کی پہاڑی کریم لڑکی ای غدرے نے شہزادہ سلیم کا رول ادا کیا۔ ریسرسل میں بے انتہا تفریح رہی۔ راقم الحروف حسب معمول ڈائرکٹر۔ جب انارکلی کہتی ہندوستان کا شہزادہ اور ایک کتیر سے محبت۔ کیسی ہلکی کی بات۔ تو سارے کردار ایک قہقہہ لگاتے۔ ان سے کہا جاتا ہے بھائی تم چپ رہو۔ تم سے ہنسنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ غرض یہ کہ اسی طرح کی ہونق کے ساتھ ریسرسل کی گئی لیکن ڈراما بے حد کامیاب رہا۔ وائس چانسلر اور اسٹاف کے چند جفاوری پروفیسر بھی تشریف لائے تھے۔ فیروز جہیں نے اتنی محنت سے چند ساؤتھ افریکن لڑکیوں کو مکالمے اس طرح یاد کروائے تھے کہ امتیاز نعلی تاج کی اردو ان کی مادری زبان معلوم ہو رہی تھی۔

لندن پہنچ کر فیروز اور نیشنل اسکول میں شامل ہوئیں جو مختصر SOAS کہلاتا ہے اور پھر



انگلستان ہی میں مسئلہ سکونت اختیار کر لی۔ اس طرح ہمارے بہت سے غیر معمولی ذہنوں والے افراد مغرب میں قیام پذیر ہو گئے۔ واپس آئے تو حالات کو ناقابل برداشت پایا۔ لہذا دوبارہ جلاوطنی اختیار کی۔ میں نے ایک سینئر دانشور کو جرمنی میں دیکھا ہے جن کے واقعات کو ایک مثالی قصہ سمجھنا چاہیے۔ اردو کے پروفیسر تھے۔ جرمنی گئے۔ ایک جرمن خاتون سے شادی کر کے یہاں واپس آئے۔ وہ بیچاری جرمنی کے انتہائی صاف سترے اور صفائی پسند معاشرے کی پروردہ، یہاں آ کر بے پناہ گردوغبار کا سامنا کیا۔ لہذا اس کا سارا وقت اپنے بنگلے کی صفائی میں گزارتا۔ باہر لے جا کر دریاں اور قالین خود جھاڑتیں کیونکہ ملازم اتنی شدید صفائی کے عادی نہیں تھے۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد مع ہندوستانی شوہر اپنے وطن واپس گئیں۔ میں نے جرمنی میں ایسے متعدد گھرانے دیکھے جن کی یہی کہانی تھی۔ میاں انڈین ہوئی جرمن۔ ایک ایسے جوڑے کا بیٹا بھی ہو گیا تھا اور کلائی سے کہنوں تک چوڑیاں پہنے رہتا تھا۔ بہر حال دنیا بھی ایک عجیب تماشا گاہ ہے۔ ہماری فیروز بہت اچھی رہیں۔ لندن میں بھی انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے چھوٹے چھوٹے علی گڑھ، لکھنؤ، کلکتہ اور لاہور، کراچی تخلیق کر لیے تھے:

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

کل کی دنیا فیروز اور شہید کے بیٹے رابل کی ہوگی جو نہ علی گڑھ ہوگا نہ لکھنؤ نہ کلکتہ:

تھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر

بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

مجھے اچانک وہ منظر یاد آ جاتا ہے کیلاش ہوٹل کے کاسن روم میں ایم اے کی طالب علم

فیروز جیسی نئی نال سے آئی ہوئی انڈر گرجویٹ ایڈمرے کو مکالمہ یاد کروا رہی ہیں:

”راوی کے دلدادہ طراح! تو کیوں نہ گائے۔ لہریں نیند میں بہہ

رہی ہوں اور کشتی اپنے آپ چلی جا رہی ہو۔ پھر بھی نہ گائے؟ تو کیا جانے

جب وقت کی ندی بہتے بہتے سست پڑ جاتی ہے اور امید ساتھ چھوڑ دیتی ہے

تو کیا ہوتا ہے۔ (آہ بھر کر) جاشنق زار لہروں پر گاتا ہوا چلا جا اور خوش ہو

کہ تو شہزادہ نکس اور نہ سنگ مرمر کی چھتوں کے نیچے اور ہماری پردوں کے

اندھیرے گیت بھی دہلی ہوئی آپہں ہوتے۔"

(انارکلی، سید امتیاز علی تاج، ص 48)

راوی بہتی رہے گی گوتھی بھی اور دریائے یشتر بھی لیکن کیلاش ہوٹل کے ڈرائے کے  
ادا کار جن میں سے زیادہ تر نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور ان کی Prompter فیروز جیسی بھی  
عائب ہو گئیں گو وہ ڈراما اب بھی لامکان میں کہیں نہ کہیں ضرور اسٹیج کیا جا رہا ہے:  
اچھی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے

---

(ایم ایچ اردو، دہلی، جنوری 2008)

## ایک منفرد خاتون

(حسنہ لقمان حیدر)

حسنہ آپ ایک ایسی غیر معمولی خاتون تھیں کہ ان کی شخصیت کے متعلق کس طرح لکھوں اور بات کہاں سے شروع کی جائے۔ یہ پہلی سٹی اور پبلک ریلیشنز کا دور ہے۔ خاکہ نگاری بھی ایک ادبی صنف بن چکی ہے اور ذرائع ابلاغ کی روز افزوں ترقی کی بدولت اہم شخصیات کے متعلق بھی خوب خوب لکھا جا رہا ہے۔ لیکن جن افراد نے خود بیک گراؤڈ میں رہ کر اردو ادب و زبان کی خدمت کی، ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ہماری کزن بیگم حسنہ لقمان حیدر ان ہی نہایت غیر معمولی افراد میں شامل تھیں جنہوں نے اردو کے لیے بہت کچھ کیا مگر کبھی ان کا ذکر نہیں ہوا۔ نہ انہوں نے کسی شہرت یا صلہ کی تمنا کی۔ وہ ہماری سماجی تاریخ کے ایک نہایت اہم دور سے تعلق رکھتی تھیں۔

جاننا چاہیے کہ عہد مغلیہ اور سلاطین دہلی کے زمانے سے شمالی ہند کے قصبات علم و ادب کے مرکز رہے کیونکہ وہ آئے دن کی سیاسی یورش اور خلفشار سے محفوظ تھے جو ہمیشہ سے دلی کا مقدر

رہی۔ ان قدیم ترین قصبات میں سے کبھی میرا جانا ہوا اور میں نے ان بوسیدہ مکانوں کی ڈیڑھ سو پر نظر ڈالی تو مجھے ہمیشہ یہ خیال آیا کہ یہ کسی زمانے میں کیسی بارونٹی اور شادمانی سے معمور رہی ہوں گی۔ کسی مغربی ملک کے پرانے نیم ویران مکانات کو دیکھ کر اسی اور فم کا ایسا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مغرب کی وہ اداسیاں ہمارے اجتماعی کرب و اندوہ سے مختلف ہیں اور ہم ان کی شدت کو محسوس بھی نہیں کر سکتے۔ اولیور گولڈ اسمتھ نے جب اپنا ’وزر ٹیڈولج‘ لکھا تھا دنیا اس سے بہت آگے نکل آئی ہے۔ گو انگریز قوم جسے اپنی تاریخ سے عشق ہے۔ پرانی یادگاروں اور گاؤں کے ایک ایک سنگ ریزے کو نگینے کی طرح چمکا کر رکھتے ہیں۔

لیکن ہمارے قدیم قصبات منظر سے غائب ہوتے جا رہے ہیں اور وہاں اب دھواں اٹھتی فیکٹریاں ایستادہ ہیں۔ نہ پورے شہر میں ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے۔ اس کا اسلامی مدرسہ اور شہر کی پانچھ شالہ دونوں صدیوں پرانی درس گاہیں ہیں۔ اگر یہ انگلستان ہوتا تو ان درس گاہوں کی بڑی ہی تہذیبی اور فخر کے ساتھ دیکھ رکھی جاتی۔ قدیم ترین طرز تعمیر کے مکانات کو محفوظ کیا جاتا۔ یہاں اتر پردیش کے پرانے قصباتی خاندانوں کے کتب خانے، ان کے داروؤں کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد لٹا گئے یاد یک اور سیلن کی نذر ہوئے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کا میں ذکر پہلے کر چکی ہوں کہ وہاں نایاب کتابوں سے بھرے صندوق منتقل رکھے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہندوستان بھر کے روسا اپنے ذخیرہ کتب اس درس گاہ کو تحفہ پیش کرتے رہتے ہیں لیکن نہ ان کی فہرست سازی کی جاتی ہے نہ الماریوں میں انھیں سجایا جاتا ہے۔ یعنی متاع کارواں تو موجود ہے لیکن کارواں کے دل سے احساس بڑیاں جاتا رہا۔

ہماری حسد آپا اس دور میں پیدا ہوئی تھی جب اہل کارواں ابھی اپنے مال متاع پر بے حد نازاں تھے اور یہ مال زرو جواہر سے کہیں زیادہ قیمتی تھا یعنی جدید تعلیم اور نئی سوچ اور یہ مال خزانہ زیادہ تر شہر کوئل کے آس پاس رہنے والے قزاق ادھر ادھر سے لوٹ کر لائے تھے لیکن اپنی ذہنی کا زیادہ تر مال فرنگی عالموں کے ہنگوں سے لوٹا تھا یا خود سات سمندر پار جا کر انگلستان میں چوری چکاری کی تھی۔ وہ تو پرانی بات ہے۔ دور حاضر میں جب بھی میں برٹش میوزیم کی لائبریری یا

ایڈیا آفس کے کتب خانے کے کسی سنان گوشے میں کسی ہندوستانی کو ایک کتاب میں مستغرق دیکھتی ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ شاید یہ بندہ بڑی مشکلوں سے پیچھے جمع کر کے بغرض اعلیٰ تعلیم یہاں پہنچا ہے اور پھر مجھے ایک بار ملی گڑھ کے ایک پرچے میں ایک درخواست چھپی تھی، وہ یاد آئی۔ اس نوجوان نے شاید 1904 عیسوی یا اس کے آس پاس اس پرچے میں یہ لکھا تھا کہ کوئی صاحب حیثیت کرم فرما اس کے لیے انگلستان جانے کا ٹکٹ خرید دیں اور اس کے تعلیم کے اخراجات بھی مہیا کر دیں تاکہ وہ وہاں پہنچ جائے۔ یقیناً اس وقت کسی غیر رئیس نے اس کی مدد کی ہوگی۔ آج جبکہ ہر طبقہ کے افراد کے لیے انگلستان یا امریکہ جا کر پڑھنا ایک عام بات ہو گئی ہے۔ اس وقت یہ کیسا سہانا خواب اور کتنی عظیم الشان کامیابی رہی ہوگی۔

اب پھر قصبہ نہرو واہس تشریف لے چلے۔ یہ ایک قدامت پسند فیوڈل قصبہ تھا لیکن اپنی علم دوستی کے لیے پچھانا جاتا تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے روسائے چاند پور، شرفائے گلینہ اور دانش مندان نہرو کی شرح کی۔ کاسٹ سسٹم سے مغلوب قصبے میں چار مسلم کاسٹ بھی موجود تھے۔ سادات، شیخ، پٹھان اور مغل۔ اول الذکر گویا رہمن تھے۔ بکر یعنی جلا ہے گویا پانچویں کاسٹ۔ گو اُن سے چھوٹ چھات نہیں کی جاتی تھی لیکن وہ سادات کے سامنے کھٹ پر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ صدیوں کی پسماندگی اور تذلیل کے باوجود سارے ہندوستان کے ان پسماندہ طبقات نے روس کے عوام کی طرح علم بغاوت کیوں بلند نہیں کیا۔ وہ تو خیر پرانی بات ہے۔ آج بھی ہمارے قاصد و اشار ہوٹلوں میں متحول افراد لٹچ یا ڈنراڑاٹے ہیں، باہر کھڑے خستہ حال عوام در پچوں کے شیشوں میں سے انھیں جھانکتے رہتے ہیں لیکن انھوں نے آج تک یہ نہیں کیا کہ سب مل کر ان ہوٹلوں پر دھاوا بول دیں۔ وہ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ کیا محض اس لیے کہ وہ کرم یا قسمت کے قائل ہیں؟ یا اس وجہ سے کہ ان کے پاس لینن کی طرح کا کوئی لیڈر نہیں ہے۔

ہندوستان کا سماجی انقلاب ایک بورژوا تھا۔ وہ بہت حد تک کامیاب رہا۔ مختلف طبقوں میں سماجی شعور بیدار ہوا۔ آزادی نسواں کی تحریک بھی بہت حد تک کامیاب رہی اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلمان عورتوں نے کم از کم ان کے تعلیم یافتہ طبقات میں ایسی آزادی حاصل کی

جوایشیا کے دوسرے ملکوں میں اب تک موجود نہیں۔ اگر ایران یا مصر کی عورتیں مغربی لباس پہن کر سگریٹ جیتی ہیں تو یہ آزادی نہیں ہے۔ لیکن برصغیر کی عورتوں نے جس طرح اپنی بیداری اور سماجی اور سیاسی شعور کا ثبوت دیا ہے، اس سے اہل مغرب ابھی تک ناواقف ہیں۔ جس زمانے میں انڈیا، پاکستان، سری لنکا اور بنگلہ دیش چار ملکوں میں خواتین پر ائم فیسٹھیں۔ جرنی میں مجھ سے کسی لڑکی نے پوچھا تھا کیا تم لوگ گھڑے سر پہ رکھ کر ندی سے پانی بھرنے جاتی ہو اور میرے ایک کزن نے مانچسٹر میں اپنی انگریز ہم درس دوستوں سے کہا تھا ”جیسے تم لوگوں کے یہاں فیملی کار ہوتی ہے، ہمارے یہاں فیملی ہاتھی ہیں اور میں ایک چھوٹے ہاتھی پر بیٹھ کر اسکول جاتا ہوں۔“ تو وہ انگریز لڑکے اس کی اس بات کو جھجکے تھے۔ لیکن ہمارے یہاں یہ واقعہ ہے کہ موٹر کار اور ہاتھی ابھی تک اکٹھے موجود ہیں۔ راجستھان میں ایک دو واقعات سنی کے بھی رونما ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں آج بھی عموماً ایسے آن دیکھے لڑکوں سے شادی کر لیتی ہیں جن کو ان کے والدین نے منتخب کیا ہو۔ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے۔ ہماری والدہ نے اپنے ایک نوجوان عزیز کے دوست سے اپنی ایک کنبلی کی بیٹی سے شادی طے کر دوائی۔ صاحبزادی نے از ایلا تھو برن کالج سے بی اے کیا تھا۔ لیکن انھیں ان حضرت سے ملوایا نہیں گیا بلکہ انھوں نے ڈرائنگ روم کی ایک کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے ذرا سا جھانک کر ان صاحب کو دیکھا۔ شادی کی تاریخ پہلے ہی مقرر ہو چکی تھی۔ صاحبزادے نے لڑکی کو دیکھا ہی نہیں، شادی ہو گئی اور نہایت کامیاب رہی۔ ہمارے اُن ماسوں کا قصہ شاید پہلے کبھی لکھ چکی ہوں۔ وہ ایک بہت ہی وجہ اور خوش مزاج انسان تھے۔ جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو نواب صاحب جو ناگڑھ کے دولڑکے ان کے ہم درس تھے۔ جب ان میں سے ایک لڑکا گدی نشین ہوا، اس نے اُن ماسوں کا اپنے یہاں بہاء الدین کالج میں بطور پروفیسر تقرر کر دیا اور وہ جو ناگڑھ چلے گئے۔ ان کی ایک شہرہ تھی کہ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے بیاہ کریں گے۔ چنانچہ ہماری والدہ نے اپنے ایک قریبی دوست کی لڑکی سے ان کی شادی طے کر دوائی۔ لڑکی نے اے پی مشن گرلز ہائی اسکول دہرہ دون سے میٹرک پاس کیا تھا جو اس زمانے میں بہت بڑی بات تھی۔ مگر وہ لوگ دستور کے

مطابق لڑکی کی تصویر بھی نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ ان ماموں نے مجھ سے کہا ”تم ایک تصویر چرا لاؤ تو ہم تمہیں ایک بہت عمدہ جڑیا انعام میں دیں گے۔“ میں گڑیا کی لالچ میں اس پر خطر مہم کے لیے فوراً تیار ہو گئی۔ ایک روز بعد لڑکی والوں کے گھر جا کر میں نے ان کا الم کہیں رکھا دیکھا اور جب میں چپکے سے اس میں سے لڑکی، جنہیں میں چھوٹی آپا کہتی تھی، کی تصویر الم سے نکالنے لگی تو چھوٹی آپا کی ایک دوست جن کا نام ہندو تھا، انہوں نے الم میرے ہاتھ سے چھین لیا اور بولیں ”بڑی چالاک۔“ چنانچہ میں نے اشیاء واپس آ کر ان مرا کو بھی ناکامی کی اطلاع دی۔ بہر حال گڑیا وہ حسب وعدہ پھر بھی لے آئے۔

شادی کے بعد چھوٹی آپا جو ناگڑھ چلی گئیں۔ اب یہاں مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ سر شاہنواز بھٹو جو ناگڑھ کے چیف منسٹر تھے۔ 1977ء میں بمبئی سے لکھنؤ گئی ہوئی تھی اور چھوٹی آپا کی بڑی بہن بیگم صالحہ زیدی کے یہاں مقیم تھیں۔ ریڈیو پر ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے کی خبریں آ رہی تھیں اور شاید پھانسی کا حکم دیا جا چکا تھا۔ ایک روز صبح سویرے جب ریڈیو کھولا تو یہ ادھورا جملہ سنائی دیا:

"He was educated at Oxford."

اس جملے کے سیفہ نامی کے استعمال سے معلوم ہو گیا کہ ان کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ بڑی آپا کہنے لگیں۔ ان میاں نے انہیں پڑھایا بھی تھا اور جب میں جو ناگڑھ گئی تو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی کار بھیج کر ساری ریاست کی سیر کروائی تھی۔ میں نے کہا ”مجھے بھی یاد آتا ہے، ایک بار انگلستان سے واپس آتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو جہاز پر ہمارے ہم سفر تھے۔ میری کزن عذرا آپا اور سعید بھائی بھی اسی جہاز پر ساتھ آ رہے تھے۔ عذرا آپا ایک بے انتہا غیر معمولی طور پر حسین خاتون تھیں۔ سعید بھائی ان سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ بھٹو جو ایک لمبے بوائے مشہور تھے، ایک شام رقص گاہ میں عذرا آپا کے سامنے آئے اور جھک کر سعید بھائی سے درخواست کی:

"May I have the next dance with your daughter."

سعید بھائی نے غرا کر جواب دیا:

"She is my wife not my daughter."

بھٹو نے نہایت لجاجت کے ساتھ معذرت چاہی اور ڈانس فلوور واپس چلے گئے۔  
اس روز بھٹو کی پھانسی کی خبر سننے کے بعد تیسرے پہر کو میں عزیز بانو داراب وفا کے  
ساتھ قیصر باغ گئی تو دیکھا سارے شہر پر ایک عجیب سا سناٹا طاری تھا۔ غالباً سب کو یہ احساس ہوا  
تھا کہ اس سزائے موت میں کہیں نہ کہیں کچھ بے انصافی یا گڑبڑ ہوئی ہے۔ اسی رات میں بھٹی  
واپس آ رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ چار باغ ریلوے اسٹیشن کے لیڈیز دیننگ روم کی آیا  
آتش دان کے پاس جٹھی رو رہی تھی۔ کہنے لگی "میں صاحب! کیسے لوگ ہیں، انھوں نے اپنے  
رہبر کو مار ڈالا؟"

ذاتی طور پر مجھے نہ بھٹو صاحب کی سیاست سے کوئی دلچسپی تھی، نہ ان سے واقف تھی۔ ان  
کی بیوی نصرت سے البتہ ادھر ادھر پارٹیوں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ اس وقت نصرت  
اصفہانی تھیں اور انھوں نے صرف مجھے اتنا بتایا تھا "منزل ماں بھٹی است۔" کلکتے کے مشہور  
اصفہانی خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہر حال ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی ایک بہت ہی  
دہشت ناک واقعہ تھا، کیونکہ اگر ہم کسی شخص سے مل چکے ہوں اور پھر معلوم ہو کہ وہ تختہ دار پر چڑھ  
گیا۔ بہت ہی بھیا تک بات ہے۔

حسنا آپابھی چند سال بھٹی میں رہی تھیں جہاں ان کے شوہر سید لقمان حیدر کا ریڑ رو پینک  
آف انڈیا میں تقرر ہوا تھا۔ موصوف خود بھی ایک بہت ہی غیر معمولی شخصیت کے دانشور تھے۔ وہ  
بھی علی گڑھ میں مجاز، علی سردار جعفری، قاضی جلیل عباسی، قاضی یونس اور سید جبار حیدر کے گروہ  
میں شامل رہے تھے جنھوں نے 1930 عیسوی اور 1940 عیسوی کی دہائی میں اس دانش گاہ میں  
تعلیم حاصل کی تھی۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ حسنا آپا نے 1937 عیسوی میں علی گڑھ سے بی  
اے پاس کیا۔ وہ ضلع بجنور کی پہلی گریجویٹ خاتون تھیں۔ اس سے قبل وہ کانوینٹ آف جنارس  
ایڈ میری دہرہ دون میں پڑھتی رہیں۔ 1937 عیسوی میں ان کی شادی، اپنے کزن سید لقمان  
حیدر سے ہوئی۔ وہ ایک یادگار تقریب تھی۔ آل انڈیا مشاعرہ بھی اس تقریب میں شامل تھا۔ مگر



مراد آبادی، ساغر نظامی، سیاب اکبر آبادی، روش صدیقی وغیرہ جو بچاٹا رحیدرزیدی کے قریبی دوست تھے، وہ بھی اس مشاعرے میں شامل ہوئے اور جگر صاحب کی ایک پسندیدہ مطربہ شیرازن نے زمانہ محفل میں رقص بھی کیا تھا۔

حسہ آپا کی شادی کے فوراً بعد ہی ان کے چھوٹے بھائی سید جراحیدر کی شادی کے موقع پر جب برات سہارن پور سے ریاست ٹونک گئی، راستے میں ہرائیشن پر جہاں گاڑی کافی دیر کے لیے ٹھہرتی، پلیٹ فارم پر دعوت کے لیے چاند نیاں بچادی جاتیں۔ اس تقریب کے مشاعرے کا مجموعہ کلام رسالہ 'شاعر' نے ایک خصوصی نمبر میں شائع کیا تھا تو مطلب کہنے کا یہ ہے کہ مشاعرہ اور شعر و شاعری ہماری تہذیب کی اہم ترین خصوصیات تھیں۔ نوڈل دور میں زوالی سلطنت مظہر کے بعد شکست خوردہ مسلمانوں نے شعر و شاعری میں پناہ تلاش کی۔ اگر اسی تہذیب سے جدید تعلیم کی طرف وہ راغب ہو جاتے تو یہ فرقہ اتنی پس ہمتی اور ذہنی انتشار کا شکار نہ ہوتا۔ بنگال اور مہاراشٹر کا ہندو یہ لحاظ ترقی ان سے ایک صدی آگے نکل چکا تھا۔

شیخ عبداللہ نے سوانح عمری عبداللہ بیگم میں لکھا ہے کہ ایک شام نواب محسن الملک کی کوشی کے سامنے چوڑے پران بزرگوں کی خدمت میں ہم چند نوجوان بھی حاضر تھے۔ اس وقت سجاد حیدر یا شاید ابو محمد نے کہا کہ لڑکیوں کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا جائے تو نواب صاحب نے ہنسنے کے مارے اپنی ٹوپی اتار کر چوڑے پر پھینک دی اور فرمایا "مسلمان قوم ابھی لڑکوں کی تعلیم کے لیے تیار نہیں ہے اور تم لڑکیوں کی تجویز لے بیٹھے۔" لیکن یہ مدرسہ قائم ہوا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کی سرپرستی کی اور مجھے تعجب ہے کہ آج تک نئے ہندوستان کی عظیم ترین رہنما خواتین میں نواب سلطان جہاں بیگم کا نام تک نہیں لیا جاتا، نہ یہاں اور نہ پاکستان میں۔ بلکہ ایک ادبی کانفرنس میں، میں نے ملکہ دکنوریہ کی ایک تصویر دیکھی، جس کے نیچے الیہا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال کا نام لکھا تھا۔ علی سردار جعفری بھی اس کانفرنس میں موجود تھے۔ میں نے انھیں یہ تصویر دکھائی اور ہم لوگوں نے کانفرنس کے منتظمین سے اس کے بارے میں کہا بھی مگر انھوں نے سنی آن سنی کر دی اور یہ دانش گاہوں میں نہایت جوش و خروش اور اداوالمعری کا دور تھا اور

ترقی پسند تحریک اسی دور میں پروان چڑھی۔ میں پہلے بھی لکھ چکی کہ ہم زینہ بہ زینہ برطانیہ اور یورپ کی تحریکوں سے متاثر ہوئے اور نئی روشنیاں بھی اسی سمت سے ہندوستان پہنچیں۔

جب بحری جہاز برطانیہ کے جنوبی ساحل کے نزدیک پہنچتا تھا تو گھپ اندھیری رات میں بہت دور سے ساحل کی سرچ لائٹس نظر آنے لگتی تھیں اور وہ ایک عجیب نظارہ ہوتا تھا اور پھر سمندر پر ساحل کی طرف بڑھتے ہوئے جہاز سے یہ روشنیاں نظر آتی تھیں۔ یہ روشنیاں دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا، اسی ساحل سے روانہ ہو کر ان برطانوی جہازوں کے مسافروں نے مشرق میں تعمیر و تخریب کے کیسے کیسے گل کھلائے۔ اس کبر آلود چھوٹے سے جزیرے کے باشندوں نے ہندوستان سے کیا کچھ حاصل کیا اور کیا کچھ دیا۔ تاریخ کے حوال پر ہمارا بس نہیں۔ یہ تیز رفتار گاڑی ہے جو اندھا دھند چلی جا رہی ہے۔ مورخ اور طالب علم اپنے اپنے دور اور اپنی اجتماعی اور انفرادی سوچ کے لحاظ سے اس کے نتائج برآمد کرتے ہیں۔ آج سے محض چند سال قبل کی بات ہے کہ ایک روسی دانشور نے بمبئی میں مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے لندن کی اسٹریٹ واکرز کا تذکرہ سنا ہے۔ وہ کون ہیں اور کیا کرتی ہیں؟ اور اب ایسی کاپالٹ ہوئی کہ میں نے ابھی حال ہی میں کسی رسالے میں تصویر دیکھی کہ عین کریملن کے سامنے ریڈ اسکوائر میں چند روسی اسٹریٹ واکرز کھڑی سگریٹ پی رہی ہیں۔ ناقابل یقین۔ اگر ہمارے نہایت مخلص بائیں بازو والے دانشور کرشن چندر، علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، بلراج سہنی وغیرہ زندہ ہوتے تو روس اور سارے اشتراکی یورپ کی یہ ترقی معکوس دیکھ کر ان پہ کیا گزرتی۔ علامہ اقبال تو فرما دیتے:

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی بائیں بازو کی تحریک بالکل براہ راست برطانیہ سے یہاں پہنچی۔ لاہور، علی گڑھ، لکھنؤ اور کلکتہ شمالی ہند میں اس تحریک کے اہم ترین مرکز تھے۔ 1930 عیسوی سے 1947 عیسوی تک علی گڑھ میں بھی بہت جوش و خروش طاری رہا اور پروفیسر محبت الحسن، قاضی جلیل عباسی، سید جراحیدر، علی سردار جعفری، مجاز، معین احسن جذبی، غلیل الرب، محمود صاحب، مختار حامد علی، سید محمد نوکی صاحب، صابرہ زیدی یہ اور کئی دانشور اس گروپ میں شامل تھے اور

برطانیہ کی Pink Decade کے اہل قلم نے ہندوستان کے اس گروپ کو گہرے طور پر متاثر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ سوویت لٹریچر نے بھی اپنا رنگ بنایا۔ ماسکو میں سوویت دولت کے انگریزی ترجمے شائع کیے گئے۔ ہندوستان سے چند اردو ادیب ماسکو پہنچ کر وہاں کے دارالترجمہ میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ اب خود اختیاری جلاوطنی والے اہل قلم دو گروہوں میں شامل تھے۔ ایک گروہ ماسکو، پراگ وغیرہ میں اور دوسرا برطانیہ اور امریکہ میں آباد ہو گیا۔ ماسکو میں رہنے والے ہندوستانی ادیبوں کا معیار زندگی عام روسیوں سے مختلف نہیں تھا۔ اس کے برعکس لندن اور امریکہ وغیرہ میں وہ زیادہ متحمل نظر آئے۔ روس میں Consumers Goods کی قلت تھی۔ مجھے یاد ہے۔ میں دوسرے سوویت یونین گئی اور وہاں میری روسی دوستوں نے کہا ہمیں اپنے آپ اسٹاک وغیرہ دینی جاؤ۔ اور یہ واقعہ ہے کہ مغربی یورپ کے مقابلے میں سوویت یونین کافی خستہ حال تھا۔ جب ہم کسی قافیہ اسٹار ہوٹل میں پہنچا یا ڈنر کھاتے تو عوام باہر کھڑکیوں کے شیشوں سے اپنے چہرے چپکا کر ہمیں دیکھتے۔ لینن کی نقش می بنا کر ایک شیشے کے کس تابوت میں رکھ دی گئی تھی اور میں نے چشم خود دیکھا کہ دولہا دلہن رجسٹرار آفس سے نکل کر لینن کے تابوت کی طرف گئے اور اس پر پھول چڑھائے یعنی عیسوی مسیح کی جگہ لے لی تھی اور می کی پرستش بھی قدیم روسی روایت میں شامل تھی۔ میں نے 'کیو' کے گرجا میں پادریوں، راہبوں اور راہبات کی آن گت حوٹ شدہ لاشیں دیکھیں اور یہ سارا منظر مجھے بہت بھیا تک لگا۔ چنانچہ کوئی قوم اپنی قدیم نسلی مذہبی اور تہذیبی روایات کو آسانی سے بھول نہیں سکتی، حتیٰ کہ کیونزم کے دور میں بھی روایت زندہ رہی۔ ورنہ لینن کو می بنا کر شیشے کے تابوت میں رکھنے کی کیا تک تھی۔

قیام پاکستان کے چند سال بعد ہی ہمارے کزن سید لقمان حیدر ریڑ روچیک آف انڈیا جو اب اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے تبدیل ہو کر ڈھاکہ گئے، وہ ایک حیرت انگیز انسان تھے۔ انھوں نے ڈھاکہ کے میں رات رات بھر کام کر کے شرقی پاکستان میں اسٹیٹ بینک کی شاخیں قائم کروائیں۔ یہ میرا چشم دید واقعہ ہے جب میں ان کے یہاں جاتی تھی تو میں نے دیکھا تھا کہ رات بھر ان کی اسٹڈی میں روشنی رات ہی اور حسد آ پا جو انھیں ہڑ ہائی نہیں پکارتی تھیں وہ ہتھیار ڈالنے

والے انداز میں کہتی تھیں ”ہر ہائی ٹیکس صبح تک کام کریں گے۔“ یہ واقعہ ہے کہ میں نے اُن جیسے مخلص اور آئیڈیل انسان بہت کم دیکھے۔ لیکن صوبہ جاتی انتخابات کی وجہ سے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر دوسرے افراد بننے رہے۔ اس بے انصافی کے باوجود اپنے کام سے لگن میں کبھی کمی نہیں آئی اور وہ اسی طرح معروف رہے۔ ایک واقعہ مجھے یاد ہے انھیں کسی سرکاری کام سے آسٹریلیا بھیجا گیا، کچھ عرصے بعد واپس آ کر انھوں نے زر مبادلہ کی آدمی رقم بینک میں واپس ڈال دی اور کہا ”مجھے بلا وجہ پاکستان کا قارئین کیپٹل ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

لقمان بھائی بے انتہا نفاست پسند اور آرائش مزاج رکھتے تھے۔ ہماری والدہ سے ان کی خوب چٹنی تھی۔ ایک دن تشریف لائے اور کمرے میں ٹہل ٹہل کر نہایت غم دغصے سے فرمایا ”جی جان خاندان تباہ ہو رہا ہے۔“ اماں نے گھبرا کر پوچھا ”خیر تو ہے، کیا ہوا؟“ اپنے کسی عزیز کا نام لیا اور فرمایا ”میں کل ان کے یہاں گیا تھا، ان کے ڈرائنگ روم کے ایک پردے میں سوراخ نظر آ رہا تھا، کسی کو اس کی پروا نہیں۔“

وہ ایک جید ماہر اقتصادیات تھے لیکن وہ بھی نام و نمود کے چکر میں کبھی نہیں پڑے۔ ڈھاکے میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی عمارت مجھے جیسی History Bug کے لیے ایک عراغینز جگہ تھی۔ اٹھارہویں صدی میں ڈیج ایٹ انڈیا کہنے نے بطور گورنمنٹ ہاؤس بنوائی گئی تھی اور اس کے برآمدوں کے گول ستون بہ لحاظ قطر سارے برصغیر کے ان جارجین کولونیل ستونوں میں جسم ترین ستون تھے۔ ہمارے یہاں یو پی میں کہنی اسٹائل ستونوں کو پیل پائے بھی کہا جاتا تھا یعنی ہاتھی کے پاؤں۔ اب یہ اصطلاح بالکل فراموش کر دی گئی ہے۔ میں نے کہیں پیل پائے کھسا تو اردو کی ایک ریسرچ اسکالر نے ہنس کر پوچھا ”یہ کیا چیز ہے؟“ ایک بار ڈھاکے میں ایک ادبی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں انگلستان کے چند مشہور ادیب بھی آئے تھے۔ میں نے رسالہ ’بیج‘ کے ایڈیٹر سے اس عمارت کا تذکرہ کیا تو وہ بے حد مضطرب ہوئے اور کہا ”مجھے ابھی چل کر دکھاؤ۔“ چنانچہ میں انھیں لقمان بھائی کے یہاں لے آئی اور وہ فرنگی دانشوران جیل پاؤں کا قطر دیکھ کر دنگ رہ گیا اور کہنے لگا ”تمہارے یہاں اس برصغیر میں فن تعمیر کے کیسے کیسے نوادرات موجود

ہیں لیکن کسی کو ان کی پروا نہیں بلکہ یہاں تو جن جہلا کے ہاتھ میں اقتدار ہے، وہ نہایت بے دردی سے ان کو ملیا میٹ کر رہے ہیں۔“

حسہ آپا نے ڈھاکے میں انجمن ترقی اردو کی سکرٹری کی حیثیت سے بہت سی مدد سے کام کیا۔ اس وقت تک اردو کے خلاف قصبہ بچے شرمہ نہیں تھا۔ مقتدا باحا کے میں بہت سے اردو شاعر اور ادیب موجود تھے جو کسی نہ کسی ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں وہاں آئے تھے۔ جب میں وہاں جاتی تو مختلف اردو تنظیموں کی طرف سے جیلے وغیرہ منعقد ہوتے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کا اردو ڈپارٹمنٹ بھی بہت فعال تھا، علاوہ ازیں حسہ آپا کے یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی ادبی نشست یا سینک و غیرہ ہوتی رہتی۔ چند سال بعد جب ڈھاکہ میں اردو والوں کے قتل عام کی خبریں پریس میں آئیں تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا کہ یہ کیسے ممکن ہوا۔ پھر مشرقی پاکستان سے متعدد اردو والے بطور پناہ گزین اٹھ آیا آئے تو اور زیادہ کوفت ہوئی۔ ایک مشہور ادیب مجھ سے ملنے کے لیے میرے دفتر میں تشریف لائے اور اپنے ہاتھ دکھا کر بتایا کہ انہیں کس طرح زخمی کیا گیا تھا اور پھر وہ کس طرح اپنی جان بچانے کے لیے ایک جنگل میں چھپے رہے اور اب وہ سب اسی اٹھ یا میں پناہ لینے کے لیے آئے تھے جواب تک ان کا دشمن ملک کہلاتا تھا:

رسمہ مملکت خویش خسرواں دانند

گدائے گوشہ نشینی تو حافظ! عزدش

حسہ آپا ادب کی بہت اچھی پارکھ تھیں۔ شاعری تو خیر ان کی گھنٹی میں پڑی تھی۔ ان کے والد سید نثار حیدر زیدی نہایت قادر الکلام اور خوش گو شاعر تھے۔ یہاں میں پھر وہی بات دہراؤں گی کہ جس طرح جاپان میں پھولوں کی آرائش ایک قوی فن ہے۔ شاعری کو اردو والوں کی ہاضمانی سمجھنا چاہیے۔ مہد سے لحد تک خوشی اور غمی کے ہر موقع کے لیے شعر گوئی موجود ہے۔ اشعار ہیں کہ ڈھلے ڈھلائے بہ صورت آبشار اپنی موسیقی بکھیرتے رہتے ہیں۔ ان پڑھ افراد بھی شعر گوئی پر قادر ہیں۔ چنانچہ تعلیم یافتہ گھرانوں میں بہت سی ایسی خواتین موجود تھیں جو اپنی بیاض میں اپنے کہے ہوئے اشعار رقم کرتی رہتی تھیں۔ شاعروں کے موقع پر سہلے لکھنا بھی ایک دل پذیر رسم تھی۔

ہماری والدہ نے اپنے ایک کزن کی شادی پر جو سہرا لکھا تھا، اس کا ایک شعر تھا:

نوشہ بنے لطفنر، چکے فلک پر اختر

جھک جھک کے چوستا ہے کیا ماہتاب سہرا

اختر دولہا کے بھائی کا نام تھا۔ دولہا کی شادی چودھری محمد علی رددلوی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ چودھری صاحب بھی ایک غیر معمولی ادیب تھے۔

ہمارے یہاں شادی کے موقع پر مردان خانے میں نایار باب نشاط کے رقص کی محفل اب ترک کی جا چکی تھی اور اس کے بجائے آل انڈیا مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا جس میں جگر صاحب، سیما، ساغر نظامی وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ ورنہ ایک زمانے میں ہمارے یہاں کی باراتوں کے ساتھ تخت رواں پر نایار کا صاحبائیں ناچتی جاتی تھیں۔ گو میری سمجھ میں یہ کبھی نہیں آیا کہ مزدوروں کے کندھوں پر رکھے ہوئے تخت کے اوپر کھڑے ہو کر ناچتے ہوئے وہ بے چاریاں اپنا توازن کس طرح قائم رکھتی ہوں گی۔ لیکن معلوم یہ ہوا کہ راستے میں جہاں جہاں بارات رکتی تھی وہاں وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ وہ نرنکیاں بھی اب کب کی معدوم ہو چکی ہیں۔

ڈوم، ڈومنیوں، سرائی اور مراحموں کے علاوہ ایک فرقہ دھاڑی دھاڑوں کا کہلاتا تھا۔ میں نے شاید پہلے کہیں لکھا ہے کہ ہم لوگ کسی شادی میں گئے تھے جہاں دولہا کے والد نے ملک کی مشہور اور بلند پایہ کھٹک ڈانسر کو بھی مدعو کیا تھا۔ ہمارے ساتھ بارات میں دلی کے ایک بہت نای گمراہی کا کسٹھ خاندان کے کسٹھ رئیس بھی شامل تھے۔ انھوں نے اس عالی مرتبت فن کار کی کسی بات ہنڈراسازج ہو کر مجھ سے نیچی آواز میں کہا تھا ”یہ ڈوم دھاڑی کہاں سے آگئے۔“

ہماری والدہ بھی جو اکثر پرانی اصطلاحات استعمال کرتی تھیں کبھی کہتی تھیں ”پرسوں جو فلاں فلاں کا دھاڑاٹوٹا تھا۔“ اب یہ فقہرہ دھاڑاٹوٹا آج کے کسی اردو دالے کی سمجھ میں نہیں آئے گا، آپ ہی بتائیے کہ آپ کیا سمجھے؟

حسن آ پا ایک خوش گو شاعرہ تھیں اور انھوں نے یہ صلاحیت اپنے والد سید ثار حیدر زیدی سے ورثے میں حاصل کی تھی۔ پچا ثار حیدر بھوپلی کے جن اصلا ح میں تعینات رہے وہاں ان کا

جائے قیام ایک شعرستان بن گیا جہاں اردو کے نامور شعرا آکر قیام کرتے اور شعر و سخن کی محفلیں منعقد کی جاتیں۔ جگر، سیاب، مسافر نظامی اور روش صدیقی کے علاوہ نوجوان ادیب ظ. انصاری بھی ان کے یہاں قیام کرتے تھے اور بحیثیت ایک نابالغ تعلقہ اربابہ بکلی کے وارث کرمانی کا حکومت نے چچاٹار کونگراں مقرر کیا تھا اور وہ انہیں کے یہاں رہتے تھے۔

حسنہ آ پا ایک بے حد خوش مزاج اور نیک دل خاتون تھیں۔ ڈھاکے کے زمانہ قیام میں انہوں نے بڑی لگن کے ساتھ اردو کی ترویج و ترقی میں حصہ لیا۔ ان کی جائے قیام اردو کے علاوہ بنگالی ادیبوں کا بھی ایک مستقر بن گئی۔ وہ منہر ازمانہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ جب میں مشرقی پاکستان جاتی تھی اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی بالائی منزل کا نہایت وسیع و طویل برآمدہ بنگلہ اور اردو اہل قلم کی چہل پہل سے معمور رہتا تھا۔ اس وقت آنے والے دور کے متعلق کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ شاعرے بھی خوب ہوتے لیکن حسنہ آ پا اپنا کلام کسی سے پڑھوانے کی اجازت دے دیتی تھیں مگر ہمارے یہاں کی خواتین نے جن میں میری والدہ اور خالہ ثروت آرا بیگم بھی شامل تھیں جنہوں نے اپنا کلام کبھی شائع نہیں کروایا۔ اردو تہذیب بنیادی طور پر شاعری کی تہذیب تھی اور شعر گوئی مشرقی تمدن کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ الفاظ ہمارے یہاں بطور سجاوٹ اور زیبائش استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہماری کلچر کی پرکھلے گفتگو کو اگر انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو وہ بہت ہی انوکھا پن معلوم ہوگا۔ خصوصاً پرانی وضع کی بیگماتی اردو جواب رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ میری آنکھوں میں خاک... سات قرآن و درمیان دور پار چھائیں بھونیں... وغیرہ وغیرہ۔

زبان ایک تہذیب کی ترجمان ہوتی ہے۔ جب اس تہذیب کی زبان بھی مخلوط ہو جائے تو زبان کی بھی کچھڑی بنے گی۔ یہ عمل تو ہمارے یہاں اب ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے۔ ہم کالج اور اسکول کی جمع کالچوں اور اسکولوں، ٹیچروں، ڈاکٹروں وغیرہ کہتے ہیں اور یہ ساری ترکیبیں اردو میں شامل ہو چکی ہیں۔ ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کا ترجمہ ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ خالص کسالی اردو اب کہاں ہے۔ ایرو پلین تو ہوائی جہاز بن گیا۔ موٹر کار انجن وغیرہ کا

ترجمہ نامکمل ہے۔

حسنہ آپا ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں جو اس دور کے بیشتر گھرانوں کی طرح علم و ادب کا شائق تھا۔ عام دستور یہ تھا کہ جن خاندانوں نے مغربی طرز زندگی بھی اختیار کر لی تھی اور ان کے بچے کانویٹ اسکولوں میں پڑھ رہے تھے مگر گھر پر قرآن شریف اور اردو فارسی پڑھانے اور خوشحالی سکھانے کے لیے مولوی صاحب آتے تھے۔ عید بقر عید پر انتہائی خوشنما عید کارڈوں کی ریل پیل رہتی تھی جن پر حسب موقعہ اشعار چبھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہولی اور دیوالی کے کارڈ ان کی دیکھا دیکھی ہی چبھنے شروع ہوئے اور یہ عید کارڈ بھی ہم نے کرس کارڈ کی تقلید ہی میں شروع کیے۔ کیونکہ العمر حوم بتلاتے تھے کہ ان کے بچپن میں عید کی مناسبت کے اشعار خوشنما کاغذوں پر خوشخط لکھ کر بچوں کو دیے جاتے تھے۔ سالگرہ کا ایک بھی ہم نے انگریزی کلچر سے لیا۔ گڈ نائٹ کا ترجمہ شب بہ خیر بھی غالباً مغل کلچر میں شامل نہیں تھا۔ کوشی، بنگلہ، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم وغیرہ وغیرہ جو آج ہماری ملل کلاس کلچر کا لازمی جز ہیں، پہلے مفقود تھے۔ باہر مروان خانے میں چند کرسیاں ایک پٹنگ، اندر زنان خانے میں تخت، چڑھی، سہری، کھاٹ، نیچے پاپوں کی صندلی وغیرہ اشریہ ریڈیکوریشن امرا کے یہاں جو تھا سو تھا، عام ملل کلاس گھروں میں اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ مجھے معلوم نہیں وکٹوریہ فرنیچر سے پہلے ہندوستانی گھروں میں کس قسم کا سامان رائج تھا۔ البتہ میں نے اپنی نیکہال کے ایک فیوڈل گھرانے میں نقشین ڈھول سے ضرور دیکھے، جن میں کپڑے رکھے جاتے تھے۔ انگریزی Box کو ہم نے بکس بنالیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے برطانوی مصنوعات کے ذریعے بھی ہندوستان پہنچا دیا ہوا۔ کلکتے کے بنگالی بابو اور بمبئی کے پارسیوں نے اپنے گھر اس انگریزی طرز سے سجائے۔ ادھر ہندوستان میں خوش حال اور ماڈرن خیالات کے افراد نے محلوں کے مکانات ترک کر کے سول لائسنز کی کوشیوں میں رہنا شروع کیا۔ میں پہلے کہیں لکھ چکی ہوں کہ یہ کولھیاں انگریزوں کے لیے مہاجنوں نے بنوائی تھیں اور ہر کوشی کے عقبی حصے میں اونچی دیواروں والا صحن اور وسط میں گول چبوترہ ہوتا تھا۔ زیادہ تر انگریز اپنی کوشیوں کے عقبی حصوں میں اپنے ہندوستانی حرم کی عورتیں رکھتے تھے۔ یہ عورتیں پردہ نشین تھیں۔ لہذا ان



کے لیے یہ محن بتائے گئے، شام کے وقت صاحب بہادر آنگن کے وسطی چہوترے پر بیٹھا تھا اور اس کے حرم سرا کی عورتیں بیڑھیوں پر محفل آرائی کرتی تھیں۔ 1888 عیسوی میں نہر سویر کھلنے کے بعد بن بیاہی انگریز لڑکیوں نے شوہروں کی تلاش میں ہندستان آنا شروع کیا اور یہ سماجی فتنہ اچانک بدل گیا۔ ہندستانی حرم سرا ہر طرف ان کی جگہ بیسوں نے لے لی اور ان ہی انگریز عورتوں نے ہندستان میں کلر بار ایستادہ کی۔ وہ ہندستانی سانولی عورتوں کی دل کشی سے خائف تھیں۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں کا ہندستانیوں سے میل جول ترک کر دیا۔ نینو لوگوں کی تحقیر کی اور یہ کلر بار مستحکم ہو گئی۔

حنہ آپا بھی چونکہ اسی انڈیا کلکٹین کلچر میں پیدا ہوئی تھیں۔ انھیں اور ان کی چچا زاد اور خالہ زاد بہنوں کو اس نئی کلچر کی نمائندہ خواتین کہا جاسکتا ہے۔ گوان سے قبل ان کی نوع کی خواتین کی دو تین بیڑھیاں ہمارے معاشرے میں نمودار ہو چکی تھیں۔ اس زمانے کے زمانہ اردو رسالے میں لکھنے والیوں کے نام پڑ جیسے جن کے شہر کا پتہ ساتھ ہی چھپتا تھا تو تعجب ہوتا ہے کہ پشاور سے لے کر مدراں، بمبئی اور ڈھاکے سے لے کر کراچی تک اردو کی مضمون نگار خواتین کا ایک نیٹ ورک قائم ہو چکا تھا اور ان کے مضامین کا تنوع اور پختگی بھی بہت ہی حیرت انگیز تھی۔ اخلاقی قسم کے افسانے بھی لکھے جا رہے تھے۔ رومانی افسانے نذر سجاد حیدر اور مس حجاب اسامیل بھی خوب خوب لکھ رہی تھیں۔ ان افسانوں کے کردار نئی روشنی کی پروردہ سوسائٹی کے نمائندے تھے۔ حنہ آپا نے بھی جو ناولٹ لکھے وہ اسی سماج کے عکاس تھے۔ لیکن اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک کا ڈنکا اتنے زور و شور سے بجا کہ باقی آوازیں اس میں ڈوب گئیں۔ حنہ آپا بھی مٹی گڑھ میں عصمت کی ہم درس رہ چکی تھیں اور ان کی قریبی دوست تھیں لیکن شادی کے بعد وہ خانہ داری کی مصروفیات کے باوجود شاعری کرتی رہیں جس کی صلاحیت ان کو اپنے قادر الکلام والد سید ثار حیدر زیدی سے ورثے میں ملی تھی۔ انھوں نے ایک ناولٹ بہ عنوان آمنہ بھی لکھا تھا۔ سوشل ریفارمس کا موضوع تھا۔ وہ ایک بہت ہی غیر معمولی کردار کی خاتون تھیں۔ ایسے افراد کو آج کل ہیومنٹ کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں نہ یہ اصطلاحات رائج تھیں، نہ ان کی پہلی مٹی کی جاتی تھی۔ ان کی

شخصیت میں ایک وصف اور بھی تھا کہ وہ اپنے والد اور اپنے بچاؤں کے گھروں کی مانند اپنی ہاؤس رکھتی تھیں۔ ان کے دروازے غریب اور مستحق رشتہ داروں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ وہ صاحب فراش عزیزوں کی عیادت کے لیے دور دور تک جاتی رہتی تھیں۔ انھوں نے اپنی خالہ زاد بہنوں کے ساتھ کالونیٹ آف جنیرس اینڈ میری دہرہ دون میں پڑھا تھا جس کے بعد انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایف اے اور بی اے پاس کیا۔ مشاعروں میں ان کا کلام کسی سے پڑھا دیا جاتا تھا۔ شادی کے فوراً بعد وہ بمبئی تشریف لے گئیں جہاں ان کے شوہر ریزرو بینک آف انڈیا سے منسلک تھے۔ بمبئی میں ان کا فلیٹ کالج روڈ مانٹوٹکا میں تھا۔ وہاں انھوں نے اپنے پڑوسی پر قصوی راج کپور کے بیٹے راج کپور کو اردو پڑھائی۔

حسنہ آپا خدمتِ خلق کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کی نہایت خاموشی کے ساتھ ہر طرح کی امداد کی۔ وہ ایک نہایت بٹاش اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ کبھی کسی کی برائی یا اہانت یا نکتہ چینی بھی ان کی زبان سے نہیں سنی گئی۔ لیکن وہ ایک پروفیشنل Do-Gooder نہیں تھیں ورنہ وہ بڑی آسانی سے لیڈری بھی کر سکتی تھیں۔

1947 عیسوی میں لقمان بھائی پاکستان چلے گئے۔ لاہور میں بھی انھوں نے بڑی خاموشی سے مصیبت زدہ مہاجرین کے لیے کام کیا۔ جب لقمان بھائی تہذیبی ہو کر ڈھاکہ گئے تو حسنہ آپا نے ایک نہایت عظیم الشان سماجی خدمت اسی خاموشی سے یہ انجام دی کہ انھوں نے ڈھاکہ میں اردو کے پودے کی آبیاری کی۔ کراچی واپس آ کر اپنی زندگی کے آخری زمانے تک وہ بڑی گرم جوشی سے سوشل خدمات انجام دیتی رہیں۔ انھوں نے اپنی کوششوں میں لڑکیوں کے لیے تباخی کی کلاسوں میں جو کیک پیشی وغیرہ تیار ہوتیں وہ شام کی چائے پر گھر والوں کے لیے پیش کی جاتیں اور لگتا تھا یہ گویا کسی فائینہ اسٹار ہوٹل کی میز ہے۔

قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ یہ سارے کارناموں کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو بالکل گمنام رکھا اور کسی قسم کی جہلی شئی سے دور رہیں۔ نہ انھوں نے اپنے اس مدرسہ تباخی کے لیے کوئی سرکاری گرانٹ لی اور نہ لڑکیوں سے کوئی فیس حاصل کی۔ سارا کام، محنت، جوش و خروش محض

اس لیے تھا کہ سوسائٹی کی لڑکیاں تاجنی کی مہارت بھی حاصل کر لیں جو پہلے زمانے میں وادی، مانی سکھلا دیتی تھیں لیکن دورِ حاضر میں ایک ماڈرن ہاؤس وائف کے لیے اپنی گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے یہ ممکن نہ تھا۔

حسہ آپا نے مشرقی پاکستان میں بھی نہایت فعال زندگی گزاری۔ لاہور اور کراچی میں بھی ان کی ان غیر معمولی سماجی خدمات میں کمی نہیں آئی۔ حالانکہ خاندانِ نبھور میں بنیادی طور پر یلدرم کی ہمت افزائی کی وجہ سے لڑکیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ان کے والدین کو یلدرم ہی نے تعلیم نسوان کی طرف راغب کیا اور اب جبکہ خاندان میں متحد لڑکیاں گرجوٹ بن گئیں اور سب سے پہلے خود حسہ آپا نے بی اے پاس کیا تو ان کی والدہ نے غار حیدر زیدی صاحب سے کہا ”آپ اپنی بیٹی کو آگے نہیں پڑھانا چاہتے تھے اور اب وہ پورے ضلع کی پہلی گرجوٹ لڑکی بن گئی۔“ حسہ آپا کی سماجی اور علمی خدمات سے ان کے والد بعد میں بے حد متاثر اور سرور ہوئے تو ان کی بیگم صاحبہ نے کہا ”آپ ہی اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خلاف تھے اور اب خوش ہو رہے ہیں۔“

ڈھاکہ، لاہور اور کراچی ان تین مقامات میں حسہ آپا نے نہایت خاموشی سے اردو کے لیے بہت کچھ کیا لیکن کبھی اپنے آپ کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ منگل امر اہی کا یہ وصف انھوں نے یلدرم سے دورے میں حاصل کیا تھا جو ان کے والدین کے فرسٹ کزن تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تب بھی اردو دنیا میں خاموشی طاری رہی کیونکہ بیگم حسہ لقمان حیدر کے متعلق کوئی کچھ زیادہ جانتی ہی نہیں تھا۔

کل تک حسہ آپا اسی دنیا میں موجود تھیں۔ آج وہ بھی ماضی کی داستانوں میں شامل ہو گئیں:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کدے لئیم  
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

(’گلِ صبرِ برگ‘، مرتب: حبیب الرحمان)



## دیکھ کبیرارویا

(سعادت حسن منٹو)

مجھ سے بھی کہا گیا ہے کہ میں منٹو کے حلقہ کچھ لکھوں۔ سوال یہ ہے کہ اعجازت ماں اس مرنے والے کے ہارے میں لکھا جا رہا ہے کہ میں کون سی نئی بات لکھوں گی۔ 19 جنوری سے پہلے، جب تک وہ زندہ تھا اسے گالیاں دی جاتی تھیں۔ ترقی پسند اسے رجعت کا پرستار کہتے تھے، رجعت پسندوں کے نزدیک وہ اس زمانے کا سب سے بڑا بے دین افکار اور ترقی پسند تھا۔ اسی رس کشی میں وہ غریب تو دوسری دنیا کو سدھارا، اب بیٹھے سر ڈھپے۔ اب اس کی یاد میں جیسے ہو رہے ہیں۔ اٹکھار لکھوس کی قراردادیں پاس کی جا رہی ہیں۔ ایک سے ایک رقت انگیز بیان اس کے ہم عصروں کی طرف سے پریس میں آ رہا ہے۔ اس کے حلقہ کتابیں ہیں کہ زور شور سے انگریزی اور اردو میں لکھی جا رہی ہیں، جو نہایت شاعرانہ اور خوب صورتی سے شائع ہوں گی۔ ان پر ریویو کیے جائیں گے۔ اس قوم کا رونا رویا جانے کا جو رنگی میں اپنے فن کاروں کی قدر نہیں کرتی۔ منٹو کو دونوں پارٹیاں کہتی ہیں کہ بے حد عظیم فن کار ہے۔ پاکستان کا بودیلر ہے۔ اس کے

بیوی بچوں کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وظیفہ مقرر کرے گویا منٹو زندگی بھر بیوی کو عیش کراتا رہا۔ اس کی موت سے ان کے عیش و آرام میں جو خلل واقع ہوا ہے اس کی تلافی گورنمنٹ کو کرنی چاہیے۔ فن کاروں کی قدر کرنا قومی حکومت کا فرض ہے۔

’فن کار‘ کا ڈھکوسلہ بھی آج کل ایک بہت دلچسپ چیز بن گیا ہے۔ فن کار ایک ایسا عجیب و روزگار ہوتا ہے جس کے سرخاب کا پر لگا ہوتا ہے۔ وہ محبت اور ہوا پر زندہ رہتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ آپ کو محفوظ کرے۔ زندگی میں اور اپنی موت کے ذریعے سے بھی... اور جس ’فن کار‘ کی موت ایسے ٹریجک اور ڈرامائی انداز میں ہو، وہ رہو رسم فن کاری پر گویا بالکل پورا اُترا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ جواں سال مر جائے۔ اس سے اس کے پڑھنے والوں پر اور زیادہ عمدہ اثر ہوتا ہے۔ کیلیس اور شیلیا اور ڈاسکن ٹامس کی روایات گویا زندہ رہتی ہیں۔ پھر وہ بودیلیر بن جاتا ہے۔

منٹو ادب کے علاوہ عمر بھر اپنی زندگی میں بھی فن کاری کے شعبہ کے دکھاتا رہا۔ شراب وہ بے تحاشا پیتا تھا۔ مقدمے اس پر چلے۔ پاگل خانے تک وہ جا پہنچا۔ برصغیر کے فن و ادب کی جو انڈر ورلڈ ہے اس کا وہ کیا عمدہ مصور تھا... تعجب ہے کہ ابھی تک اس کو Toulouse-Lautrec سے کیوں تشبیہ نہیں دی گئی۔ افسوس ہے کہ اس سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ ورنہ میں بھی اس وقت کوئی واقعہ بیان کرتی کہ ”فلاں سن میں بمبئی، یالاہور میں اس سے ملاقات ہوئی تو صوفے پر اُکڑوں پیٹھے ہوئے اس نے کہا....“

”اب منٹو کی Myth بھی تیار ہو جائے گی۔“

کچھ عرصے کی بات ہے کہ بلبل چودھری سرا ہے۔ وہ غریب ادھر سے ادھر دھکے کھاتا پھرا۔ اس کی تھیوری یہ تھی کہ پاکستانی فن رقص ایک شے ہے، اور اس کی ترویج کرنی چاہیے۔ چند سال اس اڈیز بن میں گزارنے کے بعد وہ بھی جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارا ہوا۔ ادھر اس نے آنکھیں موندیں ادھر فی الفور ایک بلبل اکیڈمی قائم ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بیوی بچوں کے نام سے قوم سے اپیل کی گئی۔ سارے ملک پر رنج و غم کی جھٹکھوڑ گھٹائیں چھا گئیں۔

دور کیوں جائیے۔ ابھی چند روز کہ شام کے وقت دینے پو پر بخاری صاحب کی کنٹری سنائی

دی (بخاری صاحب بہترین کنٹری کرتے ہیں) اس طرف مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ادھر پاکستان کے عظیم المرتبت مایہ ناز فن کار استاد بندو خاں نے جاپا شیریں جاپا آفریں کے پرد کی۔ بخاری صاحب نے قوم کو نہایت موثر اور خوب صورت الفاظ میں اس سانچے کی اطلاع دی۔ لیکن قوم کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ استاد بندو خاں کون تھے؟ ان کی کیا ہستی تھی؟ کیا رتبہ تھا؟ بس ایک استاد جی تھے جو سارنگی بجاتے تھے۔ یہ چھ سات سال انھوں نے لالو کھیت کی مہاجر ہستی میں جس طرح گزارے اس کا نہ کسی کو علم اور نہ اس کی پروا۔

سوال یہ ہے کہ آخر پروا کیوں کی جائے؟ صاحب آپ سارنگی بجاتے رہے۔ پاکستانی رقص کا شوق ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ افسانے لکھنے کا عارضہ ہے، لکھتے رہے۔ ہم نے کیا آپ کا ٹھیکہ لیا ہے۔ آخر یہ ہم پر کا ہے کارعب ہے؟

منٹو صاحب، قیامت کا افسانہ نگار تھا۔ کیا کرافٹس مین شپ تھی۔ کیا طرزی بیان تھا۔

اچھا تھا۔ تو پھر اب کیا کیا جائے۔

روایت ہے کہ اکثر بھوکا مرتا تھا۔

تو پھر کہیں جا کر لو کر لیٹا۔ یہ آنیں بائیں شائیں کیوں اڑاتا رہا۔

کہتا تھا، دیکھ "کبیرا رویا۔"

ارے بھائی صاحب تو کیوں رویا؟ اور یہ جو اس نے اتنا الم ظلم لکھ ڈالا تھا، اپنے عزیز دوستوں کے خاکے، ایکٹرسوں کے حالات زندگی، مولویوں کی سوانح عمریاں، اگر یہ سب وہ نہ لکھتا تو ہم اور وہ دونوں مزے میں رہتے۔ اس کے خاندان میں ایک سے ایک ہائی کورٹ کے جج اور بیرٹ تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار موجود تھے۔ وہ اس کو کہیں نہ کہیں لگوا دیتے۔ وہ ملازمت کرتا۔ ہم اپنے اطمینان سے رشید اختر ندوی اور ایم اسلم کی تخلیقات پڑھتے رہتے۔

اس وقت زیادہ زور اس نکتے پر دیا جا رہا ہے کہ وہ بری عسرت کے عالم میں مرا۔ گویا اس ملک کے لیے یہ بڑی انوکھی بات ہے۔ باقی جتنے ادیب ہیں، وہ جو بڑے عہدوں پر نہیں ہیں اور جو سرکاری کافٹرسوں میں شرکت کے لیے ابھی جنیوا اور نیویارک نہیں گئے، وہ تو سب کے سب کیا

ٹھانڈھ کی زندگی بتا رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ لیجیے ڈرامہ اکیڈمی الگ موجود ہے، نثر نگاروں اور شاعروں کی کونسل الگ۔ ان کے اپنے فرسٹ ہیں۔ ان کی کتابیں چھپتی ہیں تو سرسٹ ماہم کی طرح وہ ہزاروں لاکھوں روپیہ پور کر اپنے بینکوں میں جمع کراتے رہتے ہیں۔ دراصل منٹو بے چارہ ایک بڑے بینک تھا اور افلاس کی زندگی میں اسے ایک ایسی روحانی مسرت محسوس ہوتی تھی کہ وہ بس اسی میں مگن رہا۔ اس لیے ملت اب دفعتاً چونک اٹھی ہے۔ اور اس نے کہا ہے کہ ہے، ہے، کیا غضب ہے اس ویلفیئر اسٹیٹ میں ایک فن کار یوں مر گیا۔

بہر حال تو میں کہوں کیا، یہی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اور انکاڑ کے 'منٹو نمبر' کے لیے یہ تو کوئی Statement نہ ہوا۔ بات بھائی صاحب، دراصل یہ ہے کہ ایک منٹو نہیں مرا ہے۔ منٹو برابر مارتا رہے گا۔ کبھی وہ ناچتے ناچتے دم توڑ دے گا، کبھی سارنگی بجاتے بجاتے۔ جب تک ہماری آنکھیں نہیں کھلیں گی!



## ایک معمار سلطنت

(غلام عباس)

اکثر مشہور شخصیات (ادبی اور غیر ادبی) پر لکھتے وقت میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ وہ یوں کہ اگر مثال کے طور پر مجھ سے پوپ آف روم کے متعلق مضمون لکھنے کے لیے کہا جائے تو پہلے میں ہولی رومن ایمپائر پر مختصر روشنی ڈالوں گی، پھر اگلے ڈیڑھ ہزار سال کے متعلقہ معاملات پر۔ کچھ عرصے قبل بمبئی کے انگریزی روزنامے کے لیے جنگ عراق و ایران پر لکھتے ہوئے میں نے جنگ قادسیہ کی وجوہات کا تذکرہ مناسب جانا۔ اردو میں، میں نے نوٹس کیا ہے کہ جب بھی کسی ادبی شخصیت پر لکھنے کے لیے کہا جاتا ہے تو میں فوراً لکھنؤ، دہرہ دون، غازی پور وغیرہ کی سمت چل پڑتی ہوں۔ پڑھنے والوں کے لیے یہ مقامات مبرا آزاہوں گے۔ مگر کیا کیا جائے، عادت ہی یہی ہے۔ اب آپ غور فرمائیے کہ لاہور کے غلام عباس صاحب کے متعلق لکھتے ہوئے دہرہ دون یا غازی پور کے تذکرے کی کیا تک ہے۔ اردن گھٹنا پھوٹے آنکھ! مگر عرض یہ ہے کہ ہر انسان کی اپنے اولین زمانوں کی ایک مایکھو لو جی ہوتی ہے۔ میری بھی ہے۔ اور اس میں 'پھول' اخبار کا

بہت عمل دخل رہا ہے۔ پھول ایک گھریلو سامان تھا۔ والدہ اپنے لڑکپن میں اس کی آزریری ایڈیٹر رہ چکی تھیں اور اس کے ناشرین سے ان کے نئے رشتے داروں والے تعلقات تھے۔ اور دارالاشاعت پنجاب لاہور (جسے میں الگ الگ 'دا-را-لا-شاعت' پڑھا کرتی تھی) کی گویا ایک 'اسٹار مصنفہ' تھیں۔

گرمیوں کی دوپہروں میں میں 'پھول' اخبار کے پیچھے چھپی بچوں کی کتابوں کے نام مع قیمت یا آواز بلند پڑھا کرتی۔ رخ نمٹا 8، بدر بادشاہ جواہر شاہزادی 10، ننھی کتاب 10 آنے نئی کتاب 10، امیر اور بانس والا 3، عجیب نس 3، بتوری جوتا 3، پہاڑی ماں کی کہانی 3، پھولوں کا ہار 5، سلیم کی کہانی 4 (یہ دونوں کتابیں والدہ نے نکلی تھیں)۔ بن باسی رستم 6 قصر صحر احصہ اول 8، قصر صحر احصہ دوم 14، قصر صحر احصہ سوم 14، موت کا راگ 02۔

اکثر ہمارا دلچسپ ڈرائیور نذیر فرمائش کرتا "بی بی کتابوں کی قیمت سنائیے" اور میں فوراً پرچہ اٹھا کر گردان شروع کر دیتی۔ "ستاروں کی گڑیا 3، جادو کا برج 3، جھوٹ موت کا بھوت 3 آنے...."

ان میں جہاں تک میرا خیال ہے (مکمل ہے میں لفظی پر ہوں) 'قصر صحر' اور 'موت کا راگ' غلام عباس کی کتابیں تھیں۔ 'الحمر' کے افسانے بھی۔ یہ غالباً تراجم تھے یا جہے۔ گرمیوں کی ان طویل دوپہروں میں (نہ جانے یہ کیوں لکھا جاتا ہے۔ گرمی کی دوپہر مختصر ہو ہی نہیں سکتی) 'چپ شہزادی تین آنے، راکھ پیگم تین آنے، نیکن سندری تین آنے' کی صوتی کیفیت مجھے بہت اچھی لگتی اور 'قصر صحر' فسون خیز۔ 'قصر صحر' سے آج بنو امیہ کے بنائے ہوئے جوڑن کے قلعے کا خیال آجائے گا مگر اس وقت تو یہ دو لفظ بالکل مسخوڑ کن تھے۔ ٹیلی ویژن اور امریکن کوکس سے لبالب آج کی دنیا میں پروان چڑھنے والے بچے "نٹ کھٹ پاؤ 3 آنے، مٹل مندا انگشتا 3 آنے، چو ہے ملی نامہ 3 آنے" کی لغت سے محروم ہیں۔

اور دہرہ دون کی ایک پھولوں سے روشن صبح برآمدے میں بیٹھے حسین ماموں ایک قہمت ناک افسانہ (غالباً حجاب امتیاز علی کا) پڑھ کر اماں سے کہتے ہیں: "تو صاحب حد ہے۔ ہاں۔ تو

باجی اب کیا ہوتا ہے کہ وہ لاش اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور اس رتی کو گرہیں لگاتی جاتی ہے اور رتی کو نگلے لگتی ہے۔“

اور غدرا اور غدرا کی واپسی اور شیخ حسن... بڑی پراسرار دنیا تھی۔ اس وقت کا بیشتر اردو فکشن تراجم (وہ بھی مقبول مغربی ناولوں کے) اور چربوں پر مشتمل تھا۔ سالانہ 'نیرنگ خیال' 1929 عیسوی (جو مجھے حال ہی میں کہیں سے مل گیا ہے اور جو مجھے اس قدر قیمتی نسیب کرتا ہے کہ میں اکثر اس کے حوالے دیتی رہتی ہوں) میں حسب ذیل مندرجات موجود ہیں:

1. انگلستان کا جدید ترین تھیر، از جناب علامہ سید احمد شاہ بخاری ایم اے، پطرس پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔
2. دختر باطل، از جناب محمد دین صاحب تاثیر۔
3. مشاعرہ، از حضرت شوکت تھانوی۔
4. خطہ دولنگار مسجاب اسماعیل۔
5. آسیب الفت، از جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم۔
6. باغبان، از جناب مولانا عبد المجید سالک بی اے مدبر انقلاب۔
7. چارپائی، از جناب رشید احمد صدیقی۔
8. انجام بخیر، حضرت پطرس کے قلم سے۔
9. چارلی چلمین، جناب دیوان آتما نند شرر، بی اے۔
10. چچا چھکن نے دھو بن کو کپڑے دیے، از جناب سید امتیاز علی تاج، بی اے۔
11. موت کا درخت، از جناب غلام عباس۔
12. منی، از خشی پریم چند۔
13. کاجل، از جناب چٹنائی۔

یہ لہرست میں نے اس لیے نقل کی کہ انگارے اور لندن کی ایک رات کی اشاعت سے ذرا قبل کی ادبی صورت حال آپ کے سامنے آ جائے۔ رومان پر بہت زور تھا۔ دختر باطل آکر

وائٹڈ کے سلوی اور 'موت کا درخت' میری بہن سے ماخوذ تھا۔ عبدالرحمن چغتائی اور حجاب دونوں نے 'ادب پارے' پیش کیے تھے۔ یلدرم کے ناولٹ کے نیچے لکھا تھا (از ترکی)۔ ایک بات اور قابل غور ہے کہ صرف چند سال بعد افسانے نے تو زبردست زرقہ بھری، مگر مزاحی ادب، پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی اور تاج کی یہ تخلیقات آج بھی بے مثال ہیں۔

اس زمانے میں ادیب لوگ 'خیالستان' والے یلدرم، 'لیلیٰ' کے خطوط والے قاضی عبدالغفار، 'انارکلی' اور 'چچا چکن' والے تاج، 'سودیشی ریل' والے شوکت تھانوی، 'نئی چھتری' والے ظفر عمر ہوا کرتے تھے (ایک صاحب تو 'پطرس' کے مضامین والے پطرس' بھی کہتے سنے گئے)۔ چند سال بعد نئے ادب کا طلسمی درپچہ کھلا تو لوگ 'باگ' ہماری گلی والے احمد علی، 'چائے کی پیالی' والے عسکری، 'دو فرلانگ' لمبی سڑک' والے کرشن چندر، 'گرم کوٹ' والے بیدی، 'کالی شلوار' والے خواجہ آندلی' والے غلام عباس بن گئے۔ اس گروپ میں غلام عباس، خان آباد اعداد ادیب ہیں جو 'الحمراء' اور 'موت کا درخت' کے رومان سے نکل کر حقیقت پسند افسانے کے دور میں شامل ہوئے اور بڑی دھوم دھام سے۔

لوگوں نے کہا کہ بیدی کا گرم کوٹ گوگول سے ماخوذ ہے اور آندلی ایک ہپانوی افسانے کا چرہ ہے... ہوگا۔ قتی لحاظ سے آندلی ایک مکمل افسانہ ثابت ہوا۔ غلام عباس اردو افسانے کے ایسا زبلندوزر میں سے ایک ہیں ('اہم ستون' کلیشہ ہے) معمار سلطنت۔ اس لحاظ سے موصوف بد دماغ بھی ہو سکتے تھے۔ مگر نہیں۔

اردو افسانے کے ایک معمار سلطنت جو عمر مددراز سے ایک بڑے عہدے پر فائز بیرونی ممالک میں رہتے ہیں (جی نہیں... عزیز احمد مرحوم یا احمد علی نہیں۔ بد دماغی ان کے فضائل میں شامل نہیں)۔ تو ایسا ہوا کہ ایک مغربی ملک میں ان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں بڑے احترام اور عقیدت سے ملی۔ مگر ان کے رویے میں جو اکڑنوں مضرت تھی اس نے مجھے بالکل Put-off کر دیا۔ اب اگر آپ مجھ سے کہیں کہ ان کے متعلق مضمون لکھوں، تو کیا میں لکھوں گی؟ ہرگز نہیں۔ لکھنے کے لیے کچھ ہو گا ہی نہیں۔

تو مطلب یہ کہ غلام عباس میری اماں کی پھلتے مانسوں کی لہرست میں آتے ہیں۔  
 'کار جہاں دراز ہے' جلد دوم میں ذکر کر چکی ہوں: غلام عباس سے قیام پاکستان کے بعد ملاقات ہوئی۔ اسی جگہ جہاں ہوئی چاہیے تھی۔ یعنی دارالاشاعت، پنجاب نمبر 7 ریلوے سٹیشن لاہور کے پھاٹک میں۔ سردی کا زمانہ تھا۔ کھرا چھایا ہوا تھا۔ لاہور اجڑا ہوا تھا۔ امتیاز بھائی مرحوم منظر میں منہ سر پیٹے اور کوٹ پہنے ایک صاحب کو گاڑی کے پاس لائے اور اماں سے طویا۔ مجھے یاد ہے اسی وقت ایک صاحب پھاٹک کے ایک کونے میں کھڑے ممبر بھائی (نیم ممتاز سید) سے با آواز بلند فرما رہے تھے "سکھوں کے چلے جانے سے پاکستان کے فنون لطیفہ کو بہت نقصان پہنچا ہے" (آج اتنے طویل عرصے کے بعد اس ریمارک میں جو ہے حسی اور Callousness پنہاں تھی اس پر تعجب ہوتا ہے)۔

خیر تو غلام عباس نے مجھ سے پوچھا "کوئی نئی چیز لکھی ہے؟" میں نے کہا "ایک ناول لکھ رہی ہوں 'میرے بھی منم خانے'۔" کہنے لگے "فسادات کی وجہ سے پبلشنگ کا کاروبار معطل پڑا تھا۔ اب حالات ذرا نارمل ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ ناول مکمل کر لیجیے میں کسی ناشر سے بات کروں گا۔"

اسے ریلوے روڈ کا وہ کمرے سے بھرا پھاٹک مجھے اکثر یاد آتا ہے کیونکہ دارالاشاعت پنجاب بھی عنقریب وقت کے کمرے میں معدوم ہونے والا تھا۔ 'پھول' اور 'تہذیب' (جراغ حسن حسرت، مولانا سالک احمد ندیم قاسمی، امتیاز علی تاج اور غلام عباس جن کے ایڈیٹر رہے) دم توڑ رہے تھے۔ وہ پوری ادبی اور تہذیبی روایت جو اس ادارے نے پچھلی نصف صدی میں تیار کی تھی، ختم ہو رہی تھی۔ تراجم، خواتین کا ادب، بچوں کا عظیم الشان لٹریچر... شاعری نکل رہی تھی، برفن کی بیٹی تین آنے، قصر صحرائیں آنے... بچپن کی اساطیر میں شامل ہونے والے تھے۔ اپنا بچپن آنکھوں کے سامنے سے گزرتا دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ مجھے بھی ہوا۔

کراچی پہنچے چند روز ہوئے تھے جب 'نیا دور' والے محمد شاہین 'اور' اپنی نگریا والی ممتاز شیریں نے تمام نئے اور پرانے لکھنے والوں سے رابطہ قائم کرنا شروع کیا۔ پرانے لکھنے والوں میں

والدہ مرحومہ اور راقم الحروف تازہ واردانِ بساطِ ادب میں شامل تھی۔ ان دونوں کے علاوہ مولانا رازق الخیری، شاہد احمد دہلوی، قدرت اللہ، یا خدا والے قدرت اللہ شہاب اور غلام عباس صاحب بھی جائے قیام پر تشریف لائے گئے۔ ایک روز غلام عباس صاحب نے فرمایا آپ وہ ناول مکمل کر لیجیے تو مجھے دیجیے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ چند روز بعد غلام عباس صاحب نے آکر فرمایا کہ میں نے دفتر سے دور روز کی چھٹی لے کر اسے پڑھا اور لاہور مکتبہ جدید کو روانہ کر دیا۔ میں بڑی مرعوب ہوئی کہ اس سچے پوچے ناول کو پڑھنے کے لیے غلام عباس صاحب جیسے معروف آدمی نے دور روز کی چھٹی لی۔

غلام عباس صاحب ان دنوں ریڈیو پاکستان کے رسالہ 'آہنگ' کے ایڈیٹر تھے۔ ایک روز کسی نے آکر بتایا کہ غلام عباس صاحب جب مولانا ڈولا آدمی ہیں۔ بند روڈ پر اپنی دھن میں گمن بریف کیس بغل میں دا بے سڑک کے بچوں سچے چلے جا رہے تھے۔

اس کے بعد عباس صاحب بی بی سی لندن تشریف لے گئے۔ ایک زمانے میں قاعدہ تھا کہ جو شخص ولایت جاتا تھا وہاں سے انگریز بی بی ساتھ لاتا تھا۔ حیف جالندھری جیسے شرعی آدمی بھی ولایت سے ہم لے آئے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے مولانا عبدالحلیم شرر جو انگلستان گئے تھے وہاں سے انگریز بی بی لے آتے۔ ڈاکٹر تاشیر، ن. م. راشد اور بہت سوں کی طرح غلام عباس صاحب نے بھی یہ روایت بھائی۔

لندن میں نجب غلام عباس سے میری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ واپس آ کر دونوں ہمارے ہاں اکٹرا کر آتے تھے۔ نجب عباس بھی نہایت بھلی خاتون تھیں اور بہت تعلیم یافتہ۔ انھوں نے سرکاری محکمہ مطبوعات کے لیے لوک کہانیوں پر ایک کتاب بھی لکھی اور سینئر بیگم غلام عباس کے ساتھ نہایت پیار محبت کے ساتھ راتیں تھیں اور ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت اپنے ذمے لے لی تھی۔

1960 میں غلام عباس صاحب کے افسانوں کا مجموعہ 'جاڑے کی چاندنی' شایہ آدم جی انعام کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ مصنف نے مجھے اس کا دیباچہ لکھنے کے لیے کہا تھا جو میں نے فوراً لکھ

دیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کراچی سے لندن روانگی سے قبل میں اسے غلام صاحب کو دے آئی تھی یا نہیں۔ ابھی یہ مضمون شروع کرنے سے قبل مسودات اور پرانے کاغذات کے ہاتھی ڈباؤ صندوق میں تلاش کیا تو بس وہی بچے کے ابتدائی اوراق مل گئے جو حاضر خدمت ہیں<sup>1</sup>۔

اگلے صفحے غائب ہیں۔ افسوس کہ آنندی اور جاڑے کی چاندنی دونوں کتابیں میرے پاس موجود نہیں، نہ یہ معلوم ہے کہ غلام عباس صاحب نے اس کے بعد کیا لکھا۔ پچھلے بیس سال کے عرصے میں ان کا نام رسالوں میں بہت ہی کم نظر آیا۔ ایک کہانی البتہ کچھ عرصہ قبل ایک رسالے میں دیکھی تھی اور اسے پڑھ کر تعجب اور افسوس ہوا۔ کہانی یوں ہے کہ ایک بھارتی مسلمان تبدیلی مذہب کے لیے اپنے دل کو طرح طرح سے سمجھاتا اور جواز پیش کرتا جاتا ہے، مرزا جان جاناں مظہر کے نظریات دہراتا ہے۔ اور بالآخر ایک روز ہندو ہو جاتا ہے۔

غلام عباس صاحب غالباً تقسیم کے بعد سے آج تک اس طرف نہیں آئے۔ افسوس ہوا کہ انھوں نے یہ کہانی کیوں لکھی۔ کیا وہ اسے لاعلم ہیں؟ خصوصاً جبکہ موجودہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔

بہر حال غلام عباس ایک ایسے ادیب ہیں جس کو بجا طور پر Writers' Writer کہا جا سکتا ہے۔

کل اتوار کا دن تھا، میں یہ مضمون لکھ رہی تھی جسے عازمی پور کے ذکر سے شروع کیا تھا اور اتفاق کی بات کہ عازمی پور کے سید حسین عباس عابدی تشریف لے آئے جو بلحاظ پیشہ انکم ٹیکس آفیسر اور بلحاظ ادبی تربیت شمس الرحمن فاروقی کے حلقے میں شامل رہ چکے ہیں۔ میں نے کہا میں غلام عباس صاحب پر مضمون لکھ رہی ہوں۔ انھوں نے فوراً دہرایا "آنندی والے...؟"

میں نے پوچھا "آپ کو ان کے افسانے کیسے لگتے ہیں؟"

"Pedestrian" انھوں نے ایک لفظ میں جواب دیا اور سلمان رشدی کا ناول اٹھالیا

(عابدی صاحب خود Midnight's Children میں شامل ہیں)۔

میں نے وضاحت چاہی۔ فرمایا "مطلب یہ کہ کچھ پریم چند کے سے ہیں۔"

تب میں نے سوچا کہ اس 'جنریشن گیپ' کے متعلق کچھ کیا نہیں جاسکتا۔ حسین عابدی صاحب کے وطن غازی پور میں جب میرے برادر معظم بحیثیت اسکول بوائے 'قصر صحر' پڑھا کرتے تھے، اس وقت لندن کی ایک رات اور انکار نے 'شالچ' ہو چکی تھی، منٹو نے لکھنا شروع کر دیا تھا اور انکار کے افسانے والے قلام عباس آج بھی ہم عصر اور جدید ہیں اور بڑے افسانہ نگار کی کہنا بچکان ہے۔

"قلام عباس صاحب ایک نئے اردو افسانے کے ایک ایمپائر بلڈر ہیں۔" میں نے جدید بڑھی کے اس نمائندے سے کہا۔

"جی ہاں۔ یہ میں ماننا ہوں۔" عابدی صاحب نے جواب دیا۔

( 'داستان مہدگل'، مرتبہ آصف فرخی )

حواشی:

1. یہاں مصنف نے 'جاڑے کی چاندنی' والے مضمون سے لے کر اس کی بیوی میں جڑیات نگاری کی مثالوں تک نقل کیا ہے۔ یہ پورا مضمون اس مجموعے میں شامل ہے۔ اس لیے یہ اقتباس حذف کر دیا گیا۔ تفصیل کے لیے مآخذ کی وضاحت دیکھیے۔ (مرتب)



## دربار کے معتمد خاص

(عزیز احمد)

عالمگیا 1947 عیسوی میں میرا ایک ابتدائی افسانہ 'سوراب' (لاہور) میں شائع ہوا تھا جس میں حسب معمول ہنگی، ششو، ٹوٹو، فی فی وغیرہ قسم کے کرداروں کی افراطی اور وہ مخصوص ماحول اور Setting جس کی وضاحت میں نے 'کار جہاں دراز ہے' کے اپنے بچپن سے حلقہ ابواب میں کی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو وہ افسانے بہت عجیب لگتے تھے۔ گوان کی Fay اور Elin فضا خود میرے لیے بالکل انوکھی یا غیر حقیقی نہیں تھی۔ تو اس افسانے کے حلقہ حیدر آباد کن سے عزیز احمد نام کے ایک صاحب کا نہایت قریبی محل آیا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ "آپ کی کہانیوں کی امیجری اور ماحول بہت غیر معمولی اور دلآویز ہے۔ گوپریوں اور خرگوشوں کا Decor ذرا زیادہ ہو گیا ہے۔" میں مکتوب نگار کی رائے سے قطعی متفق تھی اٹا پریوں اور خرگوش کے کردار تو اصل چیز ہیں۔

جب ہم لکھنؤ سے کراچی پہنچے۔ وہاں ہندستان کے مطلق گوشوں سے ادیب لوگ

پاکستان، بالخصوص کراچی وارد ہو رہے تھے۔ محمد شاہین اور ممتاز شیریں نے 'نیا دور' کراچی سے جاری کر دیا تھا اور عزیز احمد بھی اس میں لکھتے تھے۔ ان کا ایک ناول 'آگ' غالباً حیدرآباد سے شائع ہو چکا تھا۔ محمد شاہین نے مطلع کیا کہ موصوف کراچی آگئے ہیں۔ ایک روز ہمارے ہاں تشریف لائے۔ معلوم ہوا 1935 عیسوی میں مولوی عبدالحق نے بغرض اعلیٰ تعلیم ولایت بھجوا دیا تھا (گریز اسی زمانے کی داستان ہے) اور پاکستان آنے سے قبل شہزادی دہشوار کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔

بھٹی عزیز احمد کے افسانوں کا پس منظر بھی ہے۔ یورپین تعلیم و سیاحت اور حیدرآباد کی فیوڈل سوسائٹی۔ عزیز احمد نے اس عیش پرست معاشرے کی تصویر اس وقت کے مروجہ مارکسی احتجاجی رویے کے ساتھ پیش نہیں کی گو جین اسطور میں طنز موجود تھا۔ پھر 'سورہ' میں ایک افسانہ 'چکڑیڑی' چھپا (اس کا پس منظر بھی یہی تھا)۔ اس کے ایک جملے کی وجہ سے اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ انھیں 'دوں' ادب لطیف، 'نفقوش' اور 'سورہ' نے اعلان کیا کہ انھوں نے عزیز احمد محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں (اور شاید قدرت اللہ شہاب) اور اس خاکسار کو بحیثیت رجعت پسند اور با کے Ban کر دیا ہے۔ میرے لیے لکھا گیا کہ سخت بورژوا اور فیوڈل ہوں۔ عالم بے وقوفی میں یہ اطلاع میرے اوپر سے گزر گئی۔ لیکن اتنا مجھے ضرور معلوم تھا کہ ایک انسان بیک وقت بورژوا اور فیوڈل نہیں ہو سکتا۔ یہ طبقاتی تفریق کی بہت سیدھی سی بات ہے۔ مگر کون سنتا تھا۔ بہر حال میں تو اطمینان سے ٹوٹو، ٹی، ٹی، ٹی، ٹی، ٹی، چو، اولڈ وائس اور بیوڈینیوب کا دلیقہ کرتی رہی مگر رسالوں میں بڑا ہنگامہ مچا ہوا۔ گو کچھ عرصے بعد عالم گیر اشتیاق اور ہیومنزم کے چند علم بردار انٹرا نیشنلسٹ بن گئے (اور اب خودی بورژواڈی میں شامل ہو کر عرصے سے خاموش ہیں)۔ آزاد کے اولین دور سے ممتاز شیریں، عزیز احمد، م. راشد، محمد حسن عسکری بھی انٹرا نیشنلسٹ تھے۔ موخر الذکر نے پاکستانی اور اسلامی ادب کا نعرہ بلند کیا۔ پچھلے چند برسوں سے اپنی 'کلچرل جڑوں کی تلاش' کا آغاز ہوا ہے۔ (عاجزہ کی شروع کی ہوئی اس جستجو کو آپ اب Roots Syndrome کہہ سکتے ہیں)۔

میں ذکر اس ابتدائی دور کا کر رہی ہوں جب 'ترقی پسند' اور 'اسلامی ادب' کے دو کپ قائم ہو چکے تھے اور آئے دن لاہور اور کراچی میں 'محرک' رائیاں، ہنسی تھیں۔

عزیز احمد بہت پڑھے لکھے انسان ہیں۔ کراچی پہنچ کر وہ تلاشِ ملازمت میں مصروف ہو چکے تھے۔ بہت پڑھے لکھے لوگوں کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ ایک وہ جو حقوق کو برداشت نہیں کر سکتے، میر کی طرح بے دماغ ہو کر گوشہ نشین ہو جانے اور دنیا داری اور ترقی کی دوڑ میں حصہ لینے کی فکری نہیں کرتے۔ دوسری قسم ان کی ہے جو کارآمد سماجی تعلقات استوار کرنے کے بھی ماہر ہوتے ہیں اور دوڑ بھاگ کر ایک مقام حاصل کر لیتے ہیں مگر عموماً اس سے کہیں بہتر مقام کے مستحق ہوتے ہیں۔ کراچی میں پہلی قسم محمد حسن عسکری کی تھی۔ عزیز احمد دوسرے زمرے میں شامل تھے۔ ان کو ایک اچھی سرکاری ملازمت مل گئی۔ حالانکہ ان کی اسکا لرشپ کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کسی یونیورسٹی میں جاتے۔ (اسی وجہ سے چند سال بعد وہ ہجرت کر کے مغرب چلے گئے اور وہاں کی دانش گاہوں میں پڑھایا۔) چند ماہ بعد وزارت اطلاعات و نشریات کے اسی حلقے، ایڈورٹائزنگ، فٹز ایڈیٹریل کیشنز، میں شہاب کے کہنے پر میں بھی شامل ہو گئی۔ وہ نکلے لٹل قلم سے پر تھا۔ شان الحق حقی، جلال الدین احمد (پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم و مغفور کے بھانجے اور داماد اور اب قاہرہ میں پاکستانی پریس کونسلر)، رفیق خاور (ایڈیٹر ماہ نو)، امجد علی (ایڈیٹر پاکستان کوارٹرلی)، اللہ بخش راجپوت (اب کراچی ٹیلی ویژن کے سربراہ)، ناصر شمس، انور قریشی (انگریزی صحافی) یہ سب بے حد ثقہ اور نفیس اور دلچسپ حضرات تھے۔ شیخ محمد اکرام مرحوم (مصنف آپ کوثر و رود کوثر) وزارت کے سیکریٹری اور شہاب ڈپٹی سیکریٹری تھے۔ (میں اس زمانے کے متعلق 'کار جہاں دراز ہے' میں لکھ چکی ہوں مگر اس وقت اس کا مختصر تذکرہ لا محالہ دہرائنا پڑے گا۔) تو عزیز احمد اس حلقے کے ایک سینئر افسر تھے۔ ان کا اور میرا کمرہ آسنے سامنے تھا۔ اکثر چیرای آکر کہتا "صاحب نے سلام بولا ہے۔ بہت ارجنٹ میننگ ہے۔" میں فائلیں ایک طرف رکھ کر (مغربی پریس کے لیے تہذیبی موضوعات پر انگریزی میں مضامین لکھتا میرا انور قریشی کا کام تھا) 'صاحب' کے کمرے میں پہنچ جاتی جہاں 'ارجنٹ میننگ' کے لیے مذکورہ بالا حضرات میں سے چند بیٹھے ملتے۔ ادب، شعرو شاعری، فنون لطیفہ وغیرہ پر بحث و تکرار کی محفل جتنی۔ عزیز احمد کا مغربی ادب کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ انور قریشی سے بالخصوص ان کی بہت دلچسپ جھڑپیں رہیں۔ چند ماہ بعد میں ولایت رفو چکر

ہوئی۔ عزیز احمد صاحب تبدیل ہو کر شاید راولپنڈی چلے گئے۔

انگلستان سے واپس آ کر کچھ عرصے بعد 1958 میں سید ہاشم رضا کے بلانے پر، جواب وزارت اطلاعات و نشریات کے سکرٹری تھے، میں دوبارہ محکمے کے شعبہ قلم سازی میں شامل ہو گئی جہاں میں ڈاکو معری قلم بٹاتی تھی۔ عزیز احمد صاحب اب اس محکمے کے ڈائریکٹر ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ترکہ وطن کا فیصلہ کیا۔ بیگم عزیز احمد ایک نہایت حسین اور بادشاہ حیدر آبادی خاتون تھیں۔ عزیز صاحب کی لڑکی کی نسبت کراچی کے ایک حیدر آبادی خاندان میں ملے ہو رہی تھی۔ شاید 1958 میں عزیز احمد مع بیوی بچوں کے پاکستان کو خیر باد کہہ کر لندن چلے گئے اور ریشٹل اسکول میں پڑھانے لگے۔ ان سے میری ملاقات چند سال بعد لندن میں بہت رواداری میں ہوئی۔ پھر معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کینیڈا تشریف لے گئے۔

آج کل اردو میں کوالو جن کے ساتھ ساتھ جواد بی Permissiveness رائج ہے وہ اس وقت موجود نہ تھی لہذا عزیز احمد صاحب سے اکثر یہ شکایت کی جاتی تھی کہ وہ اپنے افسانوں کے پردے میں اسکیٹل کیوں لکھتے ہیں۔ ہم سب اس سلسلے میں ان سے خوب جھگڑتے۔ میری بچپن کا ادب، بن بیگم حمیرا سید کے شوہر جری احمد سید سے عزیز احمد کی بہت دوستی تھی۔ ایک بار لاہور میں آپا جس بھائی جان کے ہاں عزیز احمد صاحب سے ان کے بادل ایسی بلندی ایسی پستی کے متعلق بحث ہو رہی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ معنف نے حیدر آباد کے ایک مشہور خاندان کے حالات فقط نام بدل کر لکھ دیے ہیں۔ میں نے کہا "یہ ضروری نہیں کہ ہر افسانہ اور ناول کا سلا تخیلی ہو۔ حقیقت کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوتی ہے مگر آپ اصل واقعات محض نام تبدیل کر کے لکھ دیں تو وہ اسکیٹل مگرنگ ہے، ادب نہیں۔ اور پھر ایسے لوگ جو آپ کو اپنا پر غلوں دوست سمجھتے ہوں آپ

ان کو ہی اپنا نشانہ بنائیں۔ "One should draw a line some where."

کہنے لگے: "بی بی حیدر آباد کی سوسائٹی اس قدر فاسد تھی کہ اس کا آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتیں۔" (یہی بات اب واجدہ تبسم بھی کہتی ہیں۔ تو صاحبو یہ حیدر آباد پوہی آئی یا ہا Dolce vita کی طرح کوئی بہت ہی مجرما تصور جگہ رہی ہوگی!) پھر میں نے کہا: "ابھی کا ذکر ہے

آپ نے اپنے فلاں دوست کی بیٹی ہی کے متعلق افسانہ لکھ ڈالا۔ ممکن ہے وہ بالکل بے بنیاد قصہ ہو۔ علاوہ ازیں خدا نخواستہ آپ کی اپنی کسی قریبی عزیزہ کا کوئی واقعہ ہو آپ اسی صاف گوئی سے کام لیں گے؟“ اسی وقت ایک انگریز میاں بیوی اپنی کھڑکھڑیا اسٹیشن دیکھن پر آپ آجمن، بھائی جان کے ہاں وارد ہوئے۔ چند روز قبل عزیز صاحب ہی ان دونوں کو ہم لوگوں سے ملانے لائے تھے۔ وہ ایک نہایت چمکتا فرنگی اور اس کی چوہیا سی میم تھی۔ بذریعہ کار انگلستان سے آئے تھے۔ خود کو صحافی بتاتے تھے اور حسب دستور انگریز پاکستان پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ وہ دمبر کی ایک سرد کھراؤد شام تھی۔ ہم لوگ آتش دان کے سامنے بیٹھے تھے۔ چوہیا میم قہقہہ جیتی جا رہی تھی اور چپ چاپ آگ کے شعلوں کو تنک رہی تھی۔ اس کا شوہر زمین آسمان کے قلابے ملانے میں مصروف تھا: ناصر سے میں نے یہ کہا۔ ٹھہر دو یہ جواب دیا۔ ان کے جانے کے بعد عزیز احمد صاحب نے آپ آجمن سے کہا:

”حیرانی بی۔ یہ بڑا الٹا جڑا ہے۔ انگلستان میں ناکام رہے۔ قسمت آزمائے اس طرف آئے ہیں۔ اس کی بیوی کل مجھے بڑی اداسی سے بتا رہی تھی کہ لندن سے یہاں تک سفر میں ہمیں جب مالی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے میں اپنے شوہر کی اجازت سے کچھ کمالاتی ہوں... اور جرنلزم کے ذریعے نہیں۔“

میں نے کہا: ”اے ہے گل ہوئی۔ اس پر واقعی بڑا موثر افسانہ لکھا جاسکتا ہے۔ مگر اپنے شناساؤں کو بھیجیے۔“ عزیز صاحب ہنسنے لگے۔ اکثر لوگ دوسروں پر کڑی نکتہ چینی کر کے خوش ہوتے ہیں لیکن خود اپنے متعلق تنقید کا ایک لفظ نہیں برداشت کر سکتے۔ اس وقت ان کا سارا سنس آف ہیو مر غائب ہو جاتا ہے۔ عزیز احمد اپنے خلاف تنقید شدہ چیٹانی سے قبول کر لیتے تھے جو فنی اور جذباتی پہنچ کی ایک علامت ہے۔ عزیز صاحب ایک Toothy Smile والے شخص کھ انسان ہیں۔ میں اور میرا فن کی قسم کا کوئی Pompuous مضمون بھی، جہاں تک میرا خیال ہے، انھوں نے اپنے متعلق کبھی نہیں لکھا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ نقادوں نے انھیں عموماً نظر انداز کیا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر اردو فکشن پر ہی کتنا لکھا گیا ہے؟ پچھلے دس

پندرہ برس میں 'جدید' شاعری کے متعلق مضامین پر اس مہنگائی کے زمانے میں ٹنوں کاغذ اور منوں سیای خرچ کر دی گئی اور کی جارہی ہے۔ مگر بے چارے یتیم و یتیم اور دوا دل اور افسانے کی تنقید کو چند سیر کاغذ اور دو تین پاؤ سیالی جڑی ہوگی۔

صاحبان، اردو تنقید میرا میدان نہیں۔ انگریزی میں البتہ اس فیلڈ میں تھوڑی بہت ٹوں جاں بھی کھمار کر لیتی ہوں۔ لیکن اردو تنقید کا اسٹریو ٹائپ مجھے یقیناً متعجب کرتا ہے۔ انگریز نے تاریخ ہند کو 'ہندو'، 'مسلم'، 'برٹش'، 'عریض' میں بانٹ دیا۔ اسی طرح ہمارے ہاں 'اصلاحی ادب'، 'رومانی'، 'ترقی پسند'، 'نئی نسل'، 'جدید' اور 'جدید تر' کی وار ٹائپ خانہ بندی اور فہرست سازی تقریباً یکساں الفاظ میں کی جاتی ہے۔ (کیلڈر کے لحاظ سے 'نئی نسل' کے متعدد افراد قطعاً 'پرانی نسل' سے تعلق رکھتے ہیں مگر خود کو بیٹ جرنیشن کے اطفال اور نو نہال سمجھ کر بارغ بارغ ہوتے ہیں)۔ ہمارے 'برافر وختہ' لو جو انوں میں (یہ لقب انھوں نے خود اپنے آپ کو تفویض کیا تھا) ایک بھی ایٹکس ولسن، بنگلز لے ویز، ایلین سلی نو یا جان دین سامنے نہ آیا۔ بیٹ جرنیشن کو بھی مغرب میں فرسودہ ہوئے پندرہ سال ہو گئے (اس کی اطلاع اب تک یہاں نہیں پہنچی)۔ پھر جدید اور جدید تر... اس کے بعد غالباً جدید جدید تر ہوگا۔

اس اسٹریو ٹائپ تنقید کا ایک وصف یہ ہے کہ مثلاً رومانی دور میں کوئی چیز کتنی ہی اچھی کیوں نہ لکھی گئی ہو اسے قابل اعتناء نہ سمجھا جائے گا۔ اپنے عروج کے زمانے میں ترقی پسندوں نے بہت سوں پر یہ لیبل چپا کر انھیں رائے درگاہ قرار دیا۔ مثال کے طور پر ایک حجاب امتیاز علی کو لیجے جن کو نہ صرف فراموش کر دیا گیا بلکہ برسوں ان کے اسٹاک کی پیروڈی کی گئی۔ حجاب کا ایک بہت اچھا ناول 'ظالم محبت' 1941 میں چھپا تھا۔ اس سے بھی پہلے غالباً 1932 میں 'میری' نامی تمام محبت شائع ہوا تھا جسے اردو میں لطیف تر Sensibility کے سوڈرن ناولوں کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔ مگر کسی تذکرے میں ان ناولوں کا ذکر کیا جاتا ہے؟ یا حجاب کو Re-discover کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟ پرانے ادیبوں کو محض Period Piece سمجھ کر ایک سر پرستانہ رویے کے ساتھ ادبی میوزیم میں داخل کر دینا صرف ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ اور نزدیک آئیے تو ایک بہت ذہین اور پڑھی لکھی

خاتون شاعرین بٹ کا ناول 'مکری مگری' پھر اس سفر آج سے سولہ سترہ برس قبل شائع ہوا تھا۔ وہ ایک قابل ذکر ناول تھا۔ اس کے بارے میں بھی سکوت طاری رہا۔

دنیا کے کسی ادب میں یہ نہیں ہوتا کہ ادیبوں اور شاعروں پر مختلف Tag چسپاں کر کے ان کو Pooch-Pooch کیا جائے یا فٹنی چڑھایا جائے۔ ڈی لن ٹامس کے Under milk wood پر آپ کون سی پرچی چپکائیں گے؟

چند ماہ قبل میں نے ایک رسالے میں یہ بصیرت افروز بیان پڑھا کہ 'پرائی نسل' (داوین میرے ہیں) کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہمارے اعلیٰ معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ اس کے بعد اپنی 'خود آگئی' اور 'عرفان ذات' وغیرہ کا ذکر کیا۔ ایسی باتیں پڑھ کر ان حضرات سے صرف یہی پوچھا جاسکتا ہے: 'Gee, who are you kidding?' دوسری طرف افسانوں کے عنوان تک ایک فارمولے کے تحت لکھے جا رہے ہیں اور حال میں ایک مجموعے کا نام 'پرائی نسل' دیکھنے میں آیا۔

مغرب کی نئی Sub-cultures کی تھلید میں یہ رجحانات یہاں رائج ہوئے مگر وہاں یہ 'سب کلچرز' بھی سرعت سے بدلتی جا رہی ہیں۔ Alternate لائف اسٹائل اور ادبی و فنی نظریے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ ماہرین عمرانیات نے ان کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ گریٹ وینج اور لفٹ ہینک اور پینٹری میں رہنے والے بھی اس کنفیوژن اور اس تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے پا رہے تو بھائی کیوں نہ اپنا ذاتی ادب تخلیق کر دے، اس Fellish اور Fad سے آگے بڑھو اور محض اس لیے نہ لکھو کہ 'in' سمجھے جاؤ۔

شاہد بجنوری بمبئی کے ورائٹی اسٹیج کا ایک باہنر اور مقبول نوجوان ناول ہے۔ ہریانہ میں کچھ عرصہ قبل ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔ اس میں اس ریاست کے ایک جاٹ فسر نے جو صدارتی تقریر کی شاہد بجنوری اس کی بے حد دلچسپ نقل کرتا ہے۔ آرنیبل چوہدری صاحب نے شعرائے کرام کی تعریف کرنے کے بعد فرمایا: "مگر میں ایک بات پوچھوں ہوں، کہ بھائی تم لوگ یہ عائلی مائٹو کی شاعری کب تک کرو گے، اس کو چھوڑو۔ اب کوئی اور لائن دہو۔" تو میری بھی

درخواست ہے کہ اب کوئی اور لائن دالو اور اسالیب اور نسلوں اور نظریوں کی حد بندی کو بھی چھوڑ دو۔ مختلف اسالیب اور تکنیک اور مکاتیب فکر کے نئے اور پرانے دھارے (پرانے اسٹائل نئے ہو جاتے اور نئے پرانے) ساتھ ساتھ بہتے ہیں جن سے ادب کا اسمیلاڑ اور موزیک بنتا ہے۔ مزید برآں نئے اور پرانے کی تفریق ادبوں کے قد و قامت کے لحاظ سے بھی وضاحت طلب ہے۔ شیکسپیر یا مرزا بیدل یا دوستو وکی یا غالب Valhalla میں موجود ہمیشہ ہم عصر رہیں گے۔ بیسویں صدی کے اردو ادب میں فقط ایک Olympian immortal نمودار ہوا جس کا نام اقبال تھا۔ اردو کلاشن نے اب تک اس مرتبے کی کوئی ہستی پیدا نہیں کی۔ لہذا آج 'خدا یا ان ادب' کا ذکر ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن 'انسانی سطح' پر بات کیجئے تو 1900 سے لے کر آج تک چند مشہور ترین شخصیتوں کے علاوہ بہت سے اچھے ادیب سامنے آئے۔ ان کو طاق لسیاں پر رکھ دیا گیا۔ ضروری نہیں کہ ایک شخص پچاس برس ایک سے ایک بڑھیا کہانیاں لکھے جب ہی اسے یاد کیا جائے۔ (پھر Quantity اور Quality کی بات بھی کی جاتی ہے۔) کیتھرین مینفیلڈ، مائیکل آرلن اور رونالڈ فرینک نے کتنا لکھا تھا؟ کیا وجہ ہے چوہدری محمد علی رودلوی، فیاض محمود، آغا باہر، محمد خالد اختر، انور اور ناصر شمس کے نام کسی تذکرے میں دکھائی نہیں دیتے۔ نقاد حضرات کسی کے متعلق 'خاموش رہنے کی سازش' میں ہرگز شامل نہیں ہیں لیکن حقیقت، جان کاری اور بازیافت کی زیادہ ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ چند مفروضات اور بیٹے دہرائے جاتے ہیں، (مثلاً 'آگ کا دریا' کے بارے میں متواتر یہ لکھا جاتا ہے کہ یہ آواگون کے فلسفے پر مبنی ہے۔ حالانکہ یہ ناول آواگون کے فلسفے پر قطعی مبنی نہیں ہے۔)

اردو افسانہ اب ستر پچتر سال پرانا ہو چکا ہے اور اردو ناول سے کہیں زیادہ بچی بوڑھی صنف ادب ہے۔ اب اس کا سیر حاصل، متوازن اور تاریخی جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ چند روز قبل کرشن چندر مرحوم کے تعزیتی جلسے میں ایک مراٹھی ادیب شری سر دے نے کہا کہ مراٹھی میں دلت لٹریچر وغیرہ اب تخلیق کیا جا رہا ہے مگر مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اردو میں 'کالو بنگلی' تیس برس پہلے لکھا جا چکا تھا۔ اسی طرح فیشن ایبل متول طبقے کے کھوکھلے پن پر طنز، جو کرشن چندر اور



عزیز احمد کے ہاں ملتی ہے، اردو میں اب فرسودہ بات ہو چکی ہے۔ بہت سے پرانے اور نئے ادیب (مع انتظار حسین) اپنے آپ کو دہرانے لگے ہیں۔ افسانے کا یہ Re-evaluation اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ ہم جس آسانی سے اپنی تخلیقات کو 'کلاسیک' کا درجہ عطا کر دیتے ہیں ذرا اس میں احتیاط برتیں۔ اپنا موازنہ ٹالسٹائی، موپساں اور چیخوف سے نہ کریں اور خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو گورکی، لومونسون اور فلائیٹر اور 'مختص' قرار دینے سے باز آئیں۔

محمد حسن عسکری کی تقلید میں تنقید عرصے سے اب کچھ اس طرح لکھی جاتی ہے: اتنی وہ تو کہیے کہ مارسل پروست کی اس وجہ سے ثانی مرگئی کہ کافکا صاحب کہہ گئے ہیں جاٹ رے جاٹ ترے سر پہ کھاٹ۔ مگر راں بو صاحب بیٹھے وہی لکیر پیٹتے رہے۔ ویسے درجینا دلف کو بھی آج کل کون گھاس ڈالتا ہے۔ اور جیمر جو اُس تو خیر کب کے ٹائیں ٹائیں فٹ ہو گئے۔ فلاں فلاں نے فرانس میں کروپے کا کوڑا کر ڈالا اور سارتر نے تو خیر فلاں فلاں بات کہی ہی مگر کیمو بھی ایک ہی کائیاں نکلا۔

ذرا غور فرمائیے کہ سارتر نہ ہوتا اور 'خود وجودیت' نہ ہوتی تو اردو تنقید کس طرح لکھی جاتی؟ (اس بے چارے کو 'چین پال سارتر' بھی لکھا جاتا ہے!) مزید برآں، 'اور مارٹن ہائیڈیگر نے کہا ہے کہ...."

آج کل کی بے حد بھراؤنی تنقید کا عالم یہ ہے کہ پہلے آٹھ، دس صفحات پر دو درجن مغربی مصنفین، ناقدین اور فلسفیوں کے جھلک حوالے دینے کے بعد جدید لقم کے ایک مصرعے یا سطر پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو خاصی انہنی کلاگس معلوم ہوتی ہے۔

بات بے بات مغرب سے موازنہ قوی احساسِ کمتری کی ایک نشانی ہے۔ ہر کولونیل لٹریچر میں یہی ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے حالات ہی ایسے تھے کہ انگریز نے کبھی نہ کہا کہ والٹر اسکاٹ انگلستان کا عبدالحلیم شرر ہے۔ نشاۃ ثانیہ، عقلیت پرستی اور صنعتی انقلاب کے پیدا کیے ہوئے ترقی یافتہ مغربی لٹریچر اور اس کے تتبع ہی نے مشرقی ادبیات میں نئی روح پھونگی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ برطانوی تسلط کے بعد سے آج تک کے تخلیق کیے ہوئے ہمارے ہندوستانی (یا

پاکستانی یا بنگلہ دیش) شعر و ادب کا کافی بڑا حصہ اچھا تقلیدی اور سیکنڈ ریٹ تقلیدی ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ (چنانچہ میں بھی جب 'گریز' کا ذکر آتا ہے ہمیشہ بے ساختہ یہ کہتی ہوں کہ اس کی Economy اور توازن مغربی ہے اور یہی اس کا ایک بڑا وصف ہے۔) اور یہ صورت حال انڈونیزیا کی بھی ہے جس کا ماڈل ڈیج ادب ہے۔ انڈونیشیا (اب ویتنام) اور شمالی افریقہ کا ماڈل فرانس ہے۔ آج سے صرف دس سال قبل مراکش کی مغربی عربی میں پہلا ناول لکھا گیا جس کا انگریزی ترجمہ A life full of holes کے نام سے شائع ہوا۔ اور وہ بہت ہی کمزور ناول تھا۔ ہمارے ہاں بھی جب پائیز کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ ضرور بتایا جاتا ہے کہ منٹو روسی استادوں سے متاثر ہوا تھا۔ جان لہمن نے لندن میں 'چیگورگین نیو رائٹنگ' کا اجرا کیا۔ اس کے چند سال بعد اسی نمونے پر بنگور میں محمد شاہین نے نیا دور شائع کرنا شروع کر دیا۔ ہمارا ڈراما (خواہ بیچ پالی ہو یا ایک پالی...) اے دائے بر حال! ما کہ اردو میں ایک سوہوم صنف ادب ہے، افسانہ، ناول، ہلینک درس، فیری درس، یہ وہ، سب ترقی یافتہ مغرب سے آئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ناول اور افسانے کے اور نئی شاعری کے فارم قبول کرنے کے بعد ہمارے بیشتر بزرگ فن کاروں نے کسی مغربی مصنف کی تقلید نہیں کی۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ متحدہ مغربی افسانے اور ناول معمولی درجے کے ہوتے ہیں اور ایسا ہونا لازمی ہے۔ جن ممالک میں ہر پختے اور ہر مہینے سینکڑوں ناول پریس سے نکلتے ہوں اور جہاں کے رسائل میں آن گت کہانیاں شائع ہوتی ہوں وہ سب کی سب بلند پایہ نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح مغرب میں چھپنے والے مشرقی ادیب (جاپان ادیب اس زمرے میں نہیں آتے) جو ایک خالص نسخہ سامنے رکھ کر لکھتے ہیں کہ فلاں فلاں سالوں کی شمولیت سے مشرق یا ہندوستان کے متعلق Exotic ناول جپتھم میں پڑھا جائے گا، ان کی تخلیقات انگریزی سے ان کی مادری زبانوں میں ترجمہ کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ کتنی معمولی ہیں۔ پولش خاتون روتھمحب والا کے حیرت انگیز حد تک سپاٹ اور بے جان افسانوں نے 'انگش اسٹیلنگ ورلڈ' میں دھوم مچا رکھی ہے۔ اور روتھمحب والا مغرب کی ایک 'ایمگری لٹریٹری فکر' بن گئی ہیں جبکہ ان سے کہیں بہتر کہانیاں

ہمارے اردو رسالوں میں ہر مہینے درجنوں تصحیحی رہتی ہیں۔ یہاں مسئلہ اردو ادیبوں کے محدود وسائل اور ترجمے کا سامنے آتا ہے۔ آج سے برسوں قبل یونیسکو کے زیر اہتمام ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس ٹوکیو میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں ہینکس ولسن کریمز بنگ (انگلستان)، ڈونا لڈکین (امریکہ)، انطونی سلونی سکی (پولینڈ) اور اس خاکسار نے مشرقی ادبیات کے مغربی زبانوں میں تراجم کے متعلق تجویز پیش کی تھی جو منظور ہوئی اور اس کے بعد ایسے تراجم شائع ہوئے۔ امراد جان ادا اور عزیز احمد کا ایسی بلندی ایسی ہستی یونیسکو کی طرف سے چھپ چکا ہے۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یونیسکو کی مطبوعات کی وہ عالمگیر مارکیٹ نہیں جو بڑے بڑے برطانوی یا امریکن پبلشر کی چھاپی ہوئی کتابوں کی ہوتی ہے۔

چھکے چھڑا دینے والے ناول اردو میں آج تک نہیں لکھے گئے۔ افسانوں کے معاملے میں ہم البتہ اپنی پیٹھ خوب خوب ٹھونک سکتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناول اردو کے بہتر ناولوں کے زمرے میں آتے ہیں اور ان کے چند افسانے قابل ذکر ہیں۔ (لیکن وہی ترجمے کی بات کہ مشرق و مغرب کے ذہنوں کے درمیان جو بڑی درست تر سلی ٹیلج حاصل ہے۔ عزیز احمد کا ’تصور شیخ‘ انگلستان یا امریکہ کے قاری کے لیے بے معنی ہوگا۔ اس طرح اچھا مشرقی ادب اپنے آپ میں محصور رہتا ہے اور دوسرے درجے کی مشرقی چیزیں عالم گیر شہرت حاصل کرتی ہیں۔ عزیز احمد اور ہم آپ تو خیر بونے لوگ ہیں رومی، غالب اور اقبال کو اسی تر سلی ٹیلج کی وجہ سے وہ عالم گیر شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو عمر خیام اور جاپانی ہائیکو نظم کو ملی۔)

’زریں تاج‘: جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں (جو ہیر لڈسب سے متاثر معلوم ہوتا ہے اور ’تصور شیخ‘ یہ بھی اردو کے دو نامور استاد شعرا کی فنی زندگیوں کے متعلق تھا) عرصہ گزرا جب پڑھے تھے اور مجھے خیال آیا تھا کہ مصنف کے ہاں تاریخ کی مابعد الطبیعیاتی اور Mystical جہات کی گرفت اور اس کا ایک Awesome sense of mystery ایک حد تک موجود ہے۔

مذکورہ بالا کہانیوں کے علاوہ ’مدن سینا اور صدیاں‘ کی بھی بہت دھوم مچی تھی۔ یہ مضمون شروع کرنے سے قبل میں نے عزیز احمد کو دوبارہ پڑھنا چاہا۔ صرف ’قصص ناتمام‘ اور ’گریز دستیاب‘

ہوئیں۔ اور رقصِ ناتمام کے سارے افسانے ('مدنِ سینا اور صدیاں' اور 'جادو کا پہاڑ' سمیت) مجھے اتنے اچھے نہیں لگے۔ تقسیم سے قبل کے حیدر آباد کا متول طبقہ، ان کے 'جرمن ڈیزائن' کے مکان ('یہ جرمن ڈیزائن' کے مکان عزیز احمد کے ناولوں میں بھی موجود ہیں)، گھریلو خادماؤں کے ساتھ نوابوں کے معاشرے (یہ حیدر آباد کے متعلق لکھے ہوئے ہر افسانے کا آج تک لازمی موضوع ہے)۔ ان سب کہانیوں میں اس ڈائمنشن کی کمی ہے جو افسانے کو افسانہ بناتی ہے۔ اور بستی نہیں یہ... میں جنوب کے دو جرٹل الف خاں اور بے خاں آزادی سے پہلے کی دہائی کی سیر کرتے ہیں جہاں ہر طبقے کی عیاش آوارہ عورتوں کی فراوانی ہے۔ عزیز احمد کا ہر ہیرو عورتوں کے تعاقب میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ انگریزی طرزِ بیان کا گویا اردو ترجمہ (یہ خصوصیت نکھر کر 'گریز' میں ملتی ہے)۔ 'اس کی آنکھیں بالکل غیر جانبدار تھیں۔ دیکھو میں کسی خوفناک لگ رہی ہوں۔' وغیرہ۔ ہندوستانی رجواڑوں کے افراد کی میاشیاں۔ 'اعلا سوسائٹی میں عورتوں کی مہذب خرید و فروخت وغیرہ کے متعلق بے حد لکھا گیا ہے اور اس میں کوئی خاص نئی بات اب نہیں ملتی۔' 'جادو کا پہاڑ' مسوری جانے والے ادبی طبقے کا تذکرہ ہے۔ مگر اس جمہوری دور میں مسوری اب 'جادو کا پہاڑ' نہیں رہا۔ وہاں اب متوسط طبقہ جاتا ہے۔ پرانی ارسٹوکریسی ختم ہو چکی اور نو دلیجے اب سویٹز رلینڈ کا رخ کرتے ہیں۔

در اصل ہر افسانہ نگار وقت کے سراب کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور ایک مخصوص دور یا صورت حال کے واقعات اور کردار اسے اہم اور معنی خیز معلوم ہوتے ہیں۔ ایک مدت گزرنے کے بعد اس لفظی تصویر کشی کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ (اس معاملے میں مصور ادیب سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ انصار حسین، انیسویں صدی کے اکیڑی مصوروں اور اولڈ ماسٹرز کی بنائی ہوئی شکلیں اور مناظر ابدی ہیں جبکہ ان کے ہم عصر تصویر کشے، فیلڈنگ، والٹر اسکاٹ، جارج ایلیٹ وغیرہ ہم کو اب پڑھنا ناممکن ہے۔)

مجھے 'مدنِ سینا اور صدیاں' کا انداز بیان ٹیکسٹ بک ہسٹری کا سا معلوم ہوا۔  
سجاد ظہیر کے بعد عزیز احمد اردو کے دوسرے ادیب ہیں جنہوں نے مغرب کو اپنا موضوع

بنایا۔ آج ادیبوں اور پڑھنے والوں کے لیے مغرب ایک الوکی بات نہیں رہی لیکن بچپن میں ہر قلمی عزیز احمد کے افسانے ایک نئی چیز تھے۔ علاوہ ازیں دوسری جنگ عظیم سے پہلے کا یورپ ایک ایسا موضوع تھا جس پر ملک راج آنند، سجاد ظہیر اور عزیز احمد کے علاوہ کسی نے نہیں لکھا۔ (کو اختر حسین رائے پوری بھی اسی زمانے میں ہیرس میں مقیم تھے)۔ وہ ایک ایسا افسانوی، ولولہ خیز اور کرب ناک دور تھا جس کی عکاسی کر کے کرسٹلر اشروڈ نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ ہیرس میں مقیم امریکن جلاوطن ادیبوں کا ایک پورا گروہ اس وقت ایک بڑا جاندار ادب تخلیق کرنے میں مشغول تھا۔ عزیز احمد کے ہیرو آزاد، عقیل اور فہم جرمن ناسیت اور اطالوی فسطائیت کے خلاف صف آرا اشتراکی تحریک سے متاثر ہیں۔ ’رودۃ الکبریٰ میں ایک شام‘ کا عقیل مسولینی کا جلوس دیکھتا ہے۔ ’وہ اشتراکیوں کا ہم درد اس بھڑے سے قطعی متاثر نہ ہوا۔ اس سے وہ لٹلی سرزد نہ ہوئی جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر سے کمزوری کے لمحے میں سرزد ہوتی تھی۔‘ لیکن یہ افسانہ اور خود گریز کے کئی حصے جا بجا طامس لک کے گائیڈ، سیاسی تبصرے اور پورتاؤ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

یورپ اور انگلستان (یا امریکہ) میں مقیم ہندوستانی طالب علم یا سیاح مغربی لڑکیوں کے تعاقب اور حصول میں سرگرداں... کامیاب یا ناپس... عموماً کامیاب... اردو کے ان سب مرد ادیبوں کا مرغوب ترین موضوع ہے جو مغرب میں رہ چکے ہیں یا صرف چند ماہ چند روز ہی وہاں گزار آئے ہیں۔ مزید برآں مردوں کی لکھی ہوئی ساری چیزیں (یہاں مغرب اور مشرق کی تخصیص نہیں) پڑھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہزار ہا برس سے عورت واقعی ادب میں بھی محض ایک Sex object رہی ہے اور ہندو سیت ساری دنیا کے شاعروں، صورت گردوں اور افسانہ نویسوں کے اعصاب پر بری طرح مسلط ہے۔ (’گریز‘ کے ہر چوتھے جملے سے یہ حقیقت آشکار ہے)۔ دنیا کا نصف سے زیادہ انسانی ادب اور شاعری نسوانی اناتوی کے ہاں تفصیل تکرے پر مشتمل ہے (اور پھر اپنی ذہنی برتری کا دعویٰ کیا جاتا ہے) اس خصوصیت سے قطع نظر، ’گریز‘ اردو کے چند بہترین ناولوں میں سے ہے۔ میں شروع میں عرض کر چکی ہوں عزیز احمد بہت تعلیم یافتہ انسان

ہیں۔ ضروری نہیں کہ آدمی دنیا کا سارا علم گھول کر پی جائے اور تمام معلومات عامہ اسے حاصل ہوں جب ہی اچھا ادیب بن سکتا ہے۔ ورنہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مؤلفین بہترین ادیب اور شاعر ہوتے۔ مگر لکھنے کی فطری صلاحیت کے علاوہ فکری تہذیب اور تربیت یافتہ ذہن کا اثر اس کی تخلیقات پر لازماً پڑتا ہے۔ عزیز احمد اس کی ایک مثال ہیں۔ مصنف سے توقع کی جاسکتی تھی 'گرگز' اور 'ایسی بلندی ایسی پستی' سے بہتر ناول لکھیں گے مگر انھوں نے دوسری لائن داب لی۔ مغربی یونیورسٹیوں کے فحش اکیڈمک ماحول میں اس بس کر سیاسی موضوعات پر لکھنے میں منہمک ہو گئے اور سنا ہے چند بہت قابل ذکر کتابیں پچھلے چند برسوں میں انھوں نے لکھی ہیں۔ 1935 کے یورپ سے لے کر 1977 کے امریکہ اور کینیڈا تک مغرب بھی کہاں سے کہاں نکل چکا ہے۔ پتہ نہیں اگر ایک سنبھلے اور ٹھہرے ہوئے پرسکون پختہ ذہن بصر کی حیثیت سے عزیز احمد اب ایک ناول آج کے مغرب میں سرگرداں شرقی روجوں کے متعلق لکھیں تو کیا لکھیں گے۔ کیونکہ یہی سبیل زمانہ، اس کا سراب اور اس کی گرفت، ادب کا دوسرا نام ہے۔

## اشاریت کی نئی سمیتیں اور زوہبی

(زوہبی آزر)

زوہبی متعدد ذرائع اظہار کے تجربات سے گزرے ہیں۔ ان کی تخلیق خواہ روغنی ہو، یا قلم روشنائی سے ہو، یا زرد کاغذ پر اور رنگین پنسل سے، ہر ایک میں ایک ہی خصوصیت نمایاں ہے۔ یعنی کلیئریں انتہائی نازک اور سبک حمل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک کلیئر تو پتھر ملی چٹانوں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ نرم تو نہیں البتہ ان سے کسی حد تک مجسمہ سازی کی سختی کا احساس ہوتا ہے۔

اگر کوئی زوہبی کی تصاویر کو دیکھے تو اس کا تاثر یہی ہوگا کہ فن کار نے اپنی ایک خصوصی دنیا کو بیرونی حقیقت کی دنیا سے جدا کر کے تخلیق کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ دنیا انتہائی عجیب و غریب ہے جہاں انوکھی اشکال، اور افسردہ و محض غور میں آباد ہیں جو بے چہرہ اور غیر محرک ہیں اور جن کا وجود صرف خوابوں میں ہوا کرتا ہے۔ اس خواب میں ایک فرد خود کو ایسے خلا میں جو تک ہوتا جاتا ہے متعین محسوس کرتا ہے ایسی فضا رومانی منظر پیش تو کرتی ہیں لیکن جذبات سے عاری۔ البتہ اس میں ولیم بلیک کی شاعرانہ اشاریت اور ایک طرح کی رمزیت کا لمس ضرور ملتا ہے۔ یہ کلاوہ پوش خواتین





ان کے اسلوب میں انفرادیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بہ یک زبان پکارتے ہیں کہ یہ تصاویر زوہبی ہی کی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ کسی فن کار کے بارے میں یہ خیال اس کی اہمیت کا عکاس ہے۔ ان کی تصاویر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ بنیادی طور پر مجسمہ ساز ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی پیش تر تصاویر اسلوب اور جدت پسندی کی شاہکار ہیں (ان کی تصویر بہ نوان ماں اور بچہ جدید روایت کی بھرپور شناخت ہے) انھوں نے پاکستان کے معروف دانشوروں کی شبیہ کو بھی پلاسٹر میں ڈھالنے کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ غالباً اس ملک میں زوہبی ان تجربہ کار اور مشاق مجسمہ تراشوں میں سے ایک ہیں جو اس میدان میں فعال نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اکثر فن کاروں نے اس میدان میں کام کرنے سے غفلت برتی ہے۔

---

(رسالہ جامعہ، جولائی-ستمبر 2008، روشنائی، کراچی، جنوری-مارچ 2001)



## ایک غیر معمولی ہستی

(صالحہ عابد حسین)

بیگم سالحہ عابد حسین مرحومہ ایک ایسی غیر معمولی ہستی تھیں کہ ان کے حلق مجھے کچھ لکھنا بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ ان کے خاندان کے ہمارے گھرانے سے خواجہ غلام الحسین کے دور سے تعلقات تھے۔ خواجہ غلام السید بن یلدرم کے مداحین میں سے تھے اور یلدرم بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ سالحہ باجی اس حمد بن کی نام لیا تھیں جو وضع داری کے مفہوم سے واقف تھادہ ایک مشفق، مفسر، پر غلوں اور بادکار خاتون تھیں اور علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اصلاح پسند روشن خیال اہل قلم خواتین کے اسطوری دور سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسطوری میں نے اس لیے لکھا کہ وہ دور اب پی ایچ ڈی کے طلباء اور طالبات کے لیے ریسرچ کا ایک موضوع بن چکا ہے (اور ریسرچ کا مطلب ہے گم شدہ یا ناپاب چیزوں کی کھوج اور چھان بین) لہذا ڈاکٹر عابد حسین یا سالحہ عابد حسین کے مہد کے متعلق تحقیق کی جائے تو اس کے یہ معنی بھی ہوں گے کہ ہم ان اقدار اور ان روایات سے کتنی دور نکل آئے ہیں۔ عبرت۔

ایک وقت تھا جب پرانے شاہی تختوں کی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ایک ہالِ سلام بنے  
گرد و گشت تھا اس کے اساتذہ و دانش وادریٰ و جوان تھے جو بیچہ شدہ قوم پر کی برطانیہ کے  
جہانے حصول تعلیم کی غرض سے جرنی چلاتے تھے اور انہیں اگر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیل و خواہوں  
پر گزرتے تھے۔

اس شاہی ادارے سے قلم نگار، علامہ سیاق و سباق میں ان مذکورہ تینوں اقسام کے  
مفہوم حاصل ہو جائے گا۔ جامعہ ملیہ مدرسہ ہوں میں دس و ستر برس قبل ہوئی۔ ملت کا مفہوم تو  
بہت ہی متاثر ہے جو کچھ ہے اور اسلامیہ بھی رواداری اور سادگی کے بجائے اب پیروڈ الر اور ملک  
نظری سے عبارت ہے۔ ہر گز یہ کہ وہ جو جوان بنائے تو ہم پرست بھی تھے اور ان کا اسلام حلقے  
راشدین اور حضرت ابوذر غفاریؓ کو اپنا آئینہ بنانا تھا۔ چنانچہ ان جو بن پرہ اور کئے والے  
اساتذہ اور ان کی ہواں بڑی خشکوشی سے عزت کیاں ہرگز تھے۔ اکثر عابد حسین اور صالح  
عابد حسین بھی اس لچری گروہ میں شامل تھے ایک ایسے جو کمان میں کاشن اور یہ قلمی  
اور اسلامی آئینہ "قوم" اور "اسلام" کی مختلف و متضاد باتوں اور ان کے تارک کی وجہ سے تقریباً  
راکٹان بن گئے۔

کہانیاں سکھانے کی جگہ تھی جہد کے زمانے کا جوش و خروش اور ولولہ ایسا بیانیے اور سچے  
حصول آزادی کے بعد قائم نہیں رہ سکا تھا۔ سب سے بدلتے ہوئے حالات سے ان دانش  
وادیوں کے دلوں پر گزرتی تھیں اس کے باوجود اپنے آئینہ نگار سے دست بردار نہ ہوئے اس کا  
اندازہ ڈاکٹر عابد حسین سے مل کر ہی ہو سکتا تھا۔

پچھلے سال عابد حسین کو میری والدہ مرحومہ صاحبہ کی تھی جو ان کے گھر کا نام تھا۔ ان کی  
بار جب میں نے ان کو دیکھا وہ قرول و بارغ میں والدہ مرحومہ سے ملنے آئی تھیں اور اپنی کتاب  
"نقش اول" ساتھ لائی تھیں اس وقت کی کو اندازہ نہ تھا کہ قرول و بارغ میں میرے بچپن کا علم  
ہوئے والا ہے اس کے بعد ہی جامعہ ملیہ ہالِ سلام بن گیا۔

ایک مدت بعد صالحہ جی سے میری ملاقات کرشن چہرہ کے بیان بھیجی میں ہوئی صالحہ

باہی ڈاکٹر عابد حسین کے ہم راہ ترقی سے دلچسپی آتی تھی۔ یہی تھی قیام پند یہ حدود دور تھی  
بچہ عابد و شہزادوں کو مت میں بوجھ رکھے دور تھی پند تھی اس وقت تک محکم وہ بچہ تھا۔ محکم  
ایک وقت لکھ رہی تھی۔ چند سال بعد ان دنوں سے دلی کے پیر علی وٹس تھی ایک کانفرنس کے  
دوران ملاقات ہوئی۔ اگلی بار جب میں دلی آئی ڈاکٹر عابد حسین صاحب فرانس تھے عابد ملا تھی  
رات کے وقت دو دن باہر تھی اور مجسم چھوڑے دکھائی دیے۔ ڈاکٹر عابد حسین اعلان کے کران  
محکم میرن صاحب ڈاکٹر صاحب الامام اور عمر جدید تھے۔ یہ بھی یاد کرتے تھے اس کے اولین  
پیارے پیر الشرفیہ و لکھی آفا انشا تھی عمر اور پیر بڑھ کر بہت خوش تھے۔ یہ وہ وہ  
نظر پائی فراتوری اور منہ و جوی کے تھا تھا تھی اس حال لکھا اور ڈاکٹر عابد حسین کی محکم  
تراتی پند تھی اور وہ کے ایک تھی شہزاد۔

میں یہی تھی دیکھی اس کے بعد عابد ڈاکٹر صاحب کی تحریک تھی کے لیے صاحب  
باہی کے پاس آئی۔ وہ مثال اور عمر بڑے کرے میں تھی پیر بڑھ کر تھی اس دنوں نے  
بعد دھند آوازی اور اس کے بعد کے زمانے کے کمرے کمرے شہزاد دیکھے۔

وہ منہ صاحب باہی کی محکم شہزاد تھی۔ ملاقاتوں کی آمد یہ وہ اپنے کمرے سے آکر  
دیں بچہ جاتی تھی خوار سے یا تنگ یا اچھے میں بلوں مثال اور تھی ایک تھی دلی دکھائی آتی  
ہوئی۔ وہ بڑی دوست اور دلچسپ لکھ کر آتی تھی۔ 1978ء میں دلی میں جنوری تا مارچ ان  
کے پڑاؤں ہی میں قیام کیا۔ رات کو کمرے میں محکم تھی۔ صاحب باہی کی لکھی وٹس دماغ اور  
میرا ان خیالات کی مالک تھی اب بہت کم نظر آتی تھی۔ ایک دور محکم محکم کی تشکیل  
کر آتی ہے۔ سر سید اور مولانا علی دلی روح محکم کی لکھی کا فرات تھی۔ اس نے میری والدہ  
اور ان کی محکم ان کو یہ دیکھا تھا عابد حسین شہزادہ اکرام شہزاد تھی والدہ کی ترقی سے  
تعلق رکھتی تھی۔ (جو وہ وہ دور محکم چونکہ ناگفتاب ہے اس کی نامہ نگار کی فرمت گونا  
گونا صاحب شہزاد)

1978ء میں دلی ان ہر دیوں میں اکبر محکم ان تھی والدہ کی محکم دلی عابد ملا آیت تھی۔

ان دونوں خواتین کی بات چیت حیرت انگیز تھی شاہ ولی اللہ، کارل مارکس، گاندھی جی، اکبر الہ آبادی، اقبال، غالب سیاست دہلی معاملات اردو ادب (جس کے مسائل بھی دینی مسائل کی طرح کافی اذوق ہو چکے ہیں۔) اس وقت مجھے خیال آتا کہ ان دونوں نے کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھا کوئی ڈاکٹریٹ حاصل نہیں کیے۔ محض اپنی ذہنی صلاحیت ذوق و شوق اور اپنے اپنے گھرانوں کی روایات کی بنا پر یہ کتنی باخبر اور وسیع الطالعہ خواتین ہیں۔ اس طرح ان سے ذرا سینئر خاتون یعنی میری والدہ جب باتوں میں اچانک بوڑوار کے جزل بول تھا یا عہد شاہجہانی کی خصوصیات کا تذکرہ کر جاتی تھیں تو سننے والے سب محب ہوتے تھے اور یہ تینوں خشک مزاج تقریریں کرنے اور HOLIER- THAN THOU قسم کا رویہ رکھنے والی لیڈر خواتین نہیں تھیں۔ شدید حس مزاج کی مالک تھیں۔ (انہیں باجی مرحومہ اس قسم کے مضامین لکھتی تھیں کہ کیا مولانا آزاد کبھی بچہ تھے؟) ہمیشہ مزاج نگار وہ اردو میں جس مرتبے کی مستحق تھیں وہ آج تک ان کو نہیں دیا گیا۔ طنز و مزاح کے متعلق ”عالمی“ سینئروں میں کوئی ان کا نام تک نہیں لیتا۔ اس حس عرافت کی ایک وجہ یہ بھی تھی یہ جیمات اپنی ذات سے عقیدت نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ دوسروں کے لیے دروندی کا رویہ ان کے ہاں غالب تھا۔ اپنی اہمیت کے شدید احساس کی وجہ سے لامحالہ آپ کے مزاج میں ایک نوع کی سختی اور خشکی آ جائے گی۔

یہ دونوں بے حد صبر اور تحمل والی خواتین تھیں ان دونوں کو میں نے کبھی برہم اور برا فروخت نہیں دیکھا کسی بحث کے دوران بھی انہوں نے ایسے الفاظ استعمال نہیں کیے جن سے دلآزاری کا پہلو لگتا ہو۔ علامتوں کی یہی پہچان بھی ہے۔

ان دونوں کی روایت کی ایک اور خاتون بیگم آصف مجیب بھی جامعہ کے کیمپس پر عرصے سے سکونت پذیر تھیں۔

ان ہی دنوں ایک اردو اخبار میں علامہ اقبال کی ذات پات کے متعلق ایک بحث چھڑ گئی۔ ہمارے ہاں لوگوں کے پاس اس قسم کے مباحث کے لیے بہت فرصت ہے مولانا محمد علی جوہر راپوری تھے یا امر دہوی یا گینوی۔ علامہ اقبال کی اصل کاسٹ کیا تھی؟ وغیرہ۔ صالحہ باجی اور

انہیں باجی نے مجھ سے کہا دیکھو بی بی اس کے جواب میں ایک مضمون ہم لوگوں کی طرف سے جانا چاہیے چنانچہ وہ مضمون چھپا۔

شام کی ان محفلوں کے دوران جوں ہی الامان کی آواز آتی انہیں باجی نماز پڑھنے کے لیے اپنے گھر روانہ ہو جاتیں۔ صالحہ باجی اپنے کمرے کا رخ کرتیں۔  
ایران کے متعلق میرا پورا تاثر بعنوان کوہ دماوند اردو بلٹز میں ہفتہ وار چھپنا شروع ہوا۔  
حکیم میرن صاحب نے سات اشعار قلم بند کیے۔

پڑھتا ہوں بہت شوق سے میں ’کوہ دماوند‘  
انہوں کہ قسطوں میں ابھی ہے وہ نظر بند  
طے جلد کتابت کی طباعت کی ہو منزل  
چھپ کر یہ کتاب آئے تو پڑھ کر ہوں میں خورسند  
ہوں منتظر وقت کہ جلد آئے وہ ساعت  
اللہ رکھے خیر میں لاؤں گا قلائد  
خود بعد میں یعنی کو کھلاؤں گا میں پہلے

بھابی کو ذرا سی ، وہ ہیں پرہیز کی پابند  
کیا عجیب بات ہے کہ عابد و لا کا وہ خوشگوار مہر ہی معدوم ہو گیا۔ حکیم میرن صاحب بھی  
چلے گئے اور چار سال بعد ان کی بھابھی بھی۔

صالحہ باجی کی صحت عرصے سے اچھی نہیں تھی لیکن وہ اپنے اوقات کی اسی طرح پابند رہتی  
تھیں۔ شیخ وقتہ نماز صبح کو اپنی اسٹڈی میں علمی و ادبی کام شام کو چھل تھی ٹھیک آٹھ بجے شام  
طعام شب ان کی مجالس محرم بھی روایتی ڈھنگ کی نہیں تھیں۔ اور ان میں ہر فرقے اور مذہب کی  
خواتین جوق در جوق شریک ہوتیں۔ محافل میلاد النبی اور مجالس محرم میں میرت رسول کریم اور  
سیرت حسین پر بصیرت افروز تقاریر وہ خود کرتی تھیں۔ ایک بار میں نے ان سے کہا ”ہماری اماں تو  
ایک قسم کی وہابی شیعہ تھیں۔“ صالحہ باجی نے صبح کی ”بھاری شیعہ کہو۔“

1984ء میں میں ڈاکٹر بلال دہلی آگئی ان سے اکثر ملنا ہوتا رہا ہم لوگ کبھی سیر مل جل رہا تھا پھر کھانا ملتا گیا میں نے ان سے کہا عالمہ باقی آپ سے ایک فحوی ملتا ہے ہم لوگ کی انکی کمزری نہیں مانتیں تاروں کو پڑ رہی ہے بطور ایک باہمی دستاویز دیکھ لیں؟ بہت خیر۔

مذہبی رواداری اور ان کے بچہ کی ان پر غم تھی۔ قصص اور طبع ان کے ہاں نہیں تھا کہ وہ ہماری ہر انتہا کی نیپ نیپ فقرہ سے اس وجہ سے متاثر نہ ہو سکتی تھیں کہ ان لوگوں کا فلسفہ حیات ہی بعد نگاہ تھا۔

عالمہ باقی کی آخری ملاقات سے چند روز قبل ہی میں نے ان سے کہا آپ کی امنی کے حوالے سے کچھ بھول گئے ہیں اس عجیب عجیب عالمی دلی ایک الجھن ہمارے نگاہ کی گئی ہے جسے عالمہ باقی سے کچھ لگتی تھی کہ عجیب عجیب عالمی دلی ایک الجھن بھی اکثر ہوا کرتی ہے۔

کچھ عرصے بعد ان کی طبیعت نامناسب ہوئی۔ وہ ہالوں کے بڑے میں کھوپ میں بیٹھی ڈاکٹر دیکھ رہی تھیں مگر ان کی کیا رہیوں میں نہایت خوش رنگ لگایا کھلے ہوئے تھے میں نے کہا بھئی آپ کا یہاں گھر لوں گا مگر عالمہ باقی بہت پسند ہے۔ کچھ لگتی ہیں یہاں گھر ہر صاحب ذوق کو پسند آتا ہے۔

چند دن بعد ہی وہ صاحبہ فراتس ہوئیں میں عیادت کے لیے گئی ان سے کہا آپ کا یہ معمولی سا کام قلمی لکائی منشی تھے پھر نہیں ہے۔ حسب ملاقات کوئی نگاہ جواب دینے کے بجائے خاموش رہیں۔ کچھ احساسات ہوا کہ وہ دنیا سے دل الٹا چکی ہیں۔

ان کے جنازے میں شرکت کے لیے جو جم غفیر ملے وہاں میں جمع ہوا اس میں ڈی آؤڈی بھی شامل تھے اور عالمہ لوگ بھی۔ اور ان میں سے بہت سے دلی صدمے کے آثار بظاہر ہے تھے۔ ایک ملازمہ مسکین خفیہ منشی خرم بخت کی پچاسک کے پاس کھڑا اور دکھار رہا تھا۔

عالمہ باقی عادی عمر نہایت خاموشی کے ساتھ کتے لوگوں کے کام آتیں اس کا کوئی اندازہ نہیں کہ کتنا کتنا لوگوں پر ان کی ملاقات کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کی طبیعت میں کبھی نہیں کی جاتی تھی۔



## ایک ملک، دو تیا

(ملک دا ج آئند)

28 جبر کو کسی نے قتل کر کے مجھے ایک ملک (دا ج آئند) میں چھپنے کر مجھے  
دیکھ ہوا حلالا نکلا انہوں نے اچھی ہیرا پائی وہ مال ہے بہت سیٹا آدمی ہے بہت سیٹا  
بالکل ٹوٹا ٹوٹا آدمی ہے بہت سیٹا بہت سیٹا آدمی ہے ان کے اندر کوئی آواز نہیں آتی  
زمانے کے لوگوں میں جو شرافت ہوا کرتی تھی وہ ان میں تھی۔ شرافت کی یہ نسل اب دھیرے  
دھیرے ختم ہوتی جا رہی ہے ایک ایک کر کے ہلاک ہو رہے ہیں۔ گزروں میں ملک ہے ملک  
دل، سیدھے اور شریف لوگ۔

ملک سے میرے بڑے راجہ تعلق ہے حلالا نکلا وہ مجھے سزا ہے یا وہ ان  
کے جیب میں لافٹ ہوتی تو ان کی لافٹ سے مجھے ملے تھے ان لافٹ سے وہ بہت ہنسید  
اور انسان دوست تھے ان کے اندر پرالٹے زمانے کے وہ ہلاک ہو چکے ہیں وہ آج دھیرے  
دھیرے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

1905 عیسوی میں وہ پیدا ہوئے تھے اور محض 34 سال کی عمر میں پیٹنگون سے ان کی کتاب چھپ گئی تھی۔ ہمارے یہاں آج کل یہ ہے کہ کسی نئے قلم کار کی ایک دو کتابیں چھپ گئیں، تھوڑی سی شہرت مل گئی تو اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے لیکن منک میں ایسا کچھ بھی نہیں دیکھا گیا۔ وہ جب بھی کسی سے ملنے تو دل کھول کر ملتے تھے۔ ان کے اندر کوئی ہٹاؤٹی پن نہیں تھا، کوئی گھمنڈ نہیں تھا۔ وہ بالکل سیدھے سادے، کھرے اور سچے انسان تھے۔ ہمارے، آپ کے دادا، پردادا، بڑے بزرگ جس پیار، محبت کے ساتھ اپنے چھوٹوں سے ملتے تھے، ملک بھی اپنے سے چھوٹے لوگوں سے بالکل مہربان اور محبت سے ملتے تھے۔

ان کے بارے میں جو سب سے اہم بات کہی جاتی ہے وہ یہ کہ یورپ میں رویندر ناتھ ٹیگور کے بعد اگر کسی ہندوستانی قلم کار کی سب سے زیادہ شہرت تھی تو وہ منک راج آنند کی تھی۔ حالانکہ وہ انگلینڈ میں رہتے تھے لیکن ان کو ہندوستان آنے رہتے تھے۔ میں جب بی بی سی میں کام کرتی تھی تو لندن میں ان سے ملتی تھی اور یہاں آنے کے بعد ممبئی میں بھی ان سے ملتی تھی۔

بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ وہ بہت اچھی طرح اردو جانتے تھے، بلکہ یہ سن کر تعجب ہوگا کہ انھوں نے اردو میں ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی سب سے پہلی جو کہانی میں نے پڑھی تھی، وہ تھی 'ہجاسوں کی یونین'۔ وہ اردو میں ہی لکھی تھی۔ ٹی ایس ایلٹ سے ان کی اچھی دوستی تھی۔ علامہ اقبال، افتخار عارف، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، یہ سب ان کے دوست تھے۔ اس دور کے جتنے بڑے قلم کار تھے، ان سب سے ان کی دوستی تھی۔ انگلینڈ میں منک نے اپنی تحریروں کی بدولت جو جھنڈے گاڑے، اسے ہر کوئی جانتا ہے لیکن شاید ہی کسی کو پتہ ہو کہ علامہ اقبال نے ہی انھیں انگلینڈ بھجوایا تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے ہی مجھے ولایت بھجوایا، وہ ہمیشہ مجھے یہ بتاتے تھے۔

منک راج آنند کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ انسان دوست تھے۔ ان کے اندر ذات یا مذہب کو لے کر کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ اس لحاظ سے وہ ہندوستانی ثقافت کے سچے قدردان تھے۔ وہ پچھلے ہی ولایت میں رہتے تھے لیکن ہندوستانی حالات سے بخوبی واقف تھے۔ جی کہوں تو وہ ایک ساتھ دو دنیاؤں میں رہتے تھے۔ ہندوستان اور انگلینڈ میں، ہندوستانی سماج، یہاں

کی تہذیب، یہاں کے لوگوں کی اقدار زندگی کے بارے میں جو سمجھ تھی اسے ان کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بہت ہی اسی وقتہ رائٹنگ تھی ان کی۔

ان سب کے باوجود نلک راج آئندہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے بانی تھے۔ ان دنوں وہ لندن میں پڑھتے تھے۔ سچا ڈھیر اور کوئی ایک گھوش صاحب تھے۔ یہ لوگ ان دنوں جوان تھے اور ہندوستان کو انگریزوں سے آزادی دلانے اور سماج کی ترقی کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہیں (لندن میں) کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے پروگریسو رائٹس ایسوسی ایشن کی تشکیل کا منصوبہ بنایا۔ اس گروپ میں ڈاکٹر رشید جہاں، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مصمت چٹائی جیسے بڑے بڑے ترقی پسند قلم کار جڑے۔ جوش ملیح آبادی، محمد مجی الدین بھی تھے ان کے ساتھ۔ "لوسرغ سویرا آتا ہے آزادی کا / آزادی کا / گلزار ترانہ گاتا ہے آزادی کا / آزادی کا..." محمد مجی الدین کی یہ نظم بہت مشہور ہوئی تھی ان دنوں۔ یہ سبھی برٹش مخالف تھے اور مجاہدین آزادی کے تئیں ہمدردی رکھتے تھے۔ آزادی کے دس سال بعد تک یہ ہم چلی۔

نلک سے میری آخری ملاقات 1988 عیسوی میں لندن کے اردو مرکز میں۔ بڑے اوپر منعقد پروگرام ایک شام قرۃ العین حیدر کے نام میں ہوئی تھی۔ اس پروگرام کی صدارت خود نلک صاحب نے کی تھی۔ لیکن اپنے آخری دنوں میں ہندوستان کے حالات کو لے کر وہ کافی پریشان رہتے تھے۔ یہاں کی سیاست میں بڑھتی فرقہ پرستی اور سماج میں بڑھتے کزن پیرازم ان کی تشویش کے اسباب تھے۔ وہ کہتے تھے "آج کی زندگی بہت کمرشل ہو گئی ہے، اپنے آپ میں سٹ گئی ہے، لوگ خود غرض ہو گئے ہیں اور آپادھالی بڑھ گئی ہے۔ آج کل کے لوگوں کی قدریں بدل گئی ہیں۔"

آج کل جو حالات ہیں، صرف ہندوستان میں ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں، اس کو لے کر وہ (نلک راج آئندہ) بہت پریشان رہتے تھے۔

آئینہ جہاں برسیہ کی ممتاز اور منفرد گلشن نگار  
 رہا۔ ان کی موت 1943ء سے شروع کیا۔ جو ان  
 کے 75 برس نے ملے جو ان کے پانچ افسانوی  
 مجموعے پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ درجنوں  
 ناولوں سے تراجم ہے۔ پوری زندگی صحافت میں گزری  
 تھی۔ ان کی فلمیں بنیں۔ مصوری اور موسیقی کا بھی  
 ہندوستان میں نمائش بھی ہوئی۔ انگریزی میں لکھا  
 گیا۔ ان کی انگریزی میں ترجمہ کیا۔ خود درجنوں  
 کتابیں لکھیں۔ یہ حیات ایک عہد ساز ادیب  
 ہے۔ ان کے ہندوستان کی علمی خدمات کا اعتراف  
 ان کے رفاہیہ کاموں سے کیا گیا۔ یہ جلد ان کے خاکوں  
 کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کے جملے اور اردو کے  
 تحقیق ان کا نام ہی ہے۔ قرۃ العین حیدر  
 ان کے علمی حیات آٹھ جلدوں میں شائع  
 ہوئے۔ ان کے افسانوی مجموعے بھی ان کا تحقیقی کارنامہ  
 تھا۔ یہ ساری نوایک تحریک کی شکل دی۔ زندگی  
 کے نئے زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ان  
 کے مختلف موضوعات پر ان کی چالیس سے  
 زود ہیں جن میں چار کتابیں آکسفورڈ پریس  
 مل چکی ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان  
 وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند  
 فروغ اردو مجون، ایف سی، 33/9،  
 انسٹی ٹیوٹل ایریا، جولا، نئی دہلی۔ 110025



آئینہ جہاں برصغیر کی ممتاز اور منفرد نگاہیں دکا قرۃ العین حیدر کی کلیات ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنا افسانوی سفر 1943 سے شروع کیا۔ جوانی کے انتقال تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے تقریباً 75 افسانے لکھے جو ان کے پانچ افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں۔ پانچ ناولٹ، نونا ناول اور گیارہ رپورٹاژ تحریر کیے۔ ان کے علاوہ درجنوں مضامین، خاکے، بچوں کی کہانیاں اور دوسری زبانوں سے تراجم کیے۔ پوری زندگی صحافت میں گزار دی (پرت میڈیا اور انگریز ٹیک میڈیا) درجنوں دستاویزی فلمیں بنائیں۔ مصوری اور موسیقی کا بھی بے حد شوق تھا۔ درجنوں پبلک بنائی لندن اور ہندوستان میں نمائش بھی ہوئی۔ انگریزی میں سیکڑوں صحافتی مضامین لکھے انگریز اور فلم ریویو کیے، اردو ادیبوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا۔ خود درجنوں انگریز ویبے۔ محقق کا فریضہ بھی انجام دیا اور کئی کتابیں مدون کیں۔ یہ کلیات ایک عہد ساز ادیب کے کارناموں کو جمع کرنے کی ایک محققانہ کوشش ہے۔ حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے "پدم شری" اور "پدم بھوشن" جیسے اعزازات سے نوازا کیا تھا۔ یہ جلد ان کے خاکوں پر مشتمل ہے۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر جمیل اختر اردو کے معروف ادیب، محقق، مصنف اور نقاد ہیں۔ نگاہیں کی تحقیق ان کا خصوصی میدان ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کلیات اسی تحقیقی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس سے قبل بلونت سنگھ کی کلیات آٹھ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں عصمت چغتائی، بلونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کا نیا افسانوی مجموعہ بھی ان کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اشاریہ آج کل کی تدوین کے ذریعے اردو میں اشاریہ سازی کو ایک تحریک کی شکل دی۔ زندگی نامہ قرۃ العین حیدر اور گلوبل پینڈ نارنگ ان کے علمی کمالات کے نئے زاویے کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کی داستان بہت طویل ہے۔ اب تک مختلف موضوعات پر ان کی چالیس سے زائد کتابیں قومی اور بین الاقوامی اداروں سے شائع ہو چکی ہیں جن میں چار کتابیں آکسفورڈ پریس سے بھی شائع ہوئی ہیں اور انھیں کئی ادبی ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔



₹ 145/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بیمن، ایف سی 33/9،

انسٹی ٹیوٹل ایریا، جھولا، نئی دہلی 110025